ہماری ویب ڈیجیٹل بک

میمونہ صدف

MAEMUNA SADAF

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

E-BOOK SERVICES

Collection of Published Articles
By "Maemuna Sadaf"
at Hamariweb.com

کامیابی کا راز

یہ بحث ازل سے جاری ہے اور ہر زمانے کے لوگ یہ راز معلوم کرنے کے لیے کوشاں رہے ہیں کہ کامیابی کیا ہے ؟ کامیابی کن لوگوں کے قدم چومتی ہے ؟ ایک جیسی جسمانی اور ذہنی صلاحیت ہونے کے باوجود کچھ لوگ شہرت کی بلندیوں کو چھو لیتے ہیں جبکہ کچھ لوگ گمنامی کی زندگی گزارتے رہتے ہیں۔

کامیابی دراصل ایک فلسفے کا نام ہے۔ عموماً کامیابی سے مراد لوگ ایک منزل کو پا لینا ہی سمجھتے ہیں لیکن درحقیقت ایسا نہیں۔ کامیابی دراصل ایک مسلسل سفر اور ان تھک محنت کا دوسرا نام ہے۔ ہمت نہ ہارنا اور ایک کے بعد دوسری منزل کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرنا ہی اصل کامیابی ہے۔ایک منزل کو حاصل کرکے اس کامیابی پر اکتفا کر لینا ہی کافی نہیں بلکہ یہ طرزِ عمل اور سوچ زوال کو دعوت دیتی ہے۔ اور اس کے بعد ناکامیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو وقت ہر شخص کے لیے ایک ہی رفتار سے چلتا ہے۔ایک گھنٹہ ساٹھ منٹ جبکہ ایک دن چوبیں گھنٹوں پر ہی مشتمل ہوتا ہے۔نہ تو وقت کی رفتار میں ردوبدل ہوتا ہے نہ ہی کمی بیشی۔ لیکن اس کے باوجود کامیابی کی دیوی چند لوگوں پر مہربان جبکہ کچھ پر نامہربان رہتی ہے۔ کامیابی کی دیوی

صرف ان پر مہربان ہوتی ہے جو انا اپنے وقت کو فضولیات میں ضائع نہیں کرتے بلکہ اپنے وقت کے ایک ایک لمحے کی قدر کرتے ہوئے اسے احسن اور پر عمل طریقے سے گزارتے ہیں۔ وہ نہ تو منصوبہ بنانے میں وقت صرف کرتے ہیں اور نہ ہی راہ کا تعین کرنے میں بلکہ وہ زیادہ وقت کام کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ کیونکہ صرف منصوبہ بنا لینا، خواب دیکھ لینا کافی نہیں بلکہ اس منصوبے کو پورا کرنے لیے محنت کرنا ضروری ہے۔

قرآن پاک میں اللہ ہمیں کامیابی کا راز کچھ یوں بتاتا ہے۔

بے شک انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔

کامیابی کے زینے طے کرنے کے لیے صرف محنت کرنا ضروری نہیں بلکہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے اپنی منزل کا تعین کرنا اور درست سمت میں محنت کرنا ضروری ہے۔

یہ بات نہایت اہم ہے کہ آپ کو علم ہو کہ آپ کی منزل ہے کیا؟ اور آیا آپ یہ منزل حاصل کرنے کے اہل ہیں بھی یا نہیں ؟؟؟ اس منزل کو حاصل کرنے کے لیے کون سا راستہ بہترین ہے ؟؟؟ منزل کا تعین اور اس کے بعد اس منزل کو حاصل کرنے کے لیے صحیح سمت کا تعین کرنا ضروری ہے۔ اگر سمت کا تعین درست نہ ہو تو انسان

چاہے جتنی کوشش کرتا رہے وہ کامیاب نہیں ہو سکتا بلکہ بے نیل و نامراد ہی رہتا ہے ۔اگر اپنی منزل کا تعین اس طرح سے کیا جائے جس کو حاصل کرنے کی آپ صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو آپ کبھی بھی وہ منزل حاصل نہ کر پائیں گے بلکہ الٹا کسی اور منزل کا تعیں کرنے میں بھی ناکام رہیں گے ۔ اور ناامید ہو کر رہ جائیں گے ۔ اپنی صلاحیتوں کو پرکھنے اور ایک دفعہ فیصلہ کر لینے کے بعد اگر اس منزل کی راہ میں آنے والی تمام رکاوٹوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا جائے ، اور کوئی مشکل پڑنے پر ناامید نہ ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ منزل حاصل نہ ہو پائے ۔کامیاب شخص وہ ہے جو ایک غلط فیصلے کو بھی درست کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو ۔ جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنا اور پھر اس خواب کی تعبیر کے لیے ان تھک کوشش کرنا ہی کامیاب لوگوں کا شیوہ ہے ۔

کامیابی حاصل کرنے کے لیے بہت زیادہ ذہانت کی بھی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ کامیابی کادارومدار 1% ذہانت جبکہ 99% محنت پر ہے ۔ دنیا کے کامیاب ترین لوگوں کی حالاتِ زندگیکا مطالعہ کیا جائے تو ان سب میں ایک ہی بات مشترک نظر آتی ہے اور وہ ۔اگر دیکھا جائے تو ان لوگوں نے ایک self motivation ہے بے انتہا کوشش ، اور منزل کا تعین کیا اور پھر اس سمت کا جو انھیں منزل تک لے جائے ۔اس کے بعد یہ تمام لوگ حوادثِ زمانہ سے نہیں گھبرائے اور انھوں نے برے سے.برے حالات میں بھی اپنی کوشش کو ترک نہیں کیا۔کامیاب لوگوں کی چند

زندہ مثالوں میں قائدِاعظم کی مثال روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ انھوں نے پاکستان حاصل کر لینے کے بعد بھی محنت کا دامن نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ صرف قائدِاعظم ہی نہیں تحریک پاکستان میں شامل تمام لوگوں نے ہندوؤں اور انگریزوں کے کسی ہتھکنڈے کے سامنے ہتھیار نہیں پھینکے۔ بالکل اسی طرح اگر کارل مارکس اپنی غربت سے تنگ آ کر اپنا کام کرنا چھوڑ دیتا تو آج دنیا میں مارکسزم (کمیونزم) کا نام و نشان تک نہ ہوتا۔ کارل مارکس بھی اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک اپنے مقصد کی خاطر کام کرتا رہا۔

اس کے برعکس ناکامی کا تعلق منزل حاصل کرنے سے قاصر رہنا نہیں ہے بلکہ اپنی ہار کو مستقل مان لینا اور دوبارہ سے کوشش کرنے سے انکار کر دینا ہی اصل ناکامی ہے۔ ایسے لوگ جنھوں نے منزل کا تعین کرنے میں یا متعین منزل کی راہ میں پڑنے والی مشکلار سے ڈر کر ہمت ہار دی ان کا آج نام و نشان تک نہیں ملتا۔ جو یہ چاہے کہ کوئی ابنِ مریم آئے گا اور اس کی مشکلات کو حل کرے گا۔ پریشانیوں سے نجات دلائے گا، ایسے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہو پاتے۔ وہ نہ تو اپنی زندگی احسن طریقے سے گزار پاتے ہیں اور نہ ہی اپنی نسلوں کے لیے کچھ کر پاتے ہیں۔ تساہل پسندی ہی ناکامی کا پہلا سبب ہے۔

اجتماعی سطح پر تاریخِ اقوامِ عالم گواہ ہے کہ قوموں کے زوال کا سبب بھی ایک منزل حاصل کر لینے پر ہی اکتفا کر لیناہی ہے۔ اس ایک کامیابی کا جشن مناتے رہنا اور اگلی منزل کو بھول جانا ہی زوال کی پہلی سیڑی ہے۔ کیونکہ اقوامِ عالم دن بدن ترقی کے زینے طے کر رہی ہیں، نئی سے نئی ایجادات پرانی ایجادات کا متبادل بنتی جا رہی ہیں۔ ایسے میں اگر کوئی قوم ایک ہی کامیابی کو باعثِ فخر سمجھ کر اسی پر اکتفا کر لے تو وہ دوسری اقوام سے پیچھے رہ جائے گی۔

آج کل ہمارا انفرادی اور اجتماعی طرزِ عمل تساہل پسندی اور بے عملی کا غماز ہے۔ ہم میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ کوئی ابنِ مریم آئے اور ملک و عوام کو مالی اور معاشرتی مسائل سے نکالے۔ہم میں سے کوئی شخص یہ نہیں چاہتا کہ وہ محنت یا کوشش کرے۔ہم گفتار کے غازی تو ہیں لیکن عمل سے بے بہرہ۔ کوئی بھی حکومت یا کوئی بھی حکمران اس وقت تک ملک کی حالت نہیں بدل سکتا جب تک کہ ہم میں سے ہر شخص اپنی زندگی میں محنت اور عمل کو اپنا شیوہ نہ بنالے۔ تمام مسائل کا حل خود ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ جب تک پہلی اکائی سے لے کر آخری اکائی تک ہر شخص، اپنی اپنی جگہ پر کوشش نہیں کرے گا ہمارے نہ تو ملکی حالات میں تبدیلی آئے گی اور نہ ہی معیشت میں بہتری آئے گی۔

عالم با عمل

میرا مضمون "جادو ٹونے اور سحر کی روک تھام۔ مگر کیسے ؟27" اگست کی اوصاف میں شائع ہوچکا ہے۔ اس حوالے سے مجھ سے جو سوالات پوچھے گئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ راہنمائی اور مسائل کے حل کے لیے جس سے رابطہ کیا جائے ہمیں کس طرح سے معلوم ہو گا کہ یہ عامل ہے یا عالم ؟ یہ شیطان کا پیروکار ہے یا ایک با عمل مسلمان ہے ؟؟؟ یہ ایک زخیم موضوع ہے جو کہ تحقیق طلب ہے اور میں اس سوال کے جواب کی تلاش میں سر گرداں رہی ۔اس سوال کے جواب کے لیے میں نے بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا، مختلف لوگوں سے رابطہ کیا ان سے بھی جو بظاہر عام سے انسان نظر آتے ہیں اور ان سے بھی جو با قاعدہ عالم کے طور پر جانے جاتے ہیں ۔اس سوال کا تحریری جواب جس کو میری عقل نے بھی تسلیم کیا وہ "شاہد نظیر "کی کتاب "جنات کے غلام "میں ملا ۔

میں نے اپنے پہلے مضمون میں بھی لکھا تھا کہ روحانی مسائل کے حل کے لیے انسان روشنی کی تلاش میں رہتا ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ جہاں سے بھی سہارا ملے لے لیا جائے لیکن کسی کی مدد لینے سے پہلے ضروری ہے کہ یہ جان لیا جائے کہ آیا یہ شخص اسلام کا پیروکار ہے بھی یا نہیں ؟کسی بھی عالم یا

عامل کے بارے میں یہ جاننے کے لیے کہ وہ غلط نہیں کر رہا اس کی کچھ عادات کو جان لیجیے

۔اگر وہ عالم ہے اپنی ذاتی صفائی ستھرائی ، اپنے آستانے کی صفائی ، نماز ، روزہ ، اور 1 شریعتِ محمدی کا پابند ہو گا۔ اگر کوئی شخص میلے کچیلے کپڑے پہنے ، نماز روزے سے عاری ہے۔ اپنی ظاہری صفائی کا خیال نہیں رکھتا۔ اگر اس کا حلیہ ملنگوں جیسا ہے ، بال بدبو دار ہوں اور اس کے آستانے پر جاتے ہی آپ کے دل میں خوف پیدا ہو، یا وہ آپ سے پیسہ ، کالا بکرے یا اس قسم کی چیزوں کا مطالبہ کرے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ سفلی عمل کا مالک ہے اور جادو ٹونہ کا سہارا لے کر لوگوں کا روپیہ لوٹتا ہے۔ وہ ہوس اور طمع کا مارا ہوا شخص ہے۔ایسے مجذوب جو نماز تک ادا نہ کرتے ہوں اور کسی درخت کے نیچے یا ویرانوں میں ہو وہ کسی طور پر اعتبار کے قابل نہیں اور نہ ہی وہ نوری علم کے مالک ہیں کیونکہ کسی بھی شخص کا عالم یا عامل کہلانا اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ شریعتِ محمدی کا پابند نہ ہو اور اس کے آستانے پر جاتے ہوئے آپ کو کراہت کا احساس نہ ہو بلکہ خود بخود آپ کے دل میں ادب و احترام جاگزیں ہو جائے۔ یہ اگر کوئیمزار بھی ہو گا تو وہاں آپ کے دل میں رعب و دبدبہ اور احترام پیدا ہو گا کیونکہ اولیاء کرام کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے کہ وہ زندہ ہیں اور اس کے ہاں سے رزق پا رہے ہیں۔ مزاروں سے بھی بہت سے لوگ فیض پاتے ہیں اور اپنی منتیں مرادیں حاصل کرتے ہیں۔ میرے خیال

(میں یہ سب اعتقاد کا ثمر ہے۔

۔ایک ایسا عامل جو کہ شریعتِ محمدی کا پابند ہو گا وہ ہوس، غرور و تکبر سے بالاتر ہو گا۔ اس کی نظر میں کوئی میل نہیں ہوگا۔ وہ آپ سے کسی قسم کا نذرانہ یا پیسہ نہیں مانگے گا ۔ وہ قرآنی آیات بتائے گا یا قرآنی آیات کا تعویز دے گا۔ واضع رہے کہ قرآن میں ہر قسم کے مسائل کا حل موجود ہے۔

۔ اگر آپ کے مسائل حد سے زیادہ بڑھ جائیں اور آپ کسی سہارے کی تلاش میں 3 ہوں تو بھی اندھی عقیدت کا شکار نہ ہوں کیونکہ انسان اگر اندھی عقیدت کا شکار ہو جائے تو اس کو اچھے اور برے کی تمیز نہیں رہتی ۔اور اس اندھی عقیدت کا شکار لوگ اپنا روپیہ ،پیسا اور عورتیں اپنی عزت تک گنوا بیٹھتی ہیں۔ ہمارے ہی ملک کے ایک شہر میں اندھی تقلید کی مثال پیر ننگا کی صورت میں موجود ہے جو کہ بنا کسی لباس کے اپنے آستانے میں موجود رہتا ہے اور عقیدت مند خواتین و حضرات کی ایک لمبی قطار ہمیشہ اس کے آستانے پر موجود رہتی ہے۔ اس کا ثبوت آپ کو انٹرنیٹ پر موجود ایک وڈیو سے حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اگر وہ پیر عالم باعمل ہوتا تو سب سے پہلے اپنے ستر کا خیال رکھتا، وہ شریعت کی پیروی کرتا اور ہر اس چیز سے منع کرتا جس کی اسلام میں ممانعت ہے۔ لیکن ایک ایسا شخص جو کہ خواتین تک کے سامنے برہنہ

رہتا ہو وہ کسی طور عالم کہلانے کے قابل نہیں۔ایسے شخص کے آستانے پر خواتین کی طویل قطاریں صرف اور صرف اندھی عقیدت مندی ہی کی وجہ ہیں ۔ بالکل اسی طرح کے چھوٹے۔بڑے آستانے پورے ملک کے ہر شہر ہر گاؤں میں آپ کو جگہ جگہ نظر آئیں گے ۔جہاں بیٹھے ہوئے عامل صاحب ہر کام کے پیسے طلب کرتے ہیں ، جتنے زیادہ پیسے دیں گے اتنا ہی (خدانخواستہ) تیر بحدف عمل کیا جائے گا۔اگرچہ یہ آستانے عام ہوئے ابھی بہت وقت نہیں بتیالیکن اعتقاد اور ایمان کی کمزوری کے مارے لوگ ان آستانوں میں بیٹھے عاملوں کے پاس بھی کھینچے چلے آتے ہیں ۔

اس کے برعکس وہ لوگ بھی ہیں جو اپنی زندگی شریعت کے مطابق گزارتے ہیں اور لوگو ں کی راہنمائی بنا کسی لالچ کے کرتے ہیں ۔جن کے حضور حاضری دے کر انسان کا ایمان تازہ ہوتا ہے اور ایک دنیا ان سے فیض پاتی ہے ۔ان کی زندہ مثالوں میں پیر نصیر الدین نصیر (گولڑہ شریف)، شجاع الدین صاحب ، اسرار احمد ،جاوید احمد غامدی ، مولانا طارق جمیل صاحب شامل ہیں ۔جنھوں نے ثابت کیا کہ زندگی گزارنے کے لیے دین کو مشعلِ راہ بنایا جائے تو دنیا اور آخرت کو سنوارا جا سکتا ہے ۔

مشکلات میں ثابت قدم رہنے کے لیے سب سے اہم یہ ہے کہ ہر حال میں اپنے ایمان

کو مضبوط رکھیں۔ نماز کی پابندی کریں، شریعتِ محمدی کی پیروی، درود شریف کا ورد آپ کو کسی بھی مشکل سے بحفاظت نکال سکتا ہے۔ قرآن کی دعائیہ اور شفائیہ آیات کے ورد سے بھی بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ اور دوسری اہم بات اندھی عقیدت سے ہر حال میں بچیں۔ یہ اعتقاد رکھیں کہ کائنات میں موجود ہر چیز اس ربِ ذوالجلال کے ایک کن کی محتاج ہے۔ اس کے حکم کے بنا کچھ نہیں ہو سکتا اور اس کی رضا حاصل کرنا انسان کی اولین ترجیح ہونا چاہیے کیونکہ اگر اس کی رضا حاصل ہو جائے تو انسان مشکل سے مشکل وقت صبر اور شکر سے گزار سکتا ہے۔ کوشش کرنا چاہیے کہ ناشکری سے بچا جائے اور ہر حال میں اللہ کی عبادت کو اپنا شعار بنایا جائے۔ اللہ کی عبادت دلوں کو سکون بخشتی ہے۔ بس اللہ کی عبادت یکسوئی سے کی جائے خاص الخاص اس کی رضا پیشِ نظر ہو اور اسی سے دعا مانگی جائے۔ اگر دعا پر مکمل اعتقاد ہو تو انسان کو کسی قسم کے تعاویز دھاگوں کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں کہ ہر ایسی دعا جو دل سے مانگی جائے پر اثر ہوتی ہے اور اگر وہ اس وقت شرفِ قبولیت نہ بھی حاصل کر پائے تو بھی ضائع نہیں جاتی۔

میرے خیال کے مطابق ہر مسئلے کا حل قرآن اور حدیث میں موجود ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اپنی بصیرت کو وسیع کیا جائے اور اپنے اندر کھوج کے جذبے کو اس حد تک مضبوط کیا جائے کہ ہم قرآن اور احادیث کے مطابق اپنے مسائل کا حل خود تلاش کر سکیں۔ اس ضمن میں قرآن کی دعائیہ اور شفائیہ آیات کے بارے

میں آگاہی حاصل کر کے بیش بہا فوائد حاصل کیئے جا سکتے ہیں۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں مرتب کردہ قابلِ اعتماد مصنفین کی مختلف کے مجموعہ وضائف (مارکیٹ میں دستیاب) سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

انقلاب اور آزادی مارچ کے ہماری معیشت پر اثرات

انقلاب یا آزادی مارچ آگے کیا ہونے جا رہا ہے ؟؟ اس پر تبصرہ کرنا ایک نہایت ہی مشکل امر ہے۔اس مارچ کا آغاز یوم آزادی یعنی ۱۴ اگست سے ہوا، مختلف شہروں سے ہوتے ہوئے پی ٹی آئی اور پی اے ٹی کے کارکنان اسلام آباد پہنچے۔ ملکی تاریخ میں پہلی بار دارالحکومت اسلام آباد کو احتجاج کے لیئے چنا گیااور مارچ کے بعد دھرنے بھی اسلام آباد کے ریڈ زون ایریا میں دیا گیا ہے۔ان دھرنوں کو کم و بیش قریبا دو ہفتے سے زیادہ وقت گزرچکا ہے۔ہر روز ایک نئی ڈیڈ لائن دے دی جاتی ہے۔ کبھی چوبیں گھنٹے ، کبھی آڑتالیس گھنٹے۔حکومتی ارکان اور مخالف پارٹیوں کے درمیان مذاکرات اگر ہوتے بھی ہیں تو کوئی خاطر خواہ پیش رفت نظر نہیں آتی۔ایک طرف دونوں پارٹیوں (مولاناطاہر القاری اور عمران خان) کے لیڈران جھکنے کو تیار نہیں جبکہ حکومتی ارکان بھی اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں۔ان دونوں پارٹیوں کے مطالبات نہ تو حکومت ماننے کو تیار ہے اور نہ ہی یہ پارٹیاں ان مطالبات میں کوئی لچک لانے کو تیار ہیں۔یہ دھرنا یقینا بہت اچھی نیت سے دیا گیا ہو گااور یقینا اس کے کچھ اچھے اثرات بھی مرتب ہوں گے۔لیکن اس دھرنے نے ملک کے معاشی اور معاشرتی حالات پر کیا اثرات مرتب کیئے اور کر رہے ہیں۔آیئے

ایک نظر ان پر بھی ڈالیں۔

ا۔ دونوں مارچ (انقلاب مارچ اور آزادی مارچ) کے آغاز سے ہی اسلام آباد اور دوسرے شہروں کو ملانے والی سڑکوں پر جا بجا کنٹینر لگا کر انھیں بند کر دیا گیا۔ جس کی وجہ سے عوام متبادل رستے کا انتخاب کرنے پر مجبور ہو گئے اور جو سفر ایک گھنٹے پر مشتمل تھا ان دنوں وہ سفر تین سے چار گھنٹوں تک جا پہنچا ہے۔ اکثر و بیشتر تقریبا تمام راستے بند کر دیئے جاتے جس کی وجہ سے لوگوں کو بے حد مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، دفاتر کے اوقات غیر مقررہ ہو جانے کی وجہ سے کام میں واضح فرق دیکھنے میں آیا ہے اور حاضری میں بھی کمی آئی ہے۔ جو لوگ دور دراز کے علاقوں سے نوکری کی وجہ سے اسلام آباد آتے ہیں انھیں سب سے زیادہ مشکل اٹھانا پڑتی ہے۔ اگر کسی کو ایمرجنسی کہیں جانا پڑے تو یہ ایک ناممکنات میں سے ہے۔ خاص طور پر مریض یا بزرگ شہریوں کو مشکلات کا زیادہ سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پڑول پمپوں اور سی این جی سٹیشنز کے بند ہو جانے کی وجہ سے گاڑیوں کی آمدورفت مشکل ہو گئی ہے جبکہ ٹکسیوں اور پبلک ٹراسپورٹ کے کرایوں میں بھی اضافے نے مہنگائی سے ستائے غریب عوام کو مزید مشکل میں ڈال دیا ہے۔ ٹیکسی ڈرایوٗر لوگوں سےمنہ مانگا کرایہ وصول کر رہے ہیں جبکہ ٹراسپورٹ نہ ہونے کی وجہ سے عوام ان کو زیادہ کرایہ دینے پر مجبور ہیں۔

۲۔اس صورت حال سے صرف عوام نہیں کنٹینرز مالقان بھی نقصان اٹھا رہے ہیں ۔ایک کنٹینرز کا ایک دن کا کرایہ قریبا ۱۵۰۰۰ ہے اور یہ کرایہ کسی کو ادا نہیں کیا جا رہا۔ کرایہ کے علاوہ یہ کنٹینرز سامان کی ترسیل کے کام سے ہٹا کر سڑکوں پر کھڑے کر دیئے گئے ہیں اس سے سامان چاہے وہ کسی بھی طرح کا ہو اس کی ترسیل بری طرح متاثر ہوئی ہے ۔

۳۔آمد ورفت کی مشکلات کے سبب اسلام آباد کے گرد ونواح میں کھانے پینے کی اشیاء کی ترسیل میں کمی ہوئی ہے اور یہ اشیاء مہنگے داموں فروخت ہو رہی ہیں ۔مارکیٹ میں آٹے سمیت ہر چیز غائب ہوتی جا رہی ہے ۔اس صورت حال کا فائدہ ذخیرہ اندوز اٹھاتے ہیں اور اشیائے خوردونوش کی مصنوعی قلت پیدا کر دی جاتی ہے۔اس صورت حال کا شکار نہ صرف عوام میں بلکہ دھرنوں میں موجود کارکنان کو بھی اسی طرح کے حالات کا سامنا ہے ۔ اشیائے خوردونوش کے ساتھ ساتھ چھتریاں اور ڈسپوزبل کلاس وغیرہ کی قیمتوں بھی آسمان کو چھونے لگی ہیں ۔۔

۴۔حالیہ دھرنوں نے بین الاقوامی سطح پر پاکستان کی پوزیشن کو مزید خراب کیا ہے ۔ عالمی اداروں کے چونکہ دفاتر زیادہ تر اسلام آباد میں اس لیے ان اداروں کا کام بھی بری طرح متاثر ہوا ہے ۔اس کے ساتھ ساتھ دونوں دھڑوں آزادی مارچ اور انقلاب مارچ کا آپس میں ضم نہ ہونا اقوام عالم کو یہ دکھا

رہا ہے کہ ہمارے مطالبات تو ایک ہیں لیکن ہم متحد نہیں ۔دونوں دھرنوں میں موجود شراکاء بھی ایک مشرقی اقدار کے پابند جبکہ دوسرے مغربی اقدار کے دلدادہ۔ عالمی سطح پر اس وقت پاکستان ایک سیاسی محاذ آرائی کا شکار ملک نظر آتا ہے اور یہ جمہوریت کی ناکامی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ان دھرنوں کی وجہ سے سٹاک ایکس چینج میں واضح مندی نظر آئی اور روز بروز اس مندی میں اضافہ دیکھنے کو مل رہا ہے۔معیشت کا پہیہ جام ہوتا نظر آ رہا ہے۔

۵۔ان دھرنوں کی وجہ سے راولپنڈی اسلام آباد میں شروع ہونے والے ترقیاتی کام بھی رک گئے ہیں ۔اور ان کاموں سے وابسطہ افراد بے روزگار ہوتے نظر آتے ہیں۔

۶۔اگر ان حالات کا معاشی جائزہ لیا جائے تو اعداد وشمار مزید پریشان کن نظر آتے ہیں ۔ملکی معیشت کو ان چند دونوں میں ۱۹ارب ڈالر کا نقصان ہو چکا ہو۔اور اس میں دن بدن اضافہ ہو گا۔ جس قدر یہ دھرنے طول پکڑیں گے معاشی نقصان کی سطح بھی بلند ہوتی جائے گی۔بیرونی سرمایہ کاری پہلے ہی دہشت گردی کی بدولت نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے ان حالات کے مد نظر ملکی سرمائیہ کار

بھی بدظن ہو کر اپنا سرمائیہ دوسرے ممالک میں منتقل کرنے لگے ہیں۔ جتنا نقصان سرمایہ کاروں کو ان دنوں ہوا ہے اتنا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ پنڈی اسلام آباد میں دوکان دار اور دھاڑی دار مزدوروں کو روزی نہ ملنے کی وجہ سے یہ لوگ ملازمت پیشہ افراد سے کہیں زیادہ مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں۔ کیونکہ دھاڑی دار مزدوروں کی روزری روٹی انھی مارکیٹوں سے منسلک ہے۔مارکیٹیں بند ہونے کی وجہ سے یہ لوگ دو وقت کی روٹی حاصل کرنے سے قاصر ہیں۔

۷۔سول نافرمانی (جیساکہ عمران خان نے کہا) کی تحریک اگر چلائی جاتی ہے تو ملکی معیشت مزید تباہی کی طرف جائے گی اور مہنگائی مزید بڑھے گی۔ (یہ فیصلہ بعد میں واپس لے لیا گیا)۔

یہاں یہ واضع کر دینا چاہوں گی کہ میں کسی پارٹی کو سپورٹ نہیں کرتی۔ نہ تو میں حکومت کی حمایت کرتی ہوں نہ ہی کسی اور سیاسی پارٹی کی۔ میرا مطمع نظر صرف یہ ہے کہ جب سیاسی محاظ آرائی میں ملکی معیشت کو نقصان پہنچتا ہے اور اس طرح پہلے سے کمزور معیشت مزید کمزوری کی جانب پڑھتی ہے۔ملک میں احتجاج ہونا چاہیے، بہتری آنی چاہیے لیکن اس اندار سے کہ معیشت کا پہیہ جام نہ ہو۔ ملکی کو کسی قسم کا معاشی نقصان نہ اٹھانا پڑے۔

قربانی کے فضائل و فوائد

قربانی ایک عظیم الشان عبادت ہے۔ یہ عبادت حضرت آدم کے زمانہ سے شروع ہوئی اور تاابد جاری رہے گی۔قربانی کو حضرت ابراہیم سے منسوب اس لیے کیا جاتا ہے کہ انھوں نے محض اللہ کی رضامندی کے لیے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل کو قربانی کے لیے پیش کیا۔اس واقع کا ذکر قرآن کی "سورت صفات "کی آیت99 سے 110 تک ہے۔اس قربانی کو" ذبح عظیم" کا نام بھی دیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ قربانی کو" سنتِ ابراہیمی "کہا جاتا ہے۔ مسلمان ہر سال قربانی حضرت ابراہیمؑ کی اس عظیم قربانی کی یاد میں مناتے ہیں جو انھوں نے اللہ کا حکم بجا لاتے ہوئے ادا کی۔ہر سال 10ذی الحج کو یہ فریضہ سرانجام دیا جاتا ہے اور صاحبِ حیثیت لوگ "سنتِ ابراہیمی "کی پیروی کرتے ہوئے جانور جن میں گائے، بیل، بکرااور اونٹ سبھی شامل ہیں کی قربانی کرتے ہیں۔قربانی کرنا ہر صاحبِ ثروت مسلمان پر لازم ہے۔قرآنِ پاک میں ارشاد ہوتا ہے

"ہم نے ہر امت کے لیے قربانی مقرر کی تاکہ وہ چوپائیوں کے مخصوص جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اللہ نے عطاء فرمائے۔" (سورت حج:آیت 34)

قربانی کی اہمیت اس بات سے بھی واضح ہے کہ نبی پاک ﷺ نے اس پر مداومت فرمائی

۔ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں "ترجمہ : رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں دس سال " قیام فرمایا (اس قیام کے دوران) آپ قربانی کرتے رہے۔

قربانی کے فضائل

قربانی کے بیش بہا فضائل ہیں جن میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں

۔حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ ایک بار صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے 1 سوال کیا : یا رسول اللہ ! یہ قربانی کیا ہے ؟ (یعنی قربانی کی کیا حیثیت ہے ؟) آپ ﷺ نے فرمایا : تمھارے باپ حضرت ابراہیم کی سنت اور طریقہ ہے ۔ صحابہؓ نے عرض کیا : ہمیں قربانی سے کیا فائدہ ہوگا؟ فرمایا : ہر بال کے بدلے میں ایک نیکی ملے گی ۔ صحابہؓ نے عرض کیا : یا رسول اللہ ! اون کے بدلے کیا ملے گا ؟ آپ ﷺ نے فرمایا : اون کے ہر بال کے بدلے بھی نیکی ملے گی۔ (سنن ابنِ ماجہ ص 226 باب (۔ثواب الاضحیہ

۔ایک اور حدیثِ مبارکہ میں ارشاد ہوتا ہے 2

عید الاضحیٰ کے دن کوئی نیک عمل اللہ کے نزدیک قربانی کا خون بہانے سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ نہیں ۔ قیامت کے دن قربانی کا جانور اپنے بالوں ، سینگوں اور کھرون سمیت آئے گا اور قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالی کے نزدیک قبولیت حاصل کر لیتا ہے ۔ لہٰذا خوش دلی سے قربانی کیا کرو۔ (جامع ترمذی ج 1 ص 275 (باب ما جاء فی فضل الاضحیہ

۔حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی کام 3
میں مال خرچ کیا جائے تو وہ عید الاضحیٰ کے دن قربانی کیے جانے والے (جانور پر خرچ
لیے جانے والے) مال سے بہتر نہیں

سنن الدار قطنی ص 774 باب الذبائح، سنن الکبریٰ للبیہقی ج 9 ص (261)

قربانی کے معاشی اور معاشرتی فوائد

۔قربانی تقویٰ حاصل کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔اگر خلوصِ نیت سے قربانی کی 1
جائے تو انسان کا دل ودماغ تقویٰ کی جانب مائل ہوتا ہے۔

۔قربانی نہ صرف ایک مذہبی فریضہ ہے بلکہ یہ ایک معاشرتی فریضہ بھی ہے۔ یہ 2
انسان کو بخل سے نجات دلاتا ہے۔جب کوئی بھی صاحبِ ثروت شخص قربانی کرتا ہے تو
اس کے دل میں دوسروں کے احساس کا جذبہ پروان چڑھتا ہے اور اس طرح معاشرتی ہم
آہنگی کو فروغ ملتا ہے۔اورجب یہ گوشت غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کیا جاتا ہے تو
ان کا احساسِ محرومی کم ہوتا ہے۔ جبکہ گوشت دینے والے کے دل میں مدد کا جذبہ
جاگزین ہوتا ہے۔اس طرح معاشرے کے مختلف طبقوں کے بیچ مدد اور باہمی ہم دردی
کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

۔قربانی کا گوشت (جس کے تین حصے کیے جاتے ہیں،ان حصوں میں ایک غریبوں 3
اور مسکینوں کے لیے وقف کیا جاتا ہے۔) اگر اس کی تقسیم احسن طریقے سے کی جائے تو
ایسے لوگ جو گوشت خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے ان کو بھی گوشت کھانے کو مل
جاتا ہے۔اور جو لوگ عام حالات میں اپنی سفید پوشی کا بھرم

رکھتے ہوئے کسی سے کچھ نہیں مانگتے انھیں بھی گوشت میسر ہو جاتا ہے۔
سورت حج کی آیت 28 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "پس تم اس (قربانی) میں سے خود بھی کھاؤ اور خستہ حال محتاج کو بھی کھلاؤ"

4۔قربانی کی کھالوں کی فروخت سے ایسے فلاحی ادارے جو عوام کی فلاح و بہبود یا دین کی تعلیم عام کرنے کے لیے کھولے گئے ہیں ان کے اخراجات کے لیے رقم حاصل کی جاتی ہے۔ اس طرح یہ ادارے اپنے اخراجات بھی پورے کر لینے کے قابل ہو جاتے ہیں

۔جانوروں کی کھالوں کی قیمت 7 کروڑ تک پہنچ چکی ہے جس کی وجہ سے لیدر انڈسٹری منافع بخش رہتی ہے۔اور اس انڈسٹری کو لیدر وافر مقدار میں میسر رہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ چمڑے کی صنعت پاکستان کے جی ڈی پی کا 4.4 فی صد ہے اور چمڑے کی مصنوعات میں پاکستان کا کوئی ثانی نہیں۔

5۔ایسے لوگ جن کی روزی روٹی کا دارومدار جانوروں کی افزائش پر ہوتا ہے۔یہ موقع ان کے لیے سال بھر کی روزی کا انتظام بھی کر دیتا ہے۔ یہ لوگ پورا سال بھیڑ بکریوں، اور چوپایوں کی افزائش کرتے ہیں وہ ان جانوروں کی فروخت سے اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے روزی کا انتظام کر پاتے ہیں۔ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں قریبا 5 کروڑ تک کہ جانوروں کی قربانی کی جاتی ہے، اور ان جانوروں کی افزائش کرنے والوں کی آمدنی 100 ارب کے قریب ہو جاتی ہے جو کہ جی ڈی پی میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔یہ اعداد و شمار حسنین رضا کوئٹہ کی ریسرچ سٹڈی (15,2010 نومبر) سے حاصل کیے گئے ہیں۔

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ قربانی کرنا نہ صرف مذہبی فریضہ ہے بلکہ یہ ایک معاشرتی اور معاشی فریضہ بھی ہے۔ یہ نہ صرف ذاتی عبادت ہے بلکہ یہ عبادت اجتمائی حیثیت میں بھی معاشرے کے مختلف طبقات میں احساسِ ہم آہنگی کو فروغ دیتی ہے۔ غریب اور امیر طبقے کے بیچ بڑھتی ہوئی خلیج کو پر کرنے کے لیے پل کا کام بھی کر سکتی ہے۔ اس عبادت سے معیشت پر نہایت اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور معیشت بہتری کی جانب گامزن ہوتی ہے۔

جادو کا علاج قرآن و حدیث کی روشنی میں

جادو کے موضوع پر میرے پہلے دو کالم روزنامہ اوصاف میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ ایک طویل اور بحث طلب معاملہ ہے اور پہلے کالم سے ہی سوالات در سوالات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ جن میں سے بعض کے جوابات میں اپنے کالم "عالم با عمل" میں دے چکی ہوں۔ لیکن بہت سے سوالات کے جوابات ابھی تشنہ تھے جن میں سے ایک نہایت اہم سوال یہ ہے کہ اگر کسی پر جادو ہو جائے تو اس کا علاج کس طرح سے ممکن ہے اور اس کے علاج کے لیے کیا کیا طریقے استعمال کیے جا سکتے ہیں؟ جادو سے نجات کس طرح سے ممکن ہے؟ اور اس سے بچا کیسے جائے؟ قرآن کی کون کون سی آیات ہیں جو جادو کے علاج کے لیے پڑھی جا سکتی ہیں؟ سنت کے مطابق اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ اس سلسلے میں تحقیق کے بعد میں چند ایک طریقے تلاش کرنے میں کامیاب ہو پائی جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

1 ۔سب سے پہلے یہ معلوم کریں کہ جادو کس چیز پر کیا گیا ہے؟ مثلاً بالوں پر، کپڑوں پر، کنگی پر یا کسی اور چیز پر اور وہ چیز کہاں چھپائی گئی ہے؟ اس چیز کو جلا دیں یا ضائع کر دیں۔ اس طرح یہ عمل خود بخود ختم ہو جائے گا۔ لیکن بعض اوقات اگر جادو گوشت یا بکرے کے سر یا پائے پر کیا گیا ہو اور ایسی

کوئی چیز آپ کو اپنے گھر سے ملے تو فی الفور کسی عالم سے مشورہ کر لینا زیادہ بہتر ہے۔ اس مشورے کے بعد ہی اس چیز کو تلف کریں۔

2۔ اگر یہ معلوم ہو جائے اور شواہد مل جائیں کہ یہ جادو کس نے کیا ہے تو اسے مجبور کیا جائے کہ اس کو ختم کرے (اگر یہ ممکن ہو) لیکن صرف شک کی بنیاد پر کسی کو اس طرح سے مجبور کرنا جائز نہیں ہے۔

3۔ پاک صاف ہو کر، باوضو ہو کے، بیری کے ایسے سات پتے لیں جن میں سوراخ نہ ہوں ان پر سورت بقرہ کی آیت نمبر 102 تین بار پڑھ کر پھونکیں اور یہ پتے پانی میں ڈال دیں۔ سات دن تک سحر زدہ شخص یہ پانی پیتا رہے۔ پانی کم ہونے کی صورت میں پانی میں اضافہ کرتے رہیں۔ یہ پانی گھر یا دکان میں بھی چھڑکا جا سکتا ہے۔ یہ طریقہ کار علماء نے درست قرار دیا ہے۔ (اگرچہ اس طریقہ کار کی حدیث سے کوئی روایت نہیں ملتی تاہم یہ طریقہ کار قرآن سے علاج کا ایک بہترین اور نسبتاً آسان طریقہ ہے)۔

4۔ ایک روایت ہے کہ حضرت کعب بن احبارؓ جب مسلمان ہو گئے تو یہودی ان کے دشمن ہو گئے اور ان کی جان کے در پے ہو گئے۔ لیکن آپؓ نے یہ دعا پڑھنا شروع کی جس کی وجہ سے وہ دشمنوں کے شر سے محفوظ رہے۔ دعا کا ترجمہ کچھ یوں

ہے

ترجمہ : میں اللہ تعالیٰ کے ان کلمات سے جن سے کوئی اچھائی یا برائی تجاوز نہیں کر سکتی اوراللہ کے عظیم اور جلیل القدر نام سے کہ اس کے قریب رہنے والا کبھی بھی ذلیل نہیں ہو سکتا اور وہ خدا جو آسمان کو زمیں پر گرنے نہیں دیتا سے پناہ مانگتا ہوں اور ہر اس چیز کے شر سے جو زمین سے نکلے اور آسمان سے نازل ہو اور ہر پیدا ہونے والی چیز کے شر سے اور زمین پر چلنے والے ہر جاندار کے شر سے کہ آپ اس کو پیشانی سے پکڑے ہوئے ہیں ۔ بے شک میرا رب ہی صراطِ مستقیم پر ہے ۔ (یہ دعا طبِ نبوی کی متعدد کتابوں میں موجود ہے) ۔ یہ دعا جادو سے بچنے کے لیے اور دشمنوں کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے مجرب ہے ۔

۔ ابنِ ابی حاتم نے لیث سے روایت کی ہے کہ جس شخص پر جادو ہو تو یہ آیات پانی پر5 پھونک کے اس بیمار پر ڈال دیں تو انشاء اللہ شفا ہو گی ۔ وہ آیات مندرجہ ذیل ہیں سورت یونس آیت نمبر 79-82 سورت اعراف آیت نمبر106-122 اور سورت طٰہٰ آیت نمبر65-69

۔ بعض علماء نے " رقیہ " کا طریقہ بھی وضع فرمایا ہے ۔ جو کہ مندرجہ ذیل ہے6

مریض پر قرآن کی آیات (نیچے دی گئی) دم کی جائیں یا پانی پر دم کرکے مریض کو پلایا جائے۔

۔سورت فاتحہ۔(2۔آیت الکرسی۔(3۔سورت اعراف کی آیت نمبر۔106-1)

۔(4 سورت یونس کی آیت نمبر۔79-82۔(5سورت طٰہ کی آیت نمبر 65-122 69۔

۔سورت کافرون۔(7۔سورت اخلاص۔(8۔معوذتین (سورت فلق اور سورت 6) الناس) اور ان آیات کے ساتھ مندرجہ ذیل دعا جو کہ شریعت میں وضع کی گئ ہے

الھما رب الناس، احب الباس وشفیع، انتا شفیع، لا شفاء اللہ شفاؤک انا لا یغدرؤسکاما

ترجمہ: اے ہمارے رب، اے تمام مخلوقات کے رب،.برائی کو دور فرما اور صحت عطاء کر، کہ تو صحت عطاء کرنے والا ہے۔ تیرے سوا کوئی نہیں جو صحت عطاء کرسکے، جس میں بیماری نہ ہو

یہ تمام آیات اور دعا مریض کے سر اور سینے پر دم کریں۔اگر وہ مرض جادو کی وجہ سے (ہے تو وہ جاتا رہے گا۔(مجموعہ ٔ فتاوا و مواکلات۔الشیخ ابن باز کی تصنیف حصہ صفحہ

۔حضرت عمر فاروقؓ کا طریقہ کار مندرجہ ذیل تھا۔آپؓ فرماتے ہیں۔" جس نے جادو7 کیا ہو اسے مجبور کیا جائے کہ وہ اس کو ختم کرئے اور اسے کہا جائے کہ

اگر اس نے جادو کو نہ ختم کیا تو اس کا سر تن سے جدا کیا جائے گا۔ اگر وہ جادو ختم کر دے تب بھی اس کی گردن اڑائی جائے "۔ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا" جادو کی سزا یہ ہے کہ ایسے شخص کی گردن اڑائی جائے" ۔

لیکن یہ طریقہ کار شک کی بنیاد پر اختیار نہیں کیا جا سکتا نہ ہی کوئی عام شخص اس طریقہ کار کو اختیار کرنے کا حق رکھتا ہے۔ یہ طریقہ کار صرف اور صرف قاضیِ وقت گواہان اور ثبوت کی موجودگی میں اختیار کر سکتا ہے۔ یہ سزا کو اس وجہ سے اختیار کیا گیا کہ کسی مسلمان پر جائز نہیں کہ وہ اس شخص کی پیروی کرے جس نے نبی پاک ﷺ پر جادو کیا تھا۔ ایسے شخص کا پیروکار بننے سے وہ شخص نبی پاک ﷺ سے دشمنی کا مرتکب ہو جاتا ہے۔اسلامی معاشرے میں جادو کرنے والے پر حد نافذ ہونی چاہیے ۔

جادو کے خلاف حکومتی سطح پر کام ہونا بھی بے حد ضروری ہے کیونکہ آج تک نہ تو کسی ادارے نے جادو کرنے والے افراد کو تلف کرنے کی سنجیدہ کوشش کی نہ ہی اس قبیح فعل کی مذمت کی گئی ۔ نہ ہی ہمارے ملک کے آئین میں اس قسم کے کام کرنے والے افراد کے لیے کوئی سزا متعین ہے۔ بلکہ آئین اور قانون میں اس عمل کا ذکر تک نہیں ملتا ۔ یہی وجہ ہے کہہ آپ کو آج کل ہر گلی محلے ، شہر گاؤں میں جادو کرنے والے افراد کے آستانے نظر آتے ہیں ۔اور یہ لوگ کمزور

ایمان والوں یا حالات کے ستائے ہوئے لوگوں کی جان و مال سے کھیلتے ہیں اور بے حد ہولناك واقعات اکثر اخباروں اور میڈیا کی خبروں کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی اس قسم کا شخص پکڑا بھی جائے تو اس کو سزا ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ اس عمل کی قانون میں کہیں کوئی شق ہے ہی نہیں۔اربابِ اختیار کو چاہیے کہ اپنے علاقے میں موجود اس قسم کے آستانوں کا دورا کرتے رہیں۔، خاص طور پر پولیس کو ایسے آستانوں کڑی نگرانی کرنی چاہیے تاکہ کسی بھی غیر شرعی فعل کی صورت میں بروقت کاروائی عمل میں لائی جاسکے۔ ،میڈیا کو جہاں کہیں خلافِ شریعت کام ہو اس کی نشاندہی کرنی چاہیے اور مجرموں کو قرار واقع سزا ملنی چاہیے تاکہ کسی اور کو اسلامی معاشرے میں اس قسم کے کام کرنے کی جرات نہ ہو۔

پاک فوج اور عوام ایک

جہاں وطنِ عزیز کی سلامتی کی بات ہو وہاں پاک فوج کا ذکر لازم ہے۔پاک فوج ، ارضِ وطن کا ایک عظیم ادارہ ہے۔ اور جہاں دوسرے ادارے اپنے فرائض منصبی ادا کرنے میں ناکام نظر آتے ہیں وہاں پاک فوج نہ صرف اپنے شعبے میں بلکہ جب جب وطن کو ضرورت پڑھتی ہے چاہے وہ فلاہی کام ہو یا کوئی اور کام پاک فوج ہر دم مستعد نظر آتی ہے۔ ملکی سرحدوں کی بیرونی دشمنوں سے حفاظت کرنا ہو یا ملک میں موجود دشمنوں سے آہنی ہاتھوں سے نمٹنا ہو، عوام کو دہشت گردی سے نجات دلانا ہو۔پاک فوج اپنے فرائض سے پہلو تہی نہیں کرتی۔ ملکی سرحدوں کی حفاظت کے لیے بھارت کی جانب سے جب بھی سرحدی حدود کی خلاف ورزی کی گئی اس کڑے وقت میں پاک فوج سسیہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہوتی ہے اور ملکی سرحدوں کی حفاظت کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتی ۔ ہمارے یہ بیٹے اس وقت جاگ کر ملک کی حفاظت کر رہے ہوتے ہیں جب ہم آرام اور سکون کی نیند سو رہے ہوتے ہیں ۔ بھارت کی دراندازیوں کا جواب جہاں صدر مملکت یا وزیر اعظم کا جواب آنا چاہیے وہاں یہ سیاست دان خاموش رہتے ہیں ۔ جبکہ سیاسی بیان کے جواب میں بھی آرمی چیف کا بیان منظرِ عام پر آتا ہے۔پاک فوج اور عوام ہر مشکل میں ساتھ اور متحد ہیں ۔ جب فوج کو ضرورت پڑتی ہے تب عوام فوج کے ساتھ ہیں ۔

قوم کو کوئی ضرورت پیش آئے، وہ زلزلہ کی تباہ کاریاں ہوں، یا سیلاب میں پھنسے ہوئے لوگوں کو محفوظ مقامات پر پہنچانا ہو۔ حالیہ سیلاب میں پاک فوج کے جوان، آرمی ایویشن کی مدد کے ساتھ لوگوں کو محفوظ مقامات تک پہنچاتے رہے۔ دن اور رات کی پرواکیے بغیر یہ جوان ہر لمحہ لوگوں کی جان بچانے کے لیے مصروفِ عمل رہے۔ جہاں ریسکیو ادارے کہیں دکھائی نہیں دیتے وہاں پاک فوج ہر لحظہ قوم کی خدمت پر معمور نظر آتی ہے۔ جیلوں کی حفاظتی ذمہ داری پر بھی فوج ہی کو طلب کیا جاتا ہے گویا ایک سیکورٹی ادارے تحفظ کے لیے بھی فوج ہی پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔

جب شفاف الیکشن کا معاملہ درپیش ہوتا ہے تو الیکشن کمیشن بھی اپنے ورکرز کی نسبت پاک فوج پر زیادہ اعتماد کرتی ہے۔ الیکشن کے دوان سیکیورٹی کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے پاک فوج کی خدمات حاصل کی جاتی ہے۔ پولیو کے قطرے پلوانے کے لیے بھی ایسے دشوار گزار علاقے جہاں کوئی اور ادارہ کام نہیں کرپاتا وہاں پاک فوج اس ذمہ داری کو بھی نبھانے کے لیے پیش پیش نظر آتی ہے۔ صوبوں میں بالعموم اور کراچی میں بالخصوص امن وامان قائم کرنا ہو، جہاں دوسرے ادارے ناکام نظر آتے ہیں وہاں یہ واحد ادارہ ہے جس پر اعتبار کیا جاتا ہے۔ ملک کے چپے چپے میں جہاں دہشت گردی اور امن وامان کی صورتحال

خراب ہوتی ہے وہاں فوج کو طلب کیا جاتا ہے اور اسی ادارے کی بہترین کارکردگی اور جوانوں کی بیش بہا قربانی کی بدولت ملک میں امن وامان کی صورت الحال بہتری کی جانب مائل ہے۔

سرحدوں اور عوام کی حفاظت کے ساتھ ساتھ پاک فوج عوام کے ساتھ ساتھ دوسرے سیکیورٹی اداروں کی حفاظت بھی کرتی ہے۔۔پولیس جو کہ خود ایک سیکیورٹی ادارہ ہے جس کی تربیت اور کام کا انداز ایسا ہونا چاہیے کہ عوام اس پر اعتماد کر پائیں۔وہ بھی اپنی عمارات اور جیلوں کی حفاظت خود نہیں کرپاتی۔معاملہ جیلوں کی حفاظت کا ہو یا پولیس ہیڈ کوارٹر کا،پولیس جس کی ذمہ داری عوام کے جان و مال کی حفاظت ہے اس کی حفاظت بھی فوج کرتی ہے۔

بات یہاں تک محدود نہیں وزیر اعظم یا صدر کی حفاظت کا معاملہ ہو یا سیاسی جماعتوں میں مفاہمت کا فریضہ بھی پاک فوج سرانجام دیتی نظر آتی ہے۔اس حالیہ بحران کو ہی لے لیجئے۔اپوزیشن اور حکومت کے درمیان مفاہمت ، سینٹ اور قومی اسمبلی کی عمارات کی حفاظت پر فوج کو معمور کیا گیا۔فوج ہی کی وجہ سے یہ عمارات توڑ پھوڑ سے محفوظ رہی۔جب حکومت نے نہتے لوگوں پر طاقت کے استعمال کا آغاز کیا تو فوج نے ہی حکومت کو طاقت کے استعمال سے روک دیا۔جس کی وجہ سے کئی لوگوں کی جان بچ گئی۔وہ تمام سیاستدان جو فوج کے خلاف

بات کرتے اور فوج کو سرحدوں تک محدود رکھنے کی بات کرتے ہیں انھیں اس مشکل وقت میں از خود اس بحران کو حل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے تھی اور اپوزیشن سے بات چیت کرکے معاملات کو حل کرنا چاہیے تھا تاکہ فوج کی ضرورت ہی نہ پڑتی ۔اور اگر حکومت نے اپنے فرائض میں کوتاہی نہ برتی ہوتی تو عوام اس حد تک مجبور ہی نہ ہوتے کہ سڑکوں پر احتجاج کرتے یا اس قدر طویل دھرنے کی ضرورت تھی ۔

عوام کا ان اداروں خصوصا سیاستدانوں پر سے اٹھتے ہوئے اعتماد ان اداروں کی نااہلی اور سیاستدانوں کا اپنے وعدوں سے مکر جانا ہے۔ سیاستدان جو عوام کا ووٹ لے کر اور عوام سے کئی طرح کے وعدے کرکے جب اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھتے ہیں تو اسی عوام کو بھول جاتے ہیں ۔اسی عوام کے پیسے (ٹیکس) سے عیاشی کرنے والے انھی کو نجس خیال کرتے ہیں اور اکثر عوام کی مشکلات میں یہ عوامی نمائندے کہیں نظر نہیں آتے ۔ جہاں ان کی ضرورت ہوتی ہے یہ لوگ وہاں بھی نہیں پہنچ پاتے۔اگر پہنچتے بھی ہیں تو بھی ان کی امداد کا دائرہِ کار ان بے بس لوگوں کے احوال کا فضائی جائزہ لینے تک ہی محدود رہتا ہے۔ چاہے وہ سیلاب زدگان ہوں یا قحط سے بلکتے بچے یہ عوامی نمائندے ان کی مدد کو نہیں پہنچتے ۔اور سیکیورٹی اداروں کا یہ حال ہے کہ پولیس اپنی عمارتوں اور ملکیت کی حفاظت خود نہیں کرسکتی، یہ بھی فوج ہی کرتی ہے ۔اگر ہر مشکل کا

حل فوج کے پاس ہے تو کسی کو فوج پر تنقید کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔اس صورت حال میں عوام ایسے اداروں پر کس طرح سے اعتماد کر سکتے ہیں جہاں رشوتستانی، اقربا پروری اور کرپشن کا دور دورہ ہو۔

ارضِ وطن کے تمام اداروں میں فوج وہ واحدادارہ ہے جو اپنے فرائض کے ساتھ ساتھ دوسرے اداروں، کے فرائض بھی سرانجام دے رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ فوج اس ملک کا طاقت ور ترین اور قابلِ اعتبار ادارہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب کوئی فوجی جرنیل جمہوریت کی بساط الٹتا ہے تو عوام اس پر اندھا اعتماد کرتے ہیں اور اس کا ساتھ دیتے ہیں کیونکہ جمہوریت کبھی بھی عوام کو وہ سب فراہم نہیں کر پائی جس کا ان سیاستدانوں نے وعدہ کیا۔ عوام یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ جمہوریت کی نسبت آمریت بہتر ہے جس میں کم از کم ان کی جان و مال تو محفوظ ہیں۔ عوام کا اعتماد ان اداروں پر بحال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر ادارہ اپنے فرائض منصبی احسن طریقے سے سرانجام دے۔ ادارے بالعموم اور سیاست دان بالخصوص اپنے رویے کو تبدیل کریں۔ وہ سیاست دان جو عوام کی ووٹ سے منتخب ہو کر ایوان اقتدار میں پہنچتے ہیں انھیں عوام کے لیے اپنے مفاد سے بالاتر ہو کر کام کرنا ہوگا۔ اور عوام کی ہر مشکل میں انھیں فضائی دوروں کی بجائے عملی طور پر عوام کا ساتھ دینا ہو گا۔ قدرتی آفت کی صورت میں ان عوامی نمائندوں کو عوام کے ساتھ عملا کھڑا ہونا ہو گا۔ عوام کے مسائل کے حل کے

لیے ٹاک شوز کی بجائے اداروں کو مستحکم کریں اور تمام اداروں میں سے سیاسی اثراندازی کو ختم کریں، کرپشن اور بدعنوانی کا خاتمہ کریں کہ عوام کا پارلیمنٹ پر کھویا ہوا اعتماد بحال ہو۔

اگر ہر ادارہ اپنے دائرۂ کار میں رہتے ہوئے عوام کو وہ سب کچھ فراہم کرے جس کا آئین ان کو حق دیتا ہے۔ تو کوئی شک نہیں کہ عوام کا اعتماد ان اداروں پر بھی بحال ہو جائے گا۔

حالیہ دھرنے ۔۔۔کیا کھویا؟کیا پایا؟

انقلاب یا آزادی مارچ مارچ کا آغاز یوم آزادی یعنی ۱۴ اگست سے ہوا۔ مختلف شہروں سے ہوتے ہوئے پی ٹی آئی اور پی اے ٹی کے کارکنان اسلام آباد پہنچے۔ ملکی تاریخ میں پہلی بار درالحکومت اسلام آباد کو احتجاج کے لیئے چنا گیااور مارچ کے بعد دھرنا بھی اسلام آبادکے ریڈ زون ایریا میں دیاگیا ہے۔۔یہ دھرناجو 14 اگست کواسلام آباد سے شروع ہوا تھااب جلسے جلسوں کی شکل اختیار کرکے پورے ملک میں پھیل چکا ہے ۔پی ٹی آئی اور پی ٹی اے کا یہ دھرنا قریبادو ماہ تک جاری رہا۔ پی ٹی آئی ابھی تک اپنے مطالبات سے دسبردار نہیں ہوئی جبکہ مولانا طاہر القادری نیچند دن پہلے اپنے مطالبات سے دستبردار ہوتے ہوئے دھرنے کو ختم کرنے کا اعلان کیا ہے۔ پی ٹی آئی اب دھرنے کے علاوہ پورے ملک میں جلسے کر رہی ہے۔یہ دھرنا تو ختم ہو گیا لیکن اس دھرنے نے ملک کے معاشی اور معاشرتی حالات پر کیا اثرات مرتب کیئے اور کر رہے ہیں ۔آ یئے ایک نظر ان پر بھی ڈالیں۔

ا۔ان دھرنوں کا سب سے بڑا فائدہ پاکستان تحریکِ انصاف کو یہ ہوا یہ جماعت ایک عوامی طاقت بن کر ابھری ہے۔ ملکی سیاست میں پہلے صرف دو پارٹیاں (پی

پی پی اور مسلم لیگ ن) ہی بڑی پارٹیاں تھی۔ دو دہایوں سے یہی دو پارٹیاں ملکی سیاست پر قابض رہی۔ یہی دونوں پارٹیاں یا تو حکومت میں رہی یا اپوزیشن میں۔ ان دھرنوں کی بدولت سیاست میں بہت بڑی تبدیلی یہ آئی ہے کہ ان دو پارٹیوں کے علاوہ بھی سیاست میں چھایا ہوا جمود ٹوٹ گیا ہے۔ ملکی تاریخ میں پہلی بار لوگ اتنی بڑی تعداد میں اکٹھے ہوئے جن میں نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد دیکھنے میں آئی۔ لوگوں میں بیداری کی لہر دوڑ گئی ہے۔ ان دھرنوں میں کئے گئے مطالبات اگرچہ پورے نہیں ہوسکے تاہم ملکی سیاست میں چھایا ہوا جمود ٹوٹ چکا ہے۔ تجزیہ نگار چاہے ان دھرنوں کو مفید یا غیر مفید قرار دیں لیکن اس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ان دھرنوں کی بدولت عوام کو احتجاج کی ایک پرامن راہ دکھا دی گئی ہے۔

دوسرا اہم فائدہ یہ ہواہیکہ عوام کو یہ اندازہ ہوگیا ہے کہ اگر وہ اکٹھے ہو جائیں، احتجاج کی راہ اپنائیں تو ان کی بات سنی جائے گی۔ پہلے لوگ کسی نہ کسی لیڈر کے پیچھے چلتے تھے اب لوگوں ایک نظریے کی پیروی کریں گے کیونکہ عمران خان ایک شخصیت نہیں بلکہ اس نے عوام کو ایک نظریہ دیا ہے۔ عمران خان کے سیاست کیریر میں یہ دھرنا ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دھرنے نے عمران خان کی شہرت میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے اور آگے آنے والے الیکشن میں یہ دھرنا پی ٹی آئی کو بہت حد تک فائدہ بھی دے گا لیکن اس کے برعکس دھرنے

کو ختم کرنے کے اعلان سے علامہ طاہر القادری جو کہ عالمی شہرت یافتہ مذہبی عالم ہیں۔ اور ایک عالم کے طور پر لوگ ان کی بے حد تعظیم و تکریم کرتے تھے ان کی شہرت میں کمی واقع ہوئی ہے۔

تیسرا اہم فائدہ یہ ہوا ہے کہ صدیوں سے رائج وی آئی پی کلچر کا اب خاتمہ ہوتا نظر آتا ہے۔ عوام نے اب وی آئی پی کلچر کے دلدادہ سیاست دانوں کو ریجکٹ کر دیا ہے۔ اور اب عوام اپنے جائز حق کے لیے لڑنے کے لیے گھروں سے باہر آ رہے ہیں اور وہ لوگ جو کبھی احتجاج کی راہ اختیار نہیں کرتے وہ بھی اس میں شامل ہیں۔

ان تمام فوائد کے ساتھ ساتھ ان دھرنوں سے ملکی معیشت کو چند نقصانات سے بھی پالا پڑا۔ جن میں سے چند ایک کا ذکر یہاں کرنا لازم ہے۔

دونوں مارچ (انقلاب مارچ اور آزادی مارچ) کے آغاز سے ہی اسلام آباد اور دوسرے شہروں کو ملانے والی سڑکوں پر جابجا کنٹینر لگا کر انھیں بند کر دیا گیا۔ اس صورت حال سے صرف عوام نہیں کنٹینر مالقان نے بھی نقصان اٹھایا۔ ۔ یہ کنٹینر کئی روز تک سڑکوں پر کھڑے رہے کنٹینر مالکان کو خود یہ کنٹینر ہٹانا پڑے۔ ایک کنٹینر کا ایک دن کا کرایہ قریبا ۱۵۰۰۰ ہے اور یہ کرایہ کسی کو ادا نہیں کیا گیا۔ کرایہ کے علاوہ یہ کنٹینر سامان کی ترسیل کے

کام سے ہٹا کر سڑکوں پر کھڑے کر دیئے گئے اس سے سامان چاہے وہ کسی بھی طرح کا ہو اس کی ترسیل بری طرح متاثر ہوئی ہے۔

آمد ورفت کی مشکلات کے سبب اسلام آباد کے گرد ونواح میں کھانے پینے کی اشیاء کی ترسیل میں کمی ہوئی اور یہ اشیاء مہنگے داموں فروخت ہوتی رہی ۔مارکیٹ میں آٹے سمیت ہر چیز غائب ہوتی جا رہی ہے ۔اس صورت حال کا فائدہ ذخیرہ اندوزوں نے اٹھایا اور اشیائے خوردونوش کی مصنوعی قلت پیدا کر دی ۔اس صورت حال کا شکار نہ صرف عوام میں بلکہ دھرنوں میں موجود کارکنان کو بھی اسی طرح کے حالات کا سامنا رہا۔ اشیائے خوردونوش کے ساتھ ساتھ چھتریاں اور ڈسپوزبل گلاس وغیرہ کی قیمتوں بھی آسمان کو چھونے لگی ہیں ۔۔

حالیہ دھرنوں نے بین الاقوامی سطح پر پاکستان کی پوزیشن کو مزید خراب کیا ہے۔ عالمی اداروں کے چونکہ دفاتر زیادہ تر اسلام آباد میں اس لیے ان اداروں کا کام بھی بری طرح متاثر ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دونوں دھڑوں آزادی مارچ اور انقلاب مارچ کا آپس میں ضم نہ ہونا اقوام عالم کو یہ دکھاتا رہا کہ ہمارے مطالبات تو ایک ہیں لیکن ہم متحد نہیں ۔دونوں دھرنوں میں موجود شراکاء بھی ایک مشرقی اقدار کے پابند جبکہ دوسرے مغربی اقدار کے دلدادہ۔ عالمی سطح پر اس وقت پاکستان ایک سیاسی محاذ آرائی کا شکار ملک

نظر آتا ہے اور یہ جمہوریت کی ناکامی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ان دھرنوں کی وجہ سے سٹاک ایکس چینج میں واضع مندی نظر آئی اور روز بروز اس مندی میں اضافہ دیکھنے کو مل رہا ہے۔ چین کے صدر جو اس دوران ہندوستان کے دورے کے بعد پاکستان آنے کا ارادہ رکھتے تھے انھوں نے اپنا یہ دورہ ملتوی کر دیا۔ اور اس طرح کئی ترقیاتی معاہدوں پر دستخط نہ ہو سکے۔

ان دھرنوں کی وجہ سے راولپنڈی اسلام آباد میں شروع ہونے والے ترقیاتی کام بھی رک گئے ہیں۔ اور ان کاموں سے وابسطہ افراد بے روزگار ہوتے نظر آئے۔ (یہ کام اب تاخیر سے دوبارہ شروع کئے گئے) ۔

اگر ان حالات کا معاشی جائزہ لیا جائے تو اعداد و شمار مزید پریشان کن نظر آتے ہیں۔ ملکی معیشت کو ان چند دونوں میں ۱۹ ارب ڈالر کا نقصان ہوچکا ہو۔ اور اس میں دن بدن اضافہ ہو گا۔۔ بیرونی سرمایہ کاری پہلے ہی دہشت گردی کی بدولت نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے ان حالات کے مد نظر ملکی سرمائیہ کار بھی بدظن ہو کر اپنا سرمائیہ دوسرے ممالک میں منتقل کرنے لگے ہیں۔ جتنا نقصان سرمایہ کاروں کو ان دنوں ہوا ہے اتنا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ پنڈی اسلام آباد میں دوکان دار اور دھاڑی دار مزدوروں کو روزی نہ ملنے کی وجہ سے

یہ لوگ ملازمت پیشہ افراد سے کہیں زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ دھاڑی دار مزدوروں کی روزری روٹی انھی مارکیٹوں سے منسلک ہوتی ہے۔مار کیٹیں بند ہونے کی وجہ سے یہ لوگ دو وقت کی روٹی حاصل کرنے سے قاصر رہے۔

یہاں یہ واضع کر دینا چاہوں گی کہ میں کسی پارٹی کو سپورٹ نہیں کرتی۔ نہ تو میں حکومت کی حمایت کرتی ہوں نہ ہی کسی اور سیاسی پارٹی کی۔ میرا مطمع نظر صرف یہ ہے کہ جب سیاسی محاظ آرائی میں ملکی معیشت کو نقصان پہنچتا ہے اور اس طرح پہلے سے کمزور معیشت مزید کمزوری کی جانب بڑھتی ہے۔ملک میں احتجاج ہونا چاہیے ، بہتری آنی چاہیے لیکن اس انداز سے کہ معیشت کا پہیہ جام نہ ہو۔ ملکی معیشت کو کسی قسم کا معاشی نقصان نہ اٹھانا پڑے۔

نئے اسلامی سال کا امتِ مسلمہ کو پیغام

اسلامی سال کا آغاز محرم الحرام کے مہینے سے ہوتا ہے۔ موجود اسلامی سال کا آغاز 26 اکتوبر 2014 کو ہو چکا ہے۔ ہر سال کی طرح اس بار بھی جہاں اسلامی سال کا آغاز حضرت امام حسینؓ کی یاد اور واقع کربلا کی یاد تازہ کرتا ہے وہاں یہ سال امتِ مسلمہ کے لیے ان گنت پیغام بھی لے کر آتا ہے۔

تاریخِ اسلام کی روشنی میں اسلامی سال کا آغاز کربلا کے عظیم سانحہ اور حضرت امام حسینؓ کی عظیم قربانی کی یاد سے ہوتا ہے جو اپنے اندراز خود ایک بہت بڑا پیغام لیے ہوئے ہے۔اسلامی سال کے آغاز سے ہی ملک کے طول و عرض میں فقہ جعفریہ سے تعلق رکھنے والے افراد مجالس اور جلسے جلسوں کا اہتمام کرتے ہیں جن میں حضرت امام حسینؓ اور آئمہ کرامؓ کے دیئے ہوئے سبق کو دھرایا جاتا ہے۔اسلامی سال کا آغازاور واقع کربلا ہمیں پیغام دیتا ہے کہ دین کی سربلندی کے لیے کسی قسم کی جانی اور مالی قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ دین کی اشاعت و احیاء کے لیے اپنے مفادات کو خاطر میں نہ لانا ہی ایک مسلمان کا شیوہ ہے۔ یہ واقع ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ گفتار کے غازی نہ بنیں بلکہ اپنے کردار و عمل سے ثابت کریں کہ ہم ایک غیرت مندامت ہیں جو کہ

حق کی سربلندی کے لیے جان لٹانے سے گریز نہیں کرتے۔ دنیاوی اقتدار اور طاقت عارضی ہے۔اس لیے اقتدار سے زیادہ دین کو اہمیت دے کر دنیا پر دین کو ترجیح دی جانی چاہیے۔

حق کی سربلندی کے لیے طاقت اور تعداد کی کمی کو عذر نہ بنایا جائے بلکہ جہدِ مسلسل اور سعی و عمل کی ضرورت ہے۔ اور اگر حق کی سربلندی کے لیے مٹھی بھر لوگ بھی جدوجہد کریں تو اس جدوجہد کے دوررس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔بظاہر شکست کا مطالب ہر گز ہر گز ناکامی نہیں ہے بلکہ بعض اوقات عارضی شکست درحقیقت ایک مستقل فتح بن جاتی ہے۔اور اگر بظاہر کبھی شکست سے دوچار ہونا بھی پڑے تو اس کو مستقل ناکامی سمجھ کر دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اہم شکست یا فتح نہیں بلکہ اہم وہ جدوجہد ہے جو کسی مقصد کے حصول کے لیے کی گئی۔تاریخ گواہ ہے کہ حضرت امام حسینؓ کو بظاہر شکست سے دوچار ہونا پڑااور ان کے اہل وایال کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن درحقیقت یہ شکست ایک مستقل فتح بن گئی۔ اسی جدوجہد کی بدولت دین اسلام کو سربلندی حاصل ہوئی اور دینِ اسلام کی روح مسخ ہونے سے بچ گئی۔ دنیائے اسلام کے ساتھ ساتھ غیر مسلم دنیا بھی حضرت امام حسینؓ کی کوشش اور دینِ اسلام کی سربلندی کے لیے دی گئی قربانیوں کو خراجِ تحسین پیش کرتی ہے جبکہ یزید کے مدفن تک کو کوئی نہیں جانتا۔چارلس ڈکنز نے کہا

."اگر حسینؓ نے دنیاوی جاہ وجلال کے لیے جنگ لڑی تو میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ان کی بہن، بیوی اور بیٹی نے ان کا ساتھ کیوں دیا۔ یہ بتاتا ہے کہ ان کی قربانی خالص الخاص دینِ اسلام کی لیے تھی۔"

اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ خواتین کا کردار امن کے لیے، اور کسی بھی مقصد میں کامیابی کے لیے بے حد ضروری ہے۔ دین کی سربلندی کے لیے مرد تو اپنی جگہ لیکن عورت کو بھی کسی قسم کی قربانی سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ حضرت زینبؓ کا کردار واقع کربلاء اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات میں اس قدر جرات و ہمت لیے ہوئے ہے کہ اس کی تاریخ میں کہیں مثال نہیں ملتی۔ گویا عورتوں کا بھی دین کی سربلندی کی خاطر جدوجہد کرنا اتنا ہی ضروری اور اتنی ہی اہمیت کا حامل ہے جتنا کہ مردوں کا۔ عورت کی جدوجہد کے بغیر کسی بھی مقصد میں کامیابی ممکن نہیں ہے۔ عورت کو بھی جرات و ہمت، استقلال کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور حالات کس قدر برے ہی کیوں نہ ہوں عورت کو جرات کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔

اسلامی سال کا آغاز ہمیں جرات و ہمت کا پیغام بھی دیتا ہے۔ یہ ہمیں پیغام دیتا ہے کہ حضرت امام حسینؓ کے خانوادے کی تقلید کرتے ہوئے حق کی سربلندی کے لیے جرات اور ہمت کا مظاہرہ کریں۔ اور دین اسلام کی خاطر اپنی جان تک

قربان کرنے سے گریز نہ کریں۔ حق کی سربلندی کے لیے آپ کے پاس حکومت یا طاقت کا ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ اس کے لیے جرات، ہمت اور حوصلے کا ہونا ضروری ہے۔ جس طرح حضرت امام حسین کے مٹھی بھر ساتھیوں نے یزید کے ایک بڑے لشکر کا مقابلہ کیا وہ ناقابلِ فراموش ہے اور رہتی دنیا تک کی نسلوں کے لیے قابلِ تقلید بھی۔

ایک اہم پیغام جو آغاز سال اور واقعِ کربلا دیتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت امام حسینؓ کو شکست صرف اور صرف کوفیوں کی خاموشی اور بے حسی کی وجہ سے ہوئی۔ حضرت امام حسینؓ کی بظاہر شکست میں کوفیوں کا ایک اہم کردار رہا۔ کوفہ والوں نے آپ کو کوفہ آنے کی دعوت اور مدد کا یقین دلایا لیکن جب حضرت امام حسینؓ اپنے عیال کے ساتھ کوفہ تشریف لے گئے تو کوفہ والوں نے نہ صرف آپ کا ساتھ نہ دیا بلکہ اخاموشی اختیار کی اور یزیدی حکومت کے ڈر اور خوف کی وجہ سے اس کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا۔ اس واقع سے ہمیں یہ پیغام بھی ملتا ہے کہ جہاں ظلم و بربریت کا دور دورہ ہو وہاں مظلام کا خاموش رہنا ظلم کا ساتھ دینے کے مترادف ہے۔ اگر مظلوم ظالم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں تو انھیں کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ اور اگر کوئی ظلم کے خلاف آواز اٹھائے تو مظلوم کو اس کا ساتھ دینا بے حد ضروری ہے۔

یہ مہینہ، آغازِ سال اور یہ واقع ہمیں یہ بھی پیغام دیتا ہے کہ استبدالی قوتوں کے خلاف تمام امت کو یک جان ہو کر ان قوتوں کا مقابلہ کرنا ہو گا اور جب تک مسلمان امت متحد نہیں ہو گی تب تک مسلمان یونہی ذلیل وخوار ہوتے رہیں گے۔ امتِ مسلمہ کی بقا اتحاد اور یگانگت میں پوشیدہ ہے۔جب تک امتِ مسلمہ اپنے اندرونی فشار کو ختم نہیں کر لیتی تب تک یہ کفار سے مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہو سکتی۔فرقہ پرستی کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔ تمام تر اختلافات کو بھلا کر پوری دنیا میں جہاں جہاں مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جا رہے ہیں ان کی مدد کی جائے۔ اگر تمام مسلمان ممالک متحد ہو جائیں تو ایک عظیم عالمی قوت کے طور پر ابھر سکتے ہیں۔ اتحاد کی صورت میں مسلمان ممالک کو کسی اور ملک کی ضرورت ہی نہیں رہے گی کیونکہ یہ ممالک دنیا کے بیشتر وسائل کے مالک ہیں۔

اسلام کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین

کردارِ حضرت زینبؓ اور آج کی عورت

حضرت زینبؓ 5 جمادی الاول 5 کو پیدا ہوئی۔ حضرت فاطمہؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ کی یہ ارخ اسلامی کی ایک محترم اور قابلِ تقلید شخصیت ہیں۔ ہمت حوصلے اور سعی و عمل کا منہ بولتا ثبوت یہ عالی نصب ہستی حضرت علیؓ کی صاحبزادیوں میں سب سے بڑی ہیں۔ جنہیں عقیلہ بنی ہاشم بھی کہا جاتا تھا۔ حضرت زینبؓ کی کنیت ام مصائب، ام کلثوم، ان کا لقب صغریٰ نبی آخرالزماں آپ کا نام زینب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے رکھا۔

حضرت امام حسینؓ ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔ بہنوں میں سب سے بڑی ہونے کی وجہ سے اپنی والدہ ماجدہ حضرت فاطمہؓ کے بعد گھر کے معاملات کی ذمہ دار بھی تھیں۔ ان کی شادی حضرت جعفر طیارؓ کے فرزند عبداللہ سے ہوئی۔ حضرت زینبؓ کی اولاد کے نام علی، عون اکبر، عباس، جعفر اکبر، محمد، عون محمد ہیں۔ جن میں محمد کربلا میں شہید ہوئے۔

کربلا کی تاریخ کے دو باب نہایت اہم ہیں ایک حضرت امام حسینؓ اور دوسری حضرت زینبؓ۔ حضرت زینبؓ کے مقام و عظمت کو کون جان سکتا ہے۔ آپ کا صبر عظیم صبر ہے۔ یہ وہ صبر نہیں جو حالتِ مجبوری میں اپنایا جاتا ہے بلکہ یہ

صبر وہ صبر ہے جو سوچ سمجھ کر اختیار کیا جاتا ہے اور اصولی صبر ہے۔ حضرت زینبؑ ظلم و استبداد کے خلاف جہاد میں اپنے بھائی کے ساتھ رہیں۔ حضرت زینبؑ نے اپنے بھائی کے حوصلے میں اضافہ کیا۔ حضرت زینبؑ، عملاً حضرت امام حسینؑ کی ہمت اور دست و بازو بنی رہیں۔ یہاں تک کہ جب کربلا میں حضرت امام حسینؑ اور بیٹوں کی شہادت رونما ہو چکی تو بھی آپؑ نے ہمت نہ ہاری۔ ہمت اور حوصلہ کی حامل خاتون تھی جنھوں نے انتہائی مخدوش حالات میں بھی ہمت نہ ہاری بلکہ دعا فرمائی

اے اللہ ہم سے یہ قربانی قبول فرما

کربلا میں جنگ کے خاتمے کے بعد حضرت زینبؑ اور اہلِ بیت کے ساتھ دمشق لے جایا گیا جہاں آپؑ نے استقامت، عبادت، ایثار، جہاد اور حمایتِ دین کا جو مظاہرہ کیا اس کی تاریخ میں کہیں مثال نہیں ملتی۔ حضرت زینبؑ کا امام حسینؑ کے ساتھ مکہ سے مدینہ اور مدینہ سے کربلا تک کا سفر اور پھر دمشق میں قیام ایک غیر معمولی کارنامہ تھا۔ دس محرم کو امام حسینؑ کے بعد یتیموں، بیواؤں اور جوانوں، عورتوں کی نگرانی، دشمنوں کے مقابلے میں صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ جس کی تاریخ میں کہیں مثال نہیں ملتی۔ جب یہ لٹا پٹا قافلہ قید کر دیا گیا اور عبداللہ بن زیاد کے سجے سجائے دربار میں پیش کیا گیا۔ آپؑ کی ردا بھی آپ کے سر پر نہ تھی۔ حق کی سربلندی کے لیے آپؑ خاموش نہ

رہیں بلکہ آپؑ نے اہلِ دربار کو مخاطب کرکے خطبہ دیا اور آپؑ نے عبداللہ بن زیاد کے دربار میں اس کی گستاخیوں کا جواب اتنی جرات مندی سے دیا کہ عبداللہ بن زیاد اور اس کے درباریوں پر آپؑ کا رعب و دبدبہ بیٹھ گیا۔یزید کے دربار میں حضرت زینبؑ کی تقاریر نے اہلِ دمشق کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا اور سلطنتِ بنو امیہ کی بنیادوں کو ہلا دیا۔حضرت زینبؑ کی کوفہ میں کی گئی لاجواب تقریریں تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔انھوں نے لوگوں میں ایک شعور بیدار کیا اور یہ ثابت کیا کہ ظلم و بربریت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور عورت بھی کسی طور مرد سے کم نہیں۔حق کی سربلندی کے لیے اٹھ کھڑے ہونا ہی بہادری کی علامت ہے۔اس کے بعد شام کا سفر، شام کے بازاروں سے گزرتے ہوئے قافلے اور امام زین العابدینؑ کو ابنِ زیاد کے ہاتھوں سے زندہ بچا لینا آپ کا ایک عظیم کارنامہ تھا اور آپؑ ہی کا کارنامہ تھا کہ اتنے بڑے سانحہ کے بعد بھی عالم اسلام میں امن برقرار رہا۔

بشیر بن ہاضم اسدی نے کہا

بخدا میں نے آج تک حضرت زینبؑ جتنی باکردار، باوصف مقررہ نہیں دیکھی۔جنھوں نے بالکل اسی طرح تبلیغِ دین کی جس طرح حضرت علیؑ نے کی۔

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ حضرت زینبؑ کی پوری زندگی حضور نبی پاک

ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں گزری۔ یہ اسلام کی وہ معزز ہستی ہیں جو تہی دامن ہوتے ہوئے بھی، جب سر پر چادر بھی چھین لی گئی، خاندان کے افراد کو شہید کر دیا گیا۔ اس وقت بھی حضرت زینبؓ نے اولادِ حضرت علیؑ ہونے کا ثبوت دیا اور بہادری کا وہ مظاہرہ کیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ حضرت زینبؓ کی حیاتِ مبارکہ ہمیں یہ سبق بھی دیتی ہے کہ عورت ذمہ داری سے بری الذمہ نہیں ہو سکتی بلکہ عورت کی ذمہ داری مرد کے برابر ہے۔ بلکہ بعض صورتوں میں عورت کی ذمہ داری مرد کی نسبت زیادہ ہے۔

حضرت زینبؓ کی زندگی آج کی عورت کے لیے مشعلِ راہ ہے اور یہ سبق دیتی ہے کہ حالات کتنے ہی مشکل کیوں نہ ہوں عورتوں کو ہمت نہیں ہارنی چاہیے بلکہ دین کی سر بلندی اور حق کی بقا کی جنگ لڑنے کے لیے دشمن کے سامنے کھڑے ہو جانا ہی عقلمندی کا تقاضا ہے۔ عورت کو صبر و تحمل کا نمونہ ہونا چاہیے۔ ظلم و بربریت کے خلاف خاموشی اختیار کرنے کی نسبت آواز بلند کرنا زیادہ اہم ہے۔

آج کی عورت کردار سے بھی عاری، صبر و تحمل سے بھی عاری، ہمت و حوصلہ سے بھی عاری ہے۔ عورت کی یہی وہ کمزوریاں ہیں جن کی وجہ سے پورا معاشرہ کمزور ہوتا جا رہا ہے کیونکہ عورت ہی وہ ہستی ہے جس کی گود میں ایک نسل پروان

چڑھتی ہے۔ اگر ایک عورت دین دار ہو، نیک ہو، علم رکھتی ہو تو وہ نسلوں کو سنوار سکتی ہے اس کے برعکس اگر عورت دین اور دنیا کا علم نہ رکھتی ہو تو وہ اگلی نسل میں بھی وہی منتقل کرے گی جن خیالات کی وہ خود مالک ہوگی۔ جو سر پر خود دوپٹہ لینا پسند نہ کرتی ہو وہ اولاد کو بھی یہی سکھائے گی۔ عورت چاہیے چار دیوری میں رہتے ہوئے یا روزی روٹی کمانے کے لیے بھی مرد کا ساتھ دے تو معاشرہ مجموعی طور پر مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جائے گا۔ اگر عورت دین اور حق کی سربلندی کے مرد کا ساتھ نہ دے تو مرد کوئی جنگ نہیں جیت سکتا۔ معاشرے میں پھیلی ظلم و بربریت، بے انصافی کا خاتمہ بھی اسی طور پر ممکن ہے جب عورت بھی مرد کے شانہ بشانہ کھڑی ہو گی اور اپنی ذمہ داری کو سمجھے گی۔

حضرت زینبؓ کی زندگی، اور اسوۃ حسنہ آج کی عورت کے لیے زادِراہ ہے اور اگر آج کی عورت اپنی زندگی کے ہر معاملے میں کردارِزینبؓ کو مدِ نظر رکھے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ معاشرے میں پھیلی یزیدیت کا خاتمہ نہ ہوسکے۔ الغرض آج کی عورت کو دین و دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لیئے اپنے ہر معاملے میں حضرت زینبؓ کی زندگی سے سبق لینا چاہیے۔

اہلِ اقتدار کے نام

بہتر ہے ستاروں پر نہ ڈالو کمندیں
انسان کی خبر لو کہ وہ دم توڑ رہا ہے

عوام ، ہمارے ملک میں عوام سے مراد وہ عام لوگ ہیں جن کے نصیب میں بم دھماکوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جانا ہے جن کو بچانے والے ادارے انٹیلی جنس کی رو پورٹ کے باوجود ان کی حفاظت کے لیے اقدامات نہیں کرتے ۔ اور کسی بھی دہشت گردی کے واقع کے بعد اظہارِ افسوس کر کہ انھیں مطمئن کر دیا جاتا ہے ۔ اگر کسی وی آئی پی کو کسی سڑک سے گزرنا ہو تو انھیں کیڑے مکوڑوں کی طرح سڑکوں پر روک دیا جاتا ہے اور اس وقت تک یہ لوگ اس سڑک پر سفر نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ وی آئی پی اس سڑک سے گزر نہ جائے۔ چاہے اس میں آدھا گھنٹہ گزر جائے یا ایک یا اس سے زیادہ۔ کوئی مریض ہو یا کوئی بزرگ ہر ایک کو گھنٹوں ان وی آئی پیز کے گزر جانے کا انتظار کرنا پڑھتا ہے ۔ اگر احتجاج کی غرض سے ایوانِ اقتدار کا رخ کریں تو انھیں مویشیوں کی طرح ہانکا جاتا ہے اور ان پر گولیاں چلائی جاتی ہیں ۔ وہ اپنے مطالبات پورے کروانے کے لیے جتنے دن مرضی احتجاج کرتے رہیں اہلِ اقتدار کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ سیاست دانوں کے فارم ہاؤس کو بچانے کی خاطر سیلاب کا رخ ان کی

بستیوں کی طرف موڑ کر بستیوں کی بستیاں تباہ کر دی جاتی ہیں۔ ان کی فصلیں، مویشی، گھر سب تباہ ہو جائیں یا وہ جان سے جائیں ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ یہ بھوک اور افلاس سے مر رہے ہوتے ہیں تو ان کا کوئی پرسانحال نہیں ہوتا۔ کوئی منتخب نمائندہ ان کی مدد کو نہیں پہنچتا۔ جب ان پر ہندوستان کی جانب سے گولیوں کی بوچھاڑ کی جاتی ہے اور بلا اشتعال بارود کا استعمال کیا جاتا ہے تو ان کے منتخب کردہ سیاست دان خاموش رہتے ہیں اور ان کے وزیر اعظم خیر سگالی کے طور پر آموں اور ساڑھیوں کی پیٹیاں بھجتے ہیں۔ جن کی حیثیت یہ ہی کہ سیاست دان ان کی آنکھوں پر وعدوں کی پٹی باندھ کر جلسے جلسوں میں انھی کے بل بوتے پر کامیابیاں حاصل کرتے ہیں، انھیں اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن جب یہی سیاست دان ایوانِ اقتدار میں پہنچ جاتے ہیں تو پلٹ کر اپنے جلسوں میں شامل ووٹروں کا حال تک پوچھنا گوارا نہیں کرتے۔

جبکہ اہل اقتدار اپنے مفاد اور شہرت کی خاطر میٹرو بس پر اربوں روپیہ لگا دیتے ہیں لیکن اس پیسے سے کوئی نیا ڈیم نہیں بنایا جاتا، نہ ہی کوئی انڈسڑی لگائی جاتی ہے کہجو پڑھے لکھے نوجوان وہ بے روزگار ہیں ان کو روزگار مل سکے۔ میٹرو بس ہی کی سڑکوں پر بھیک مانگتے لوگ شاید نسلوں سے اس ابنِ مریم کے انتظار میں ہیں جو آئے گا اور انھیں روزگار کا کوئی موقع مل سکے گا

۔ یہ اہلِ اقتدار پڑھے لکھے نوجوانوں میں اربوں روپے کے لیپ ٹاپ بانٹتے ہیں کیا یہ لیپ ٹاپ ان کو روزی کمانے کا ذریعہ دے سکتے ہیں یا الٹا ان کی اخلاقیات کا جنازہ نکالنے میں مددگار رہے۔ یہ اہل اقتدار پڑھے لکھے نوجوانوں کے لیے لاکھوں روپے کی قرضہ سکیم شروع کرتے ہیں تو اس کی شرائط اس قدر سخت اور اس طرح کی ہیں کہ کوئی غریب اور مجبور پڑھا لکھا نوجوان ان شرائط کو پورا کر ہی نہیں سکتا۔ اور یہ قرضے کس کو دئے گئے؟ دئے گئے بھی یا نہیں؟ یہ پوچھنے والا کوئی نہیں ہے۔

تھر میں پھر سے موت نے اپنے پنجے گاڑھنا شروع کر دیئے ہیں۔ چند ماہ پہلے بھی اس علاقے میں موت کے مہیب سائے چھائے ہوئے تھے اور اب پھر سے بھوک، پیاس تھر کے لوگوں کی زندگی کے دن ختم کرنے لگی ہے۔ تھر کی سسکتی زندگیاں، اربابِ اختیار کی جانب مدد طلب نظروں سے دیکھ رہی ہیں۔ روزانہ مرتے ہوئے بچوں کی آنکھیں کسی موسیٰ کے انتظار میں ہیں۔ لیکن ان کی مدد کرنا، ان کے لیے عملی اقدام کرنا تو درکنار کوئی ان کی مدد کی ذمہ داری لینے کو بھی تیار نہیں۔ نہ صوبائی حکومت، نہ وفاقی حکومت ۔ ہر روز ایک کے بعد دوسری رپورٹ بنتی ہے۔ ٹاک شوز میں بیٹھ کر ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرانے والے مختلف جماعتوں سے تعلق رکھنے والے سیاسی نمائندے گھنٹوں اس بات پر بحث کرتے ہیں کہ اس کی وجوہات کیا ہیں؟ یہ اموات کیوں ہو رہی ہیں؟ ایک کے بعد

دوسری رو پورٹ کو رد کیا جاتا ہے۔ ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے لیکن عملاً ان کی مدد کرنے کو کوئی نہیں پہنچتا۔ نہ ہی ان کے مسائل کا حل نکالا گیا ہے۔ تھر پاکستان کا صحرائی علاقہ ہے اور یہاں کے رہنے والوں کی گزر بسر مویشیوں پر ہے۔ اس علاقے میں پینے کے صاف پانی کو جمع کرنے کا نہ تو کوئی ذخیرہ ہے اور نہ ہی کوئی زیرِ زمین واٹر سپلائی کا انتظام ہے۔ اس علاقے میں بارش کا پانی قدرتی جوہڑوں میں جمع ہوتا ہے اور مویشی اور انسان دونوں ایک ہی جگہ سے پانی پیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس علاقے میں بیماری عام ہے اور خشک سالی میں یہاں پانی کی قلت ہو جاتی ہے۔ اس قلت کی وجہ سے انسان اور مویشی دونوں ہی مرنے لگتے ہیں۔

ان مسائل کے حل کا آج تک کوئی عملی اقدام نہیں کیا گیا۔ یہاں تک کہ بارش کا پانی جمع کرنے کے لیے ان قدرتی جوہڑوں کو بھی پکا نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے بارش کا پانی ریت میں جذب ہو کر ضائع ہو جاتا ہے۔

ان سسکتے بلکتے، اور جان کی بازی ہارتے بچوں کی آنکھیں ان مسیحاؤں کی تلاش میں ہیں جو نہ جانے کب اس پکار کو سنیں گے، سنیں گے بھی یا نہیں۔ تھر کے لوگوں کا صرف اور صرف ایک مطالبہ ہے کہ ان کی زندگیوں اور ان کی معدوم ہوتی ہوئی نسلوں کو بچایا جائے۔ وہ کسی پارٹی، حکومت یا اپوزیشن کے ساتھی نہیں

ہیں انھیں اس سے بھی کوئی غرض نہیں کہ مرسڈیز میں گارڈوں کی فوج لے کے سفر کرنے والوں کے اخراجات کہاں سے پورے ہوتے ہیں ؟ ان کو اس سے بھی کوئی غرض نہیں ہے کہ کون الیکشن جیتتا ہے اور کون ہارتا ہے۔ انھیں غرض ہے تو صرف یہ کہ ان کے لیے پینے کا صاف پانی مہیا کیا جائے۔

اہل اقتدار سے یہ لوگ گذارش کرتے ہیں کہ یہ مرتے ہوئے بچے بھی تو آپ کے بچوں کی طرح ہیں۔ یہ مائیں بہنیں بھی اسی ملک کا حصہ ہیں۔ یہ بوڑھے بھی آپ کے بزرگوں کی طرح ہیں۔ ان کی سسکیوں اور آہوں کو سنیں۔ اور اس علاقے میں پینے کے صاف پانی کا انتظام کردیں۔ اس میں کچھ بہت اخراجات بھی نہیں آنے۔ بس وفاقی یا صوبائی حکومت میں سے کسی ایک کو یہ ذمہ داری اپنے سر لینا ہوگا۔ جتنی جلدی ممکن ہو سکے اس علاقے میں پینے کے صاف پانی کے ذخیرے بنا کر تھے کے لوگوں کی نسلوں کو مرنے سے بچائیں۔

شریک جرم نہ ہوتے تو مخبری کرتے

کہا جاتا ہے کہ انسان ایک معاشرتی حیوان ہے۔انسان اکیلے زندگی نہیں گزار سکتا۔
اسے ہر موڑ پر سہارے کی ضرورت رہتی ہے۔ کچھ یہی حال ایک ملک کا بھی ہوتا ہے۔
کوئی ملک بھی دوسرے ممالک سے کٹ کر اکیلا نہیں رہ سکتا۔ معاشی ترقی کے لیے
بالخصوص دوسرے ممالک سے اچھے تعلقات ہونا ضروری ہیں۔ لیکن یہاں ایک فرق یہ
ہے کہ کسی بھی ملک کے تعلقاتِ عامہ کے ساتھ ساتھ اس قوم کی عزت اور وقار بھی
بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اسی عزت اور وقار کی بدولت وہ اقوامِ عالم میں اپنی بات
منوا سکتا ہے۔ اور یہ اس وقت ممکن ہوتا ہے جب ملکی معیشت مضبوط ہو۔ ملک میں
امن وامان ہو۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بحیثیت قوم وہ وقار اور عزت
کھو چکے ہیں جو کبھی ہمارا خاصہ تھی۔ جس کی بدولت اقوامِ عالم میں ہمارے نقطہء نظر
کو اہمیت دی جاتی تھی۔ اس بدحالی کا سبب ہمارے معاشرے میں پھیلتا ہوا کرپشن کا
ناسور ہے۔یہاں مجھے فن لینڈ کے سفیر کی یہ بات یاد آتی ہے۔ اس نے کہا
" کسی زمانے میں پاکستان ہمارا آئیڈیل ہوتا تھا ہمیں ہر طرح کی مدد دیتا تھا لیکن آج
ہم اس کی مدد کر رہے ہیں "

قوموں کی زندگی میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ قومیں جو خود پر انحصار کرتی ہیں اقوامِ عالم میں ان کا سر ہمیشہ بلند رہتا ہے۔ایسی قومیں جو خود پر انحصار کرنے کی بجائے دوسری قوموں پر انحصار کرنے لگتی ہیں وہ اقوامِ عالم میں آہستہ آہستہ اپنا مقام کھو دیتی ہیں۔ کچھ یہی حال ہمارے ملک کا بھی ہے۔ ابھی چند برس پہلے تک پاکستان پوری دنیا میں ایک عزت ایک مقام رکھتا تھا۔ لیکن اب دہشت گردی، کرپشن کی صورت کلنک کے ٹیکے ماتھے پر سجائے ہم اپنی وہ حیثیت وہ مقام کھو چکے ہیں۔

اگر ہم وطنِ عزیز کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو ہمیں ایک بات صاف نظر آتی ہے کہ ہمارے ملک میں رہنماؤں نے ہمیشہ اپنے مفاد کو ملکی مفاد پر ترجیح دی۔ بیرونِ ملک یہ سیاست دان اپنے بینک اکاؤنٹس کو بھرتے رہے اور ملکی معیشت قرضوں کے بوجھ تلے دبتی رہی۔ چاہے وہ بار بار حکومت کی تبدیلی ہو یا پھر مارشل لاء کا نفاذ دونوں صورتوں میں ملکی مفاد کو پسِ پشت ڈال کر ذاتی مفاد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے فیصلے کیے گئے۔ آمریت میں ملکی مفاد اور عوام کو اظہارِ رائے تک کی اجازت نہیں دی جاتی جبکہ جمہوریت کی صورت میں عوام کا ووٹ اور عوام کی حمایت لے کر منتخب ہونے والے سیاست دان جب اقتدار میں آتے ہیں تو عوام کو یاد کرنا ان کے مسائل حل کرنا تو درکنار وہ روپیہ کمانے کے چکر میں ملکی مفاد تک کا سودا کر بیٹھتے ہیں۔ لیکن بات صرف اشرافیہ تک

محدود نہیں عوام بھی اس میں برابر کے شریک ہیں۔ کیونکہ عوام بار بار جانتے بوجھتے انہی سیاست دونوں کو ووٹ دیتے ہیں۔ اور وہی لوگ پھر سے اقتدار کی کرسی پر آن بیٹھتے ہیں۔جاگیر دارانہ نظام کا شکار عوام ،ان وڈیروں کے علاوہ کسی کو چننے کی بہت کم جرات کرتے ہیں۔ کئی بار آزمائے گئے لوگوں کو پھر سے منتخب کرنے والے اس احساس سے عاری ہیں کہ یہ لوگ ان کے لیے کچھ نہیں کریں گے سوائے وعدوؤں کے۔

بات صرف ووٹ کے استعمال تک محدود ں نہیں۔کہا جاتا ہے کہ کسی ملک کے جیسے عوام ہوتے ہیں اسی طرح کے حکمران ان پر نافذ کیے جاتے ہیں۔ ہم بڑی آسانی کے ساتھ دوسروں کو موردِالزام ٹھراتے ہیں اور خود اپنی ذمہ داری سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں لیکن اپنے گریبان میں جھانکنا نہیں چاہتے۔آج کل جس کو دیکھا جائے وہ حکومت کی کرپشن کے بارے میں گلہ کرتا نظر آتا ہے۔ہر شخص یہ رونا روتا نظر آتا ہے کہ حکومت نے فلاں جگہ کرپشن کی فلاں جگہ بدعنوانی کی۔فلاں جگہ کرپشن ہوئی۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو حکمران طبقے سے لے کر عوام تک ، ایک ریڑھی والے سے لے کر ایک وزیر تک سب کے ہاتھ کرپشن سے رنگے ہوئے ہیں۔ اگرایک ریڑھی والے کو دیکھا جائے تو وہ سامنے صاف لیکن گندہ فروٹ اس صاف فروٹ کے نیچے رکھا ہے

اور نظر بچا کر وہ گاہک کو صاف فروٹ کے داموں میں فروخت کرتا دیتا ہے۔ یہ بھی تو چھوٹی سطح کی کرپشن ہیں۔ اگر کسی آفس کا جائزہ لیں تو اس طرح کی کئی مثالیں آپ کو مل جائیں گی۔ ہر سطح پر، ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ڈنڈی مارلے اور کام دوسروں کے سر پر ڈال دے۔ یہی حال طالبِ علموں کا بھی ہے وہ بھی چاہتے ہیں کہ وہ وقت جو تعلیم کے لیے مختص ہے اسے کھیل کود میں ضائع کریں اور والدین اور اساتذہ کی آنکھوں میں کسی طرح دھول جھونک کر اپنا وقت برباد کردیں۔ کنٹونمنٹ بورڈ کا سوئپر بھی اس وقت تک گلیوں کی صفائی نہیں کرتا جب تک کہ محلے دار اس کو الگ سے پیسے نہ دیں یہ بھی تو ایک طرح کی کرپشن ہے جس کا کسی کو ادراک تک نہیں۔ ایک ایسا شخص جو خود کرپشن کرتا ہو کسی دوسرے کو کرپشن سے نہ تو روک سکتا ہے اور نہ ہی ملکی سطح پر ہونے والی کرپشن کا گلہ کرنا کسی طور جائز نہیں ہے۔ تبدیلی ہمیشہ خود سے اور نچلے طبقے سے شروع ہوتی ہے۔ اگر ہر سطح پر ہر شخص اپنا محاسبہ کرے، کرپشن کو ہر سطح سے ختم کیا جائے تو ملکی سطح پر یہ ناسور خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اگر ہر شخص اپنے انفرادی عمل کو دیکھے تو سبھی اپنی اپنی جگہ خود سے نظریں اٹھا نہیں پائیں گے اور سبھی کے سر شرم سے جھک جائیں گے۔ وہ کوئی ریڑھی بان ہو یا گریڈ بائیس کا افسر سیاستدان ہو یا کسی دفتر کا چپڑاسی، ہر کوئی اپنی اپنی جگہ مجرم ہے اور جس کو جہاں بن پڑتا ہے وہاں وہ کرپشن یا دو نمبری کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔

ہم بحثیت قوم ہر سطح پر بدعنوانی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ انفرادی سطح پر کوئی بھی اپنے آپ کو سدھارنا نہیں چاہتا۔ ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ کوئی مسیحا آئے اور ہمارے حالات کو بدل دے۔ کوئی جادو کی چھڑی گھمائی جائے اور سب ٹھیک ہو جائے لیکن عملی طور پر کوئی کچھ کرنے کو تیار نہیں۔ تو یاد رکھیں کوئی مسیحا، کوئی ابنِ مریم اس وقت تک کچھ نہیں کر سکتا جب تک کہ معاشرے کا ہر فرد اپنی ذمہ داری کو نہ سمجھے۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی

نہ ہو خیال جس کو آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

اگر ہمیں اس ملک کی حالت بدلنا ہے تو انفرادی سطح پر ہر ایک کو خود کو بدلنا ہو گا۔ ملک کی حالتِ زار کو سدھارنے کے لیے ہر ہر شخص کو اپنی سطح پر خود کو سدھارنا ہو گا۔ ہر شخص کو ذمہ داری کا مظاہرہ کرنا ہو گا اور معاشرے کو بہتری کی جانب مائل کرنے میں اپنا حصہ ڈالنا ہو گا۔۔ کیونکہ معاشرہ اکائیوں سے بنتا ہے۔ اجتماعیت انفرادیت کا شاخسانہ ہے۔ اگر ہر شخص دوسروں کی بجائے خود کو سدھار لے تو پورا معاشرہ خود بخود سدھرنے لگے گا کیونکہ اگر ایک شخص خود کرپشن، بدعنوانی نہیں کرتا تو وہ شخص کسی بھی بدعنوان کا

احتساب کر سکتا ہے۔ آپ کسی اور پر تنقید کرنے کے حق دار اس وقت ہیں جب آپ میں خود وہ خامی نہ ہو۔ جب عوام سیدھی راہ پر چلیں گے تو خدا حکمران بھی اچھے نافذ کرے گا۔

طاہر القادری کا انقلاب کیا رنگ لائے گا؟

آج کل موسم سرما کے آغاز کے ساتھ ہی وطنِ عزیز کی سیاسی فضاء میں گرمی کچھ زیادہ ہے۔ 14 اگست سے شروع ہونے والے پی ٹی آئی اور پی اے ٹی کے دھرنوں اور جلسوں کے بعد ملک کے طول و عرض میں جلسے جلوسوں کا ایک سلسلہ شروع ہو چکا ہے ۔ پہلے مولانا طاہر القادری نے انقلاب کا نعرہ بلند کیا اس کے ساتھ ساتھ پی ٹی آئی نے نیا پاکستان بنانے کی باتیں کی، قریبا دو ماہ تک یہ دھرنے اسلام آباد میں جاری رہے ۔ان دھرنوں میں دن رات خطابات کئے گئے۔ ایک ماہ کے بعد مولانا طاہر القادری صاحب واپس کینیڈا چلے گئے جبکہ عمران خان صاحب نے اپنے دھرنے کو جلسوں میں تبدیل کیا اور ملک کے بڑے بڑے شہروں میں جلسے کئے جو کہ ابھی تک جاری ہیں ۔ہر جلسے میں پی ٹی آئی نے بھرپور سیاسی قوت کا مظاہرہ کیا ہے۔ پی ٹی آئی نے 30 نومبر کو ایک اور بڑے جلسے کا اعلان کیا ہے۔ جبکہ علامہ طاہر القادری صاحب بھی کینیڈا سے واپس آچکے ہیں اور وہ بھی میڈیا میں بیانات دیتے رہتے ہیں۔

حکومت اپنی جگہ پر قائم ہے اور اپوزیشن اپنی جگہ پر پی ٹی آئی اور پی اے ٹی کے دھرنوں کے بعد دوسری جماعتوں نے بھی جلسوں کا آغاز کیا۔ مسلم لیگ (ن)

اور پی پی پی (پارلیمنٹرین) نے بھی متعدد شہروں میں جلسے منعقد کیئے ۔اس کے ساتھ ساتھ ہر روز کسی نہ کسی سیاسی جماعت کی طرف سے بیانات اور جلسوں کی تاریخوں کا اعلان سننے کو ملتا ہے ۔ اس طرح ہمارے ملک میں دھرنے اور جلسے جلوسوں کی سیاست کا آغاز ہوچکا ہے ۔ ہر جماعت مختلف شہروں میں سیاسی قوت کا مظاہرہ کر رہی ہے اور ان جلسے جلوسوں میں کروڑوں روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے ۔اور اب باقی سیاسی کی دیکھا دیکھی جماعتِ اسلامی کے امیر سراج الحق صاحب نے ایک تین دوزہ جلسے کا اعلان کیا ہے اور ان کا نعرہ ہے ۔"اسلامی پاکستان ہی خوشحال پاکستان ۔ "جماعتِ اسلامی پاکستان میں اسلام کے نفاذ کی خاطر جلسہ منعقد کر رہی ہے ۔جماعتِ اسلامی کا بھی اجتماع 21,22,23 نومبر کو لاہور میں ہونا قرار پایا ہے ۔جلسے کے پہلے روز ہی کھانے کا بے انتہا انتظام کیا گیا ۔ انواع واقسام کے کھانوں کا اہتمام کیا گیا ۔ قریبا ڈیڑھ سو کے قریب تنور لگائے گئے ۔اور اجتماع میں شامل ارکان میں کھانا تقسیم کیا گیا ۔ اس کے ساتھ ساتھ لاہور میں مینارِ پاکستان اوراس سے متصل عمارات اور سڑکوں کی سیکیورٹی میں اضافہ کیا گیا ہے ۔ لاہور کے علاوہ کسی بھی نا خوشگوار واقع سے بچنے کے لیے اسلام آباد اور دیگر بڑے شہروں میں سکیورٹی کے انتظامات میں اضافہ کر دیا گیا ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بہت سی سڑکوں کو عوام کے لیے بند کر دیا گیا ہے اور ٹریفک کو متبادل رستوں کی جانب موڑ دیا گیا ۔ سونے پر سوہاگہ کے مصادق عوام کا سفر کرنا بھی دوبھر ہوگیا ہے ۔ روزانہ

دفاتر جانے والے افراد کی مشکلات میں مزید اضافہ ہوا ہے۔نہ جانے یہ کیسا انقلاب ہے جو کہ ہر پارٹی الگ الگ لانا چاہتی ہے۔

ان سب جماعتوں کا مطالبہ ایک لیکن انداز مختلف ہے۔ ہر جماعت کا دعویٰ ہے کہ وہ ملک کی تقدیر بدل دے گی ملک میں خوشحالی آئے گی۔ بجلی اور گیس کی فراہمی کو ممکن بنایا جائے گا عوام کو ریلیف دیا جائے گا۔نوجوانوں کو روزگار فراہم کیا جائے گا۔ملکی مفاد کے لیے فیصلے کیے جائیں گے۔ ہر سیاسی جماعت ایک سے دعوے کرتی ہے اور عوام کو ایک سے خواب دیکھاتی ہے۔ عوام ان وعدوں کو پورا ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں اور یہ خواہش رکھتے ہیں کہ بلا تفریق رنگ و نسل ، اور علاقہ پورے ملک میں ترقی کی راہیں استوار ہوں۔ لیکن نہایت افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے اس ایک مطالبہ کے لیے یہ جماعتیں آپس میں متحد نہیں ہیں۔ ہر جماعت چاہتی ہے کہ انقلاب آئے اور اس مخصوص جماعت کے منشور کے مطابق آئے۔یہ کیسا انقلاب ہے جو ملک کے صرف چند حصوں کے لیے ہے جس میں پس ماندہ علاقوں کا ذکر تک نہیں۔

ان سب جلسے جلوسوں کی سیاسی اہمیت اپنی جگہ ، پاکستان کے حالات بدل دینے کے دعوے اپنی جگہ درست اور ان دعوؤں میں سچائی بھی ہو گی۔لیکن ان تمام جماعتوں میں سے کسی ایک جماعت کے قائد نے بھی نہ تو سوچااور نہ ہی کیا کہ

ان جلسوں جلوسوں پر خرچ ہونے والا پیسہ اسی ملک کے ایک حصے تھر میں جان دیتے ہوئے بچوں، بوڑھوں پر خرچ کیا جائے۔ اس قحط زدہ علاقے میں راشن، پانی کی فراہمی کے لیے کوشش کریں۔اس علاقیکو بھی آپ کی امداد کی ضرورت ہے جہاں ابھی موت کی پرچھائیاں ڈھلی نہیں تھیں کہ پھر سے قحط، موت کے بادل اس علاقے کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔آپ ملک کی تقدیر بدلنا چاہتے ہیں ضرور بدلیں، عوام بھی آپ کے ساتھ ہیں لیکن یہ دم توڑتے بچے بھی تو اسی ملک کا مستقبل ہیں۔ یہ بھی ہمارے ہی بچے ہیں۔ ان کی جانب بھی کچھ نظر کیجئے۔ان بچوں کو بھی جینے کا حق ہے۔ انہیں بھی غذا اور پانی چاہیے۔ یہ تو آپ سے تعلیم اور اچھے سکول، کتابیں، کاپیاں بھی نہیں مانگ رہے۔ یہ تو صرف اور صرف آپ سے زندگی کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ ان کی سسکیاں چاہے وہ اہلِ اقتدار ہوں اور پھر اپوزیشن جماعتیں ان تمام سیاست دانوں کو پکار رہی ہیں جو کہ اسلام آباد میں تو گیس کی فراہمی کی خاطر جلسہ منعقد کرتے ہیں لیکن ان بچوں کی جان بچانے کے لیے کوئی عملی اقدام نہیں کرتے۔ ان بچوں کو تو گیس بھی نہیں چاہیے۔ ایک طرف تو مسلۂ مشکلات کے حل کا ہے جبکہ دوسری طرف سوال صرف اور صرف زندگی کا ہے۔آپ نے نوجوانوں کے مسقبل کو سنوارنا ہے ضرور سنواریں ان کو روزگار کی فراہمی کا وعدہ ضرور کریں، لیکن ایک بار تھر کے ان جان سے جاتے نوجوانوں کو بھی دیکھیے یہ بھی اسی ملک کا حصہ ہیں۔ یہ بھی گوشت پوست کے انسان ہیں انھیں آپ سے نوکریاں نہیں چاہیں، نہ ہی یہ ڈگریاں اٹھائے

روزگار ڈھونڈ رہے ہیں۔ انھیں تو آپ سے صرف اور صرف پانی چاہیے۔ آپ سب ایک ہی جانب کیوں دیکھ رہے ہیں۔ اس علاقے کو کیوں بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا ہے۔ وزیر اعلیٰ سندھ ہوں یا وزیر اعظم پاکستان ہوں، سب اپنی اپنی سیاست میں مصروف ہیں۔ اور تھر کے باسی روز جان کی بازی ہار رہے ہیں۔ ان مفلوک الحال لوگوں کے لیے ان جلسوں میں کوئی بات نہیں کی جاتی۔ اہلِ اقتدار تو ایک جانب اپوزیشن نے بھی ان کے بارے میں کوئی قرداد تک پیش نہیں کی۔ اگر بات کی جاتی ہے تو ان شہری علاقوں کی مشکلات کی جنہیں غذائی قلت، یا پانی کی کمی کا سامنا نہیں ہے۔ تھر اور چولستان کا علاقہ بھی تو ہمارے ہی ملک کا حصہ ہے۔ یہ جاں بلب لوگ بھی تو اسی وزیر سندھ اور اسی اپوزیشن کی جانب مدد طلب نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ جماعت اسلامی کے کل کے جلسے ہی کو ایک نظر دیکھیں۔ جماعت اسلامی کے اجتماع میں سات رنگ کے کھانے بانٹے گئے۔ کسی نے یہاں تک نہیں سوچا کہ حسبِ ضرورت کھانا یہاں بانٹا جائے اور بقایا کھانا ان بھوک سے بلکتے لوگوں کو دیا جائے۔ لیکن ایسا نہ تو کسی نے سوچا اور نہ ہی کیا۔

حکومت ہو یا اپوزیشن کسی کے پاس اتنا وقت نہیں کہ اس علاقے کے بسنے والوں کی حالتِ زار پر بھی غور کریں۔ تاریخ عالم جب لکھی جائے گی تو ہمیں ایک بے حس قوم کے طور پر یاد کیا جائے گا۔ جن کے سیاست دان اور عوام عجیب بے

حسی کا مظاہرہ کرتے رہے ایک جانب تو شہری علاقوں میں بسنے والوں کی مشکلات کے حل کے لیے سڑکوں پر نکلے، جلسے منعقد کرتے رہیجبکہ دوسری جانبا ی قوم کے بہن بھائی اور بچے بھوک اور پیاس کی وجہ سے جان کی بازیاں ہارتے رہے۔ تھر کے بچے، بوڑھے جوان ان تمام سیاست دانوں سے چاہے وہ اہلِ اقتدار ہوں یا ان کا تعلق اپوزیشن سے ہو گذارش کرتے ہیں کہ خدارا ان کی مدد کریں۔ اوراس آفت زدہ علاقے میں غذا اور پانی کی فراہمی کے لیے کوشش کریں۔

باپ : ذمہ داری کا تعین لازم ہے

نمازِ مغرب کا وقت تھا جب جڑواں شہروں کے بیچوں بیچ سفر کرتے ہوئے ہماری گاڑی سترہ میل کے قریب نمازِ مغرب ادا کرنے کے لیے روکی گئی ۔ یہاں سڑک کے قریب ہی ایک چھوٹی سی مسجد تھی ۔ بنا کسی تزین و آرائش کے یہ مسجد صرف چند افراد کو نماز پڑھنے کی جگہ دے سکتی ہے ۔ مسجد کے صدر دروازے کے قریب ہی ایک چھوٹا سا بچہ جس کی عمر کم و بیش دس برس ہو گی ۔ اس کے چہرے پر جمی سنجیدگی بتا رہی تھی کہ وہ کافی عرصے سے محنت مزدوری کر رہا ہے ۔ مکئی کے بھٹے کی ریڑھی لگائے کھڑا تھا ۔ مکئی کے بھٹے ابلے ہوئے تھے وہ ان پر لیموں کے ساتھ نمک مرچ لگا کر دس یا پندرہ روپے میں فروخت کر رہا تھا ۔ ہم میں سے چند لوگ نمازِ مغرب ادا کرنے مسجد میں چلے گئے جبکہ چند اس بچے سے مکئی کے بھٹے خریدنے لگے ۔ اس کی حسرت بھری نگاہیں نماز ادا کرنے کے لیے جاتے ہوئے ان سوٹڈ بوٹڈ لوگوں کو تک رہی تھی ۔ ساتھ ساتھ وہ بچہ تندہی سے جلدی جلدی ہمیں بھٹے تیار کرکے کے دینے لگا ۔ ہم اس کی ریڑھی کے قریب ہی کھڑے ہو کر وہ بھٹے کھانے لگے ۔ شام کا وقت تھا ۔ یہ بھٹے وقت گزاری کے ساتھ ساتھ پیٹ بھرنے کا کام بھی کر رہے تھے ۔ اس نے ایک حسرت بھری نگاہ سے ہماری طرف دیکھا اور پھر خود ہی پوچھنے لگا ۔ " کیا آپ لوگ کہیں پڑھتے ہیں ؟؟ " ۔ میں نے کہا " نہیں ! ہم تو نوکری کرتے ہیں ۔ کیا

تم پڑھتے ہو؟" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں نے اس سے پوچھا "تم نے کبھی پڑھنےکی کوشش نہیں کی"؟ میری بات سن کر وہ کچھ مزید اداس ہو گیا اور کچھ یوں گویا ہوا۔" باجی! میں پہلے پڑھتا تھا۔ میں نے چار کلاسیں پڑھی ہیں۔ پھر میرے ابو جہاد کو چلے گئے اور گھر کی روزی روٹی چلانے کو میں کام کرنے لگا۔ باجی! گھر والوں کا پیٹ بھی تو بھرنا ہے ناں۔ ہاں باجی! میں نے سوچا ہے کہ اپنے چھوٹے بھائی کو ضرور پڑھاؤں گا ۔اس کے لہجے میں اپنے باپ کے لیے اور اپنی قسمت کے لیے گلہ تھا۔ اور ساتھ ہی " ساتھ اپنے چھوٹے بھائی کی قسمت بدل دینے کا عزم بھی۔ "سنو بیٹا! تم بھی رات کو گھر جا کر پڑھا کرو، کسی سے کتابیں لو اور پرائیویٹ پیپر دو۔ "میں نے بے اختیار اس کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔" باجی میں بہت دیر سے گھر پہنچتا ہوں دن بھر کھڑا رہ کر چھلی بیچتا ہوں تھکن اتنی کہ ہمت ہی نہ رہے۔ بس گھر جا کر چارپائی پر گر جاتا ہوں ۔کیسے پڑھوں؟" اس کا تھکن زدہ لہجہ کچھ پشتو اور کچھ اردو کا رنگ لیے ہوئے تھا۔" تم کہاں رہتے ہو؟ "میں نے اس سے پوچھا تو اس نے پاس ہی آباد ایک کچے گاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ادھر ہے ہمارا گھر"۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس بچے میں آگے بڑھنے کی لگن ہے۔لیکن اس کے مالی حالات اور ذمہ داریاں اسے پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ "ہمت تو کرنا پڑے گی ناں ۔چند سالوں کی ہی تو بات ہے اس کے بعد تم کہیں نوکری کر سکو گے۔ تمھیں چھلی نہیں بیچنا پڑے گی۔ ."میں نے اس کی ہمت بندھائی اور ایک خواب اس کی

آنکھوں کے حوالے کیا۔ باقی لوگ اس سے ہنسی مذاق کرنے لگے ۔ کسی نے اس سے دہاڑی کا پوچھا کہ وہ کتنا کما لیتا ہے؟ تو کسی نے اس سے ازراہِ مذاق کہا کہ اچھا کیا جو پڑھائی چھوڑ کر کمائی کرنے لگے ۔ جن میں سے اس نے کسی کی بات کا جواب دیا تو کسی کا نہیں ۔اس کی آنکھوں میں ایک حسرت پیوست تھی ۔ اتنی دیر میں جو لوگ نماز ادا کرنے مسجد میں گئے تھے وہ واپس آ گئے اور ہم اپنی منزل کی جانب گامزن ہو گئے ۔اس واقع کو گزرے نہ جانے کتنے دن ہو گئے ہیں لیکن اس بچے کی حسرت زدہ آنکھوں نے میرے دل و دماغ پر انمٹ نقوش چھوڑے ۔

یہ بچہ بیہ اس معاشرے کے لاکھوں بچوں کا نمائندہ تھا۔ ہمارے معاشرے میں بستے نہ جانے کتنے ہی بچے جو رزق حاصل کرنے کے لیے کام کرتے ہیں ان سب کی طرح اداس، اور بے بس دکھتا تھا۔ جن کی آنکھوں میں خواب تو ہیں،ان خوابوں کی تعبیر حاصل کرنے کی ہمت اور لگن بھی ہے لیکن ان کے پاس وہ ذرائع نہیں جو انھیں اپنی منزلوں تک پہنچا سکیں۔ یہ واقع نہ چاہتے ہوئے بھی میرے ذہن پر نہ جانے کتنے ہی روز ثبت رہا ۔

میں سوچتی رہی کہ کیا ایک باپ کی یہی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی اولاد کو بے یار و مددگار چھوڑ کر جہاد پر چلا جائے ۔ ؟ نہیں ۔ ہر گز نہیں ۔ قرون اولیٰ میں بھی اگر کوئی جہاد کے لیے سفر کرتا تھا تو ریاست اس کے خاندان کا نان

نفقہ پورا کرنے کی ذمہ دار تھی۔ ایک حدیث شریف میں ارشادِ نبوی ہے۔

رسول نے فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے کے پیچھے اس کے " گھر کی عمدہ طور پر خبر گیری کرے تو گویا اس نے خود جہاد کیا" ۔ صحیح بخاری جلد دوئم۔ صفحہ 142

یہ واضح رہے کہ یہ احکام اس جہاد کے لیے ہیں جو ایک مملکت کی سرحدوں کی حفاظت اور دینِ اسلام کی سربلندی کے لیے کیا جائے لیکن آج کل جہاد کی صورت ہی بدل دی گئی ہے۔ ملک میں جابجا جہادی تنظیموں کا قیام عمل میں آچکا ہے جن کا ریاستی اداروں سے کوئی تعلق نہیں ۔ کتنے ہی لوگ ریاست سے بالاتر ہو کر جہاد کی خاطر ان تنظیموں میں شمولیت اختیار کرتے ہیں ۔ یہ لوگ اپنی اولاد کو اور گھر بار کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور بعد میں ان کی کوئی خیر خبر نہیں آتی ۔ ان سادہ لوح لوگوں کو جہادی تنظیموں کے مقاصد تک کا علم نہیں ہوتا ۔ یہ لوگ ان نام نہاد جہادی تنظیموں کے آلۂ کار کی صورت میں ریاستی اداروں کے لیے بدترین خطرہ بن جاتے ہیں۔ خود کش بمبار بن کر بے گناہوں کی جان لیتے ہیں اور ملک میں دہشت گردی پھیلاتے ہیں ۔ بعض اوقات ایسے لوگوں کو اکثر و بیشتر منہ مانگے معاوضے کی لالچ بھی دی جاتی ہے ۔ وجہ کوئی بھی ہو، اپنے پیچھے چھوڑ جانے والے خاندان کے لیے یہ لوگ کچھ نہیں کر پاتے ۔ ان کے

خاندان، بیوی بچے، ماں باپ بے یارومددگار اپنی زندگی کسرِ نفسی سے گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کے وہ بچے جن کے ہاتھوں میں پن، پنسل ہونی چاہیے ان کے ہاتھ مکئی کے بھٹے تیار کر رہے ہوتے ہیں یا پھر انٹیں ڈھو کر اپنے خاندان کی روزی روٹی کا انتظام کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ یہ کیسا جہاد ہے؟ کہ آپ کے بچے یوں دربدر کی ٹوکریں کھائیں، تعلیم سے محروم رہیں اور ان بچوں کا کیا قصور ہے کہ زمانے بھر کی محرومیاں ان کی جھولی میں آئیں۔

جہاد کا آج کل جو طریقہ کار ہے وہ اپنانے سے پہلے جہاد کی فرضیت اور مقصدیت کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ جہاد کا اولین مقصد اللہ کے دین کی سربلندی، اللہ کے دین کو قائم کرنا، اسلام کا پیغام عام کرنا، ملکی سرحدوں کی حفاظت کی خاطر کفار سے جنگ کرنا جہاد میں شامل ہے۔ مسلمانوں ہی کے خلاف کاروائیاں کرنا اور اسلامی ریاست کو معاشی اور معاشرتی نقصان پہنچانا جہاد نہیں ہو سکتا۔ لیکن جہاد کا نام استعمال کرکے اپنی اولاد اور ماں باپ کو بے یارومددگار چھوڑ کر کسی ایک تنظیم جو کہ ریاست کا ادارہ بھی نہ ہو بلکہ الٹا ریاست کے خلاف کام کرنے میں مصروف اس میں شامل ہو جانا کسی طور بھی جائز نہیں ہے۔ یہ نام نہاد تنظیمیں جہاد کا نام استعمال کرکے بے گناہ مسلمانوں کو بم دھماکوں کا شکار کر دیتے ہیں، مسجدوں اور سکولوں کو تباہ کر دیتے

ہیں یہ سراسر غلط اور دین کے منافی فعل ہے کیونکہ اس دہشت گردی کی وجہ سے دینِ اسلام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا بلکہ الٹا مسلمانوں اور اسلام کی بدنامی ہوئی ہے۔ جن کاروائیوں سے ایک اسلامی مملکت کمزور ہو جائے، ملک کی سلامتی داؤ پر لگ جائے اس کی نہ تو اسلام اجازت دیتا ہے اور نہ ہی معاشرتی طور پر کسی صورت یہ کاروائیاں قابلِ قبول نہیں ہیں۔

ایک خط۔۔۔۔۔۔

اپنے دادا کی وفات کے بعد الماری میں پڑے ان کے پرانے کاغذات کی جانچ پڑتال کے دوران میری نظر ایک بوسیدہ کاغذ پر پڑی جسے ایک فائل میں رکھا گیا تھا۔ یہ کاغذ درحقیقت ایک خط تھا جو شاید ایک صدی پرانا ہے جس پر کالی روشنائی سے خطاطی کی صورت الفاظ جڑئے نظر آتے ہیں۔ یہ خط میرے دادا کے لیے ان کے والد نے لکھا تھا اور میرے دادا نے کسی خزانے کی صورت اسے نہایت احتیاط سنبھال کے رکھا تھا۔

جس کا متن کچھ یوں ہے

" تحقیق ! نصیحت نفع ہے۔ایمان والوں کے واسطے۔ تم بے شک نماز پڑھنے میں سستی کرتے اور وقت بھی عین نہیں ہوتا۔ عزیز ! یہ غلطی ہے۔ جس طرح نوکری میں بھرتی اور ہوشیاری کرتے ہو، دوڑ دیکھاتے ہو اس سے بھی چند درجہ زیادہ اپنے خداوند کریم، اپنے معبودِ حقیقی اور بادشاہِ غالب کے حکم کی فرماں برداری کیا کرو۔اپنے بادشاہِ حقیقی کی رضامندی، طاعت کا خیال رکھا کرو جیسے ڈیوٹی پر جانے میں دیری ہو جاتی ہے تو سپاہی دوڑتا ہے، بھاگ کر جاتا ہے، اسی طرح خداوند کریم کی ڈیوٹی بھی دوڑ کر پوری کرنی چاہیے عین وقت پر۔ میں عربی اچھی طرح نہیں لکھ سکتا۔ ماعون میں خداوند کریم فرماتا افسوس ان

نمازیوں پر جو اپنی نماز میں سستی سے ادا کرتے ہیں۔ ایک اور آیات ہے، جو انسان خداوند کریم کی ذات سے ذرا دور ہو جاتا ہے تو تھوڑا خدا کی ذات دور ہو جاتی ہے۔ جو بہت دور ہو کر فرماں.برداری سے غافل ہو جاتا ہے تو خداوند کریم اس شخص کو کوسوں کے فاصلے پر چھوڑ دیتا ہے۔اس سے اسی وقت رزق یا تنگ دستی یا کوئی اور شئے نہیں چھین لیتا، صرف اپنی رحمت سے دور کر دیتا ہے۔ شیطان کی تابعداری کرنے سے اس کو زیادہ عیش و عشرت مہیا کر دیتا ہے۔ جس سے وہ انسان گمراہ ہو کر یہ بولتا ہے کہ نمازیوں نے گھٹنے توڑ کر کیا وصول کیا، بھوکے مرتے ہیں اور کئی نعمتوں سے، خداوند "سے دور ہیں، ہر گز نہیں۔

سیاہ روشنائی اور قلم سے لکھا گیا یہ خط جس کا صفحہ بھی نہایت بوسیدہ ہو چکا ہے جو کہ ہاتھ لگانے سے بھی بھرنے لگتا تھا، سیاہی کہیں کہیں سے مٹ چکی ہے اور الفاظ بہت مشکل سے پڑھے جاتے ہیں۔ یہ خط کم و بیش ایک صدی پرانا ہے۔ اور اس وقت مسلمانوں کے حالات آج کی نسبت بہت بہتر تھے۔ لیکن لوگوں کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس تھا۔

جب یہ خط میری نظر سے گزرا تو میرے اندر جیسے خطرے کی گھنٹی بجا گیا اور نہ جانے میرے ذہن میں کون کون سے خیالات آنے لگے میں نے سوچا کہ کیا آج ہم بھی خدا سے دور نہیں ؟؟؟ کیا خداوند نے ہم سے بھی اپنی رحمت کو دور نہیں کر دیا۔ ہمارے

معاشرے میں پھیلتی ہوئی بے راہ روی اور جابجا مصائب اس بات کا منہ بولتا ثبوتہیں
کہ آج ہمارا رب ہم سے بہتناراضہے اور اس نے اپنی رحمت کو ہمارے معاشرے سے
دور کر دیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں لوگوں کے عمومی خیالات بھی کچھ اسی طرح کے
ہوتے جارہے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی نمازپڑھنے والوں کو اسی طرح مذاق کانشانہ بنایا
جاتا ہے اور بے نماز مسلمان نمازپڑھنے والوں کو اسی طرح کے طعنے دیتے ہوئے
نظر آتے ہیں۔ لوگ مذہب پر چلنے والوں کا مذاق اڑاتے اور عموما انھیں تنگ کرتے
ہیں ۔اس کے ساتھ ساتھ قرآن و سنت کی پیروی کرنے والوں کو دقیانوسی، قدیم اور
ٹیکنالوجی سے بے بہرہ قرار دیا جاتا ہے۔ سورت لقمان میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے
اور جب لقمان نے اپنے بیٹے سے کہااور وہ اسے نصیحت کرتا تھا۔اے میرے بیٹے ! اللہ
کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا یقینا یہ بڑا بھاری جرم ہے ۔آیت نمبر13
اے میرے بیٹے ! نماز قائم کر اور نیکی کا حکم دے اور برائی سے روک اور جو تکیف تجھے
پہنچے اس پر صبر جر کہ یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے اور لوگون سے بے رخی نہ کر اور
نہ زمین پر اکڑتا ہوا چل ۔اللہ کسی خود پسند، شیخی خور کو پسند نہیں کرتا۔آیت نمبر
17,18

ان آیات سے ثابت ہوا کہ نصیحت ہر زمانے اور ہر وقت کی ضرورت ہےاور باپ
کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ اپنی ولاد کو سیدھے راستے پر چلانے کے لیےہر قدم

پر راہنمائی کرے۔ کیونکہ باپ ہی وہ ہستی ہے جو کہ اولاد کے عمومی رویے کا ذمہ دار ہے اور وہی اولاد کو معاشرے کا بہترین شہری بننے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

ہمارے معاشرے کے اس زوال کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ماڈرن نظر آنے اور خود کو دقیانوسی کہلوانے سے بچنے کے لیے لوگ دین کی پیروی کو جان بوجھ کر چھوڑ رہے ہیں ۔یہاں تک کہ تعلیم کو بھی ماڈرن ازم کا شکار کر دیا گیا ہے۔پڑھے لکھے نظر آنے کے لیے مغربی تہذیب کو اپنایا جانے لگا ہے اس سوچ کی وجہ سے عملا مسلمان مسلمان نہیں رہے اور معاشرہ دن بدن اخلاقی تنزلی کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔

ہمارے یہاں باپ نے خود کو صرف اور صرف پیسہ کمانے اور اولاد کو نئی سے نئی ٹیکنالوجی اور سہولت دینے تک محدود کر لیا ہے۔ باپ اولاد کو ہر طرح کی سہولت فراہم کرنے کے لیے دولت کمانے میں جائز اور ناجائز میں تفریق نہیں کرتے اور نہ ہی اولاد کی تربیت کی ان کو کسی قسم کی کوئی فکر رہتی ہے ۔اپنی ذمہ دوری سے بے بہرہ آج کا باپ اولاد کی تربیت کو ماں پر چھوڑ کر خود بری الذمہ ہو جاتا ہے ۔اس کے ساتھ ساتھ تربیت کو صرف اور صرف ماں کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔ سونے پر سوہاگہ تو یہ کہ باپ تو باپ آج کل کی ماڈرن ماں کے پا

س بھی اپنے بچوں کے لیے کوئی وقت نہیں۔کیا آج کل کوئی باپ اپنی اولاد کو اس طرح کا سبق دیتا ہے ؟ نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل اسلام مسلمانوں میں سے ناپید ہوتا جارہا ہے ۔آج کل کے باپ اپنی اولاد کو دنیاداری اور پیسہ کمانے کا ذرائع تو ضرور سکھاتے ہیں لیکن دین کی پیروی کرنے والے کو پینڈو اور نہ جانے کیا کیا خطاب دیتے ہیں ۔ بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ باپ بچوں کے سامنے غلط عادات جیسے جھوٹ بولنا، سگرٹ پیناوغیرہ سے نہیں چوکتے ۔ بچے والدین کو جو کچھ کرتا دیکھتے ہیں ان کے ننھے ذہنوں میں وہی کچھ ثبت ہو جاتا اور بڑے ہو کر یہی عادتیں پختہ ہوتے ہوتے فطرتِ ثانیہ بن جاتے ہیں ۔ پھر انھیں برا بھلا کہا جاتا ہے اور سرزنش کی جاتی ہے ۔

کہاجاتا ہے آپ کی اولاد وہی سیکھتی ہے جو آپ کہتے یا کرتے ہیں ۔

معاشرے میں ایک عام سوچ یہ ہے کہ اولاد کی تربیت ماں کرتی ہے مانا کہ اولاد کی تربیت میں ماں کا کردار باپ کی نسبت زیادہ ہوتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ باپ اس ذمہ داری سے مبرا ہے ۔اولاد کی تربیت میں ماں کے ساتھ ساتھ باپ کا بھی حصہ ہے بلکہ اگر دیکھا جائے تواولاد کی تربیت میں ماں اور باپ دونوں کا برابر حصہ ہے ۔ باپ بھی اولاد کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ ماں ۔ باپ کا شفقت بھرا ہاتھ اس کی راہنمائی کی اولاد کو ہر لمحے میں ضرورت رہتی ہے ۔اگر اولاد سے کہیں کوئی، کوتاہی ہو جائے تو سرزنش کے ساتھ

ساتھ باپ کی راہنمائی انہیں بڑے بڑے مصائب سے بچائے رکھتی ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر کوئی اپنی ذمہ داری سے آگاہ ہو۔اپنی ذمہ داری کو سمجھے اور اپنی ذمہ داری کو احسن طریقے سے نبھانے کی کوشش کرے۔

16دسمبر: یومِ سقوطِ ڈھاکہ

16دسمبر دنیا کے نقشہ پر بنگلہ دیش کی بنیاد رکھی گئی۔ اس روز سقوطِ ڈھاکہ کا دلخراش واقع رونما ہوا اور تاریخ نے ایک عظیم اسلامی مملکت کو دولخت ہوتے دیکھا۔ اگرچہ 1971, مارچ 23 کو یومِ پاکستان کے موقع پر علیحدگی پسندوں نے بنگال میں ہر جگہ بنگلہ دیش کا پرچم لہرایا اور اس کے بعد غیر بنگالیوں پر تشدد میں بے پناہ اضافہ کر دیا گیا

۔

تاریخ گواہ ہے کہ سقوطِ ڈھاکہ کیسے پناہ وجوہات میں ایک بہت.بڑی وجہ بھارت کی منظم دراندازیاں بھی تھیں۔ بھارت نے پاکستان کی بنیاروں کی کھدائی کا کام آزادی کے پہلے دن سے شروع کر دیا تھا۔ بھارت پہلے دن سے ہی پاکستان کو دولخت کرنے کے درپے رہا۔ اندرا گاندھی جو اس وقت بھارت کی وزیر اعظم تھیں انھوں نے اس سارے منصوبے کو دو قومی نظریہ کے ڈبو دینے کا نام دیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اندرا گاندھی نے اپنی خفیہ اجنسیوں کے ذریعے بنگلہ دیش بنانے اور پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی تھی۔ سبرامینعم (دانشور) کو سپین بھیجا۔ جہاں اس نے اندلس میں مسلمانوں کی ہزار سالہ حکومت کے بعد جلا وطنی کے اسباب پر غور کیا اور ان تجربات کی

روشنی مین اس نے ایک مقالہ لکھا۔ اس تمام تحقیق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بھارت نے باقاعدہ سازش کے تحت پاک فوج کے خلاف زہریلا پروپگنڈا کیا اور مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والوں کو مظالم کا نشانہ بنایا گیا۔ یہاں تک کہ مکملبغاوت کے لیے مکتی باہنی کو سامانِ حرب اور باقاعدہ فوجی تربیت دی اس کے ساتھ ساتھ بھارت نے اپنی خفیہ ایجنسیوں کے ایجنٹ مکتی باہنی کی مدد کی آڑ میں مشرقی پاکستان میں بھیجے جنھوں نے پاک فوج اور مغربی پاکستان کے خلاف نہ صرف زہریلا پراپگیڈا کیا بلکہ پاک فوج کو بدنام کرنے کے لیے پاک فوج کی وردی استعمال کرکے لوگوں پر مظالم ڈھائے تاکہ مشرقی پاکستان کے لوگ اپنے ہی بھائیوں کو اپنا دشمن سمجھنے لگیں۔

سقوطِ ڈھاکہ کی دوسری بڑی وجہ مغربی پاکستان کے حکمران بھی تھے۔ جنھوں نے ہمیشہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کو حقیر نظر سے دیکھا اور ان کے حقوق کو پامال کیا۔ ان کا جائز حق بھی انھیں نہیں دیا گیا۔ جس کی وجہسے اس علاقے کے لوگوں میں احساسِ محرومی بڑھتا گیا اور جب مضیب الرحمٰن نے علمِ بغاوت بلند کیا تو وہاں کے لوگ باخوشی اس کا ساتھ دینے پر رضامند ہو گئے۔ قدرت اللہ شہاب اپنی کتاب شہاب نامہ (صفحہ نمبر 309) میں لکھتے ہیں۔

اعلیٰ سطح کی ایک میٹنگ میں سینٹری کے سامان کی درآمد کا مسئلہ زیرِ بحث تھا تو مولوی فضل الرحمٰن نے تجویز دی کہ درآمد شدہ سامان کا کچھ حصہ

ڈھاکہ کے لیے بھی مخصوص کیا جائے۔ اس تجویز پر ہنسی اڑائی گئی پھبتی کسنے والوں نے یہاں تک کہا کہ بنگالی لوگ تو کیلے کے گاچھ کی اوٹ میں بیٹھ کر رفع حاجت کرنے کے عادی ہیں وہ ابھی سے کموڈ اور واش بیسن کا کیا کریں گے۔ بھر کچھ طنز و مزاح اور بحث و مباحثہ کے بعد مولوی فضل الرحمٰن کی بات مان لی گئی۔ لیکن ایسی بدمزگی کے ساتھ جس طرح دودھ میں مینگنیاں ڈال کر پیش کیا جاتا ہے۔ بقول شہاب صاحب لاشعوری طور پر بنگلہ دیش کی بنیادوں کی کھدائی کا کام اسی روز شروع ہو گیا تھا۔

متحدہ پاکستان کی سب سے بڑی برآمد پٹ سن تھی جبکہ مشرقی پاکستان کو گندم مغربی پاکستان فراہم کرتا تھا۔ ایوب خان کے دور میں مشرقی پاکستان میں بھی بے انتہا ترقیاتی کام کرائے گئے اس کے باوجود جب مجیب الرحمٰن نے مغربی پاکستان کا دورہ کیا تو اس نے یہاں کی مٹی اٹھائی اور کہا کہ مجھے اس مٹی سے پٹ سن کی بو آتی ہے۔

تمام افواج میں شمولیت کو بنگال کے رہنے والوں کے لیے تقریبا ممنوع کر دیا گیا۔ چونکہ بنگال کے رہنے والے کوتاہ قد ہیں اور فوج کی نوکری کے لیے قد اور وزن کے جو معیار بنائے گئے یہ لوگ کسی صورت اس پر پورا نہیں اتر سکتے تھے۔ اس طرح ان نوجوانوں کے دلوں میں مغربی پاکستان کے خلاف جذبات پنپنے

لگے۔ مغربی پاکستان کیحکمرانوں نے اپنے رویے اور معاشرتی ناانصافی سے بنگال کو بنگلہ دیش بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

اقتدار پر قابض یحیٰ خان کی چند انتظامی غلطیوں نے سونے پر سوہاگہ کا کام کیا۔ ان کا ون یونٹ کو توڑنا، نئے سیٹ اپ میں الکشن کرانا اور اس کے بعد بھی صدارت کی کرسی نہ چھوڑنا ان کی فاش ترین غلطی تھی۔ اور اس نے تابوت میں آخری کیل کا کام کیا۔ اس کے بعد سیاسی غلطیوں کا ایسا نیا کھیل شروع ہوا جس نے مجیب الرحمٰن کو مظلوم بننے کا موقع دیا۔ شیخ مجیب کا مظلوم بننااور آرمی کا فوری ایکشن، جس نے وہاں کے لوگوں میں مزید بے چینی پھیلائی، مکتی باہنی اور بھارت کی طرف سے جنگ کا اعلان سقوطِ ڈھاکہ کا سبب بنے۔ یہ تو صرف چند ایک واقعات ہیں۔ ایسے کئی واقعات نے مغربی اور مشرقی پاکستان کے عوام کے دلوں میں ایک دوسرے کیے لیے نفرتیں ڈالی اور بہت سی غلط فہمیوں نے بھی جنم لیا۔ جن میں بھارت کا کردار اہم رہا۔جب مشرقی پاکستان میں ایمرجنسی لگائی گئی اس کے تحت بھی بنگالیوں میں کچھ عناصر نے بہت بے چینی پھیلائی۔ جس کا فاعدہ اٹھاتے ہوئے آزادی کی آڑ میں بھارت نے اپنی فوج مشرقی پاکستان میں داخل کردی۔ اسی وقت بھارت نے کئی ایک محاذوں پر جنگ چھیڑ دی۔

ان سیاسی غلطیوں کے ساتھ ساتھ کئی انتظامی غلطیوں کا ذکر کرنا بھی بے حد ضروری ہے ۔مغربی پاکستان کے اقتدار پر قابض لوگوں نے کبھی مشرقی پاکستان میں بڑھتی ہوئی بغاوت کو سنفصیدگی سے نہیں لیا تھا اور نہ ہی کو اس سلسلے میں کوئی سنجیدہ اقدامات کئے گئے تھے ۔ مشرقی پاکستان میں پاکستان آرمی کی صرف 3 یونٹ تعینات کی گئی تھی ۔جبکہ ہندوستان نے جدید سامانِ حرب سے لیس 7 ڈویژن تعینات کر رکھی تھی۔ اتنی کم فوج بھی اتنی زیادہ فوج سے اس طرح مقابلہ کرنے کے قابل نہ تھی۔

سقوطِ ڈھاکہ مسلمان دنیا کے لیے ایک عظیم سانحہ تھا جس کے ذمہ دار پولیٹیکل انتظامیہ اور فوج برابر کے شریک رہے تھے ۔یہ سانحہ ایک دم سے پیش نہیں آیا تھا بلکہ اس کے اسباب کئی برس سے رونما ہونے والے واقعات اور بھارت جیسا عیار دشمن تھا۔

المیہ در المیہ یہ ہے کہ ہمارے حکمرانوں اور سیاست دانوں نے اس سانحہ سے کچھ نہیں سیکھا۔آج بلوچستان کے حقوق کو بھی اسی طرح فراموش کر دیا گیا جس طرح ماضی میں ڈھاکہ کو کیا گیا۔ بلوچستان کے لوگوں کا بھی احساسِ محرومی دن بدن اسی طرح بڑھتا جا رہا ہے جیسے ڈھاکہ کے لوگوں کا بڑھ چکا تھا۔ بلوچستان لبرل آرمی کا قیام بالکل مکتی باہنی کی طرز پر عمل میں آ چکا ہے۔وقت کا

تقاضا ہے کہ ماضی میں کی گئی غلطیوں سے سبق سیکھیں اور ہر صوبے کے لیے کام کیا جائے۔ حکمرانوں کو اپنی ذات سے بڑھ کر ملکی مفاد کے لیے کام کیا جائے۔ سیاست دانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے عہدوں کی نزاکت کو سمجھیں اور ذمہ داری کا مظاہرہ کریں۔ ملکی مفاد کو اہمیت دیں اور صوبوں میں بڑھتے ہوئے احساسِ محرومی کو ختم کرنے کے لیے عملی اقدامات کرنا ضروری ہیں۔

اور جب پشاور کے پھول خون میں نہلا دیئے گئے

ملک میں پھیلی دہشت گردی کے آسیب نے پھر سے اپنے پر پھیلا دیئے ہیں۔ آرمی کے آپریشن ضربِ عصب کی وجہ سے ملک میں دہشت گردوں کا بڑی حد تک صفایا کر دیا گیا ہے لیکن بہت سے دہشت گرد گروہ ایک بار پھر سے متحرک ہو گئے ہیں۔ پورا ملک ایک عرصے سے دہشت گردی کی کاروائیوں کا ہدف رہا ہے۔ صوبہ خیبر پختونخواہ میں خاص طور پر پشاور میں امن و امان کی صورت حال بہتر ہونے کی بجائے ابتر ہوتی جا رہی ہے۔ پے در پے دھماکوں نے اس شہر کی رونقیں چھین لی ہیں اس شہر میں کوئی گلی کوئی کوچہ، مسجد، چرچ ان دہشت گردوں سے محفوظ نہیں رہا لیکن اب ان دہشت گردوں کا نشانہ پشاور کے اے۔ پی۔ ایس سکول کے ننھے بچے تھے۔

آج سے کئی برس پہلے 16 دسمبر ہی کے روز پاکستان نے دولخت ہونے کے سانحہ کا سامنا کیا تھا اور اسی دن پشاور میں قیامتِ صغریٰ برپا کر دی گئی۔ تب بھی پاکستان لہو لہو تھا، اب بھی پاکستان کی سرزمین خون سے تر ہے۔ پشاور جو پھولوں کا شہر کہلاتا ہے اس میں پھولوں کے جنازے اٹھائے گئے۔ وہ معصوم پھول جن کی عمریں تین سے سات سال کے درمیان تھیں سفید یونیفارم کی بجائے سفید کفن میں لپٹائے گئے۔ جو صبح کو مکتب گئے تھے لیکن شام مرقد میں گزارین

گے۔ ان والدین کے دکھ کا اندازہ لگانا مشکل نہیں جو اپنے ہی بچوں کے لاشے اٹھائے اور انھیں مٹی تلے دفناتے رہے۔ منظم اور تربیت یافتہ افراد پر مشتمل لوگوں کے ایک گروہ نے پشاور کے اے۔پی ایس سکول پر یہ بزدانہ حملہ کیا۔ حملہ آور سکول کی عقبی دیوار پھلانگ کر سکول میں داخل ہوئے۔ان میں سے دو نے خود کو خودکش دھماکہ سے اڑا لیا جبکہ باقیوں نے بلا اشتعال فائرنگ کرکے کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ عینی شاہدوں کے مطابق حملہ آوار انگریزی اور عربی زبان بول رہے تھے۔ جو کہ اس بات کا واضع ثبوت ہے کہ اس حملے میں بیرونی ہاتھ ملوث ہے اور یہ غیر ملکی عناصر پاک فوج اور پاکستانی عوام کے حوصلے پست کرنا چاہتے ہیں۔ پاک فوج اور سیکیورٹی اداروں کی بروقت کاروائی نے 960 بچوں اور طلباء کی جان بچالی، ان دہشت گردوں کو گرفتار اور سات کو جہنم واصل بھیکیا۔اس حملے میں ہونے والی کل اموات کی تعداد 141 ہے جن میں شہید ہونے والے بچوں کی تعداد ہے 132۔ سکول کی پرنسپل جو بچوں کو بچانا چاہتی تھی جنھوں نے اپنی جان کی پرواکیے بغیر بچوں کو اس عفریت خانے سے باہر نکالنے کی۔ کوشش کی ،انھیں زندہ جلا دیا گیا۔اندازہ کیجئے کہ جن بچوں نے اپنے سکول کی پرنسپل کو زندہ جلتے دیکھا ہوگا یا اپنے ساتھیوں کو خون میں لت پت دیکھا ہوگا ان کی نفسیاتی حالت کس قدر بری ہوگی۔نہ جانے کتنے ہی بچے صدمے سے بے ہوش ہوگئے۔ جو اس حادثہ میں ہلاک ہونے سے بچ گئے وہ بچے نہ جانے کتنا عرصہ اس خوف کا شکار رہیں گے اور نہ جانے کتنے نفسیاتی مسائل

کا شکار ہوں گے۔ تحریک طالبان پاکستان نے اس کاروائی کی ذمہ داری قبول کر لی ہے ۔ان کا کہنا ہے کہ وہ فوج کو یہ دیکھانا چاہتے ہیں کہ وہ کس درد اور کس کرب سے گزر رہے ہیں ۔اور یہ کاروائی انھوں نے آپریشن ضربِ عصب اور خیبرون کے جواب میں کی ۔ یہ بزدلانہ کاروائی ان معصوم پھولوں کے خلاف کی گئ جن کو ابھی تک اچھے اور برے کی تمیز تک نہیں ۔ جن کی زندگیوں کا محور کتابوں سے شروع ہو کر سکول کے گراونڈ تک محدود ہے ۔جو نہ تو کسی کے ساتھ جنگ کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی کے حق میں بات کر سکتے ہیں۔جو کہ نہ جانے کتنے ہی خواب لیے اپنے مکتب میں آئے تھے ۔ جو اپنے والدین کی امیدوں کا محور تھے ۔ یہ ایک سفاکانہ کاروائی ہے اور کاروائی کرنے والوں کی بربریت اور سفاکیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ طالبان کے ترجمان محمد خراسانی نے اس فعل کو اسلام کے مطابق قرار دینے کی کوشش کرتے ہوئےکہا ہے کہ مجاہدین کو ہدایات دی گئ تھی کہ وہ صرف بڑے بچوں کا قتال کریں ۔ پشاور کی کاروائی نعاّ عوذ بلاللہ) سنتِ نبوی ﷺ کے عین مطابق ہے ۔)

ان صاحب سے میری گزارش ہے کہ تاریخ اسلام کا مطالعہ کریں ۔فتح مکہ کا واقع پڑھیں ۔تاریخِ انسانی گواہ ہے کہ جب مسلمان فاتح کی حیثیت سے شہر میں داخل ہوئے تو کوئی قتل و غارت نہیں کی گئ بلکہ مفتوح قوم کو عام معافی دی گئ ۔ کسی جنگ میں معصوم بچوں کو نشانہ نہیں بنایا گیا ۔ نبی پاک ﷺ کی حیات

مبارکہ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام کی زندگیوں کو دیکھ لیجیے کسی بھی جنگ میں بچوں کے ساتھ کبھی کوئی ظالمانہ سلوک نہیں کیا گیا۔ نبی پاک ﷺ اور آپ کے خلفاء جب لشکروں کو جنگ کے لیے روانہ کرتے تو نصیحت فرماتے کہ کافروں کے بچوں کو نہ مارنا، ان کی خواتین کو کچھ نہ کہنا، ان کے پھل دار درختوں کو نہ کاٹنا۔

اسلام تو اس قدر امن و سلامتی کا دین ہے کہ جنگ میں پھل دار درختوں کو کاٹنے، کافروں کی عورتوں کی حفاظت، کافروں کے بچوں کے قتال کو روکتا ہے اور ان کی حفاظت کا حکم دیتا ہے تو یہ طالبان کون سے اسلام کا پرچار کر رہے ہیں۔ کس اسلام کے تحت اس قسم کی بہیمانہ کاروائیاں کر رہے ہیں۔ یہ درحقیقت ظالم درندے ہیں جو خود کو اسلام کا داعی کہتے ہیں اور علم کے گہوارے میں مسلمانوں کے بچوں کو شہید کر رہے ہیں۔ یہ مسلمان تو کیا انسان کہلانے کے بھی لائق نہیں۔

16 دسمبر کے بعد پورا ملک غم و غصہ اور اداسی میں ڈوب گیا۔ ملک کے طول و عرض میں شہید ہونے والے بچوں کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھائی گئی، شمعیں روشن کی گئی دعائیہ محافل کا انعقاد کیا گیا۔ تمام مارکیٹیں، بازار اور تعلیمی ادارے بند رہے۔ اور، ملک میں تین روزہ سوگ کا اعلان کیا گیا۔ وزیرِ اعظم نے اس واقع کی مذمت کی ہے اور چھ وزراء کے وفد کے ساتھ اپنی تمام

مصروفیات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پشاور میں گورنر ہاؤس پہنچے۔ تمام سیاسی جماعتوں کو اجلاس میں شرکت کی دعوت دی ہے۔ تحریک انصاف کے چیرمین عمران خان نے ان بچوں اور ان کے والدین سے اظہار یک جہتی کا ثبوت دیتے ہوئے احتجاج کو ملتوی کر دیا ہے۔ عمران خان کا اس میں شرکت اور اجتجاج کو ملتوی کر دینے کا اعلان ایک قابلِ تحسین عمل ہے جس سے ان کی سیاسی بصیرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ بچوں کے سکول پر حملہ سفاکانہ عمل ہے۔اور ان بچوں کے ساتھ یکجہتی کے اظہار کے طور پر انھوں نے دھرنہ ختم کرنے کا اعلان کیا ہے۔ ملک دشمن عناصر کو یہ جان لینا چاہیے کہ پاکستانی قوم چاہے کتنے ہی اختلافات کیوں نہ رکھتے ہوں مشکل کی اس گھڑی میں یک جان ہیں۔ سکیورٹی فورسز نے اس واقع کا سنجیدگی سے نوٹس لیا ہے۔ آرمی چیف جنرل راحیل شریف اور ڈی جی آئی ایس آئی نے افغانستان کا دورہ کیا ہے اور افغانستان سے اپنے تحفظات سے آگاہ کیا ہے۔ عالمی برادری نے بھی اس واقعہ کی مذمت کی ہے۔

سانحہ پشاور نے مسلمانوں اور خصوصا پاکستانیوں کے دلوں کو دہلا دیا ہے۔ یہ واقع ظلم و بربریت ، وحشت اور بے حسی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔زمین ان کھلی کلیوں کے خون سے نہا کر پھر سے سرخ ہو گئی ،آسمان خون کے آنسو روتا رہا، ماوؤں کے کلیجے پھٹ گئے۔ کوئی تو پوچھے ان معصوموں کا قصور کیا تھا۔ یہ

کس کا گریبان پکڑیں۔ سیکیورٹی فورسز کو ان کے خلاف سخت سے سخت کاروائی کرنی چاہیے تاکہ کبھی کسی اور کو ہمارے بچوں کے خلاف اس طرح کی کاروائی کی جرات نہ رہے۔

کوئی مسیحا ادھر بھی دیکھے ، کوئی تو چارہ گری کو اترے
افق کا چہرہ لہو میں تر ہے ، زمین جنازہ بنی ہوئی ہے

سیرتِ رسولِ ہاشمی ﷺ اور آج کا مسلمان

ربیع اول کے بابرکت اور مبارک مہینہ کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس بابرکت مہینے کے آغاز کے ساتھ ہی پوری دنیا اور بالخصوص پاکستان میں محافلِ عید میلاد النبی ﷺ کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ تمام دنیا کے مسلمان نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ولادت با سعادت کی خوشیاں مناتے ہیں۔ ملک کے طول و عرض کو برقی قمقموں سے سجایا جاتا ہے اور میلاد کی محافل منعقد کی جاتی ہیں۔۔ ربیع اول کی آمد جہاں ہمیں خوشیوں سے نوازتی ہے وہاں اس مہینے کی آمد اپنے ساتھ امن و آشتی، رحمت و برکت اور محبت، کا ایک عالمگیر پیغام بھی لاتی ہے۔ اسلام ایک انسان اور بالخصوص مسلمان سے جس رویہ یا کردار کی توقع کرتا ہے اس کے لیے قرآن پاک میں واضع تعلیمات فراہم کر دی ہیں اور ان تعلیمات کی عملی تفسیر نبی پاک ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کی صورت میں موجود ہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا " بے شک تمھارے لیے نبی پاک ﷺ کی سیرت اسوۃ حسنۂ ہے "حضرت عائشہ سے جب پوچھا گیا کہ حضورِ پاک ﷺ کے اخلاق کیسے تھے ؟۔ تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کی ! اتم نے قرآن نہیں پڑھا؟ گویا آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ درحقیقت قرآن کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ وہ رحمتِ عالم ،

محبت کا درس دینے والے ، امن کا پیغام دینے والے ،بڑوں کے ساتھ صلہ رحمی کرنے والے اور بچوں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرنے والے ۔ بہترین سپہ سالار ، بہترین حکمران ۔اگر کوئی باپ ہے تو حضرت فاطمہؓ کے باپ کی پیروی کرے ،اگر کوئی بیٹا ہے تو اس بیٹے کو دیکھے جو اپنی والدہ ماجدہ کی قبر تک کے سامنے سر جھکا کے بیٹھے ۔ اگر کوئی شوہر ہے تو حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہؓ کے شوہر کو دیکھے ۔اگر کوئی ہمسایہ ہے تو اس ہمسائے کو دیکھے جو آپ ﷺ کے اوپر کوڑا پھینکتی اور جواب میں اس کی تیمارداری کرتے ۔اگر کوئی حکمران ہے تو مدینہ منورہ کے حکمران کو دیکھے جنھوں نے عملاً ایک فلاحی ریاست کی نہ صرف بنیاد رکھی بلکہ حکمران کی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے نبھانے کا سلیقہ بھی سکھایا ۔اگر کوئی سپہ سالار ہے تو غزوہ بدر و حنین کے سپہ سالار کے اخلاق کو دیکھے ۔ اگر کوئی فاتح ہے تو فاتح مکہ کو دیکھے ۔اگر کوئی وزیر خارجہ ہے تو مدینہ منورہ کی خارجہ پالیسی تیار کرنے والے کی پیروی کرے۔ گویا انسان کا کوئی بھی رشتہ ہو ، کوئی بھی شعبہ ہو،الغرض زندگی کی ہر راہ پر راہنمائی کے لیے بلاشبہ نبی پاک ﷺ کی سیرت مبارکہ ہمارے لیے ایک نمونہ ہے ۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم نبی پاک ﷺ کے اسوۃ حسنہ کو مشعل راہ بنائیں تاکہ اسلام کو اس کی اصل روح کے ساتھ اہل عالم کے سامنے پیش کیا جاسکے کیونکہ اسلا م میں دہشت گردی اور انتہا پسندی کی کوئی گنجائش نہیں ہے ۔اسلام

تو امن و آشتی کا دین ہے جو کہ ہر ایک کے لیے امن اور سکون ہے۔ میں یہاں یہ واضح کر دینا چاہوں گی کہ جو لوگ اسلام کو آڑ بنا کر بے گناہ مسلمان، عورتوں اور بچوں پر ظلم ڈھاتے اور بربریت کا مظاہرہ کرتے ہیں ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ مسلمان کہلانے کے بھی لائق نہیں کیونکہ ان کا یہ عمل اقوامِ عالم میں اسلام کی بدنامی اور لوگوں میں اسلام کے لیے نفرت کا سبب بن رہا ہے۔ دراصل یہ دینِ اسلام کے حقیقی دشمن ہیں جو اسلام کے نام پر ملک میں دہشت گردی اور انتہا پسندی کو فروغ دیتے ہیں۔ان دہشت گردوں اور انتہا پسندوں کی وجہ سے دنیا بھر میں اسلام کا چہرہ مسخ ہو گیا ہے۔

آج کی ٹی ٹی پی (طالبان) کے بارے میں حضور پاک ﷺ نے نشاندہی فرمادی کہ وہ بہترین قاری ہوں گے لیکن قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ اور وہ قرآن کی وہ آیات جو کفار کے لیے نازل ہوئی وہ مسلمانوں کے لیے پڑھیں گے اور فساد فی الارض کے ذمہ دار ہوں گے۔

آج ہمیں من حیث القوم یہ تعین کرنا ہو گا کہ فی زمانہ فساد فی الارض کا ذمہ دار کون ہے وہ جو سکولوں میں گھس کر نہتے طالبعلموں پر اپنے فاسق عقیدوں کے کند خنجروں کی دھار آزماتے ہیں۔ وہ جو مسجد میں نماز ادا کرنے والوں کو بم دھماکوں سے اڑا دیتے ہیں؟ وہ جو مسجد ضرار میں بیٹھ کر اسلامی مملکت کی

جڑوں کو کھوکھلا کرنے کی سازشوں میں ہمہ وقت مصروف ہیں۔ یا وہ جو حدیث رسول ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے اسلامی مملکت کی سرحدوں اور اس کے بنیادوں کی حفاظت کرنے میں مصروفِ عمل ہیں اور مسجد ضرار میں بیٹھے ہوئے ان دین دشمنوں کی سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے کوشاں ہیں۔ ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہمیں کس کا ساتھ دینا ہے۔

بحیثت فردِ واحد ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ آج وہ کون سا باپ ہے جو چودہ سو سال پہلے فاطمہ الزہرا کے والد محترم کی پیروی کرتے ہوئے اپنی بیٹی کی آمد پر کھڑا ہو اور اپنی بیٹی کے لیے چادر بچھاتا ہو۔؟ فی زمانہ باپ بیٹی کی پیدائش پر سر جھکا لیتے ہیں۔ کیا آج کا شوہر حضرت عائشہؓ کے شوہر کی مانند بیوی کے لیے پیار کرنے والا ہے۔؟ کیا آج کوئی شوہر اپنی بیوی کا جوٹھا پانی پی سکتا ہے؟ کیا آج کا جینز پہننے والا ماڈرن بیٹا اپنی ماں کا اس حد تک احترام کر رہا ہے جس کا نبی پاک ﷺ نے اپنی حدیثوں میں حکم دیا؟ کیا آج کے دور کا ایک عام مرد جو باہر چلتی ہوئی عورت کو گدھ کی نظر سے دیکھتا ہو، ان کی پیروی کر سکتا ہے جو کفار کی خواتین کے لیے بھی اپنی چادر پیش کر دیں؟ کیا آج کے حکمران مدینہ منورہ کے حکمران کی طرح فلاحی ریاست کے قیام کے لیے کام کرتے ہیں؟ اگر غور کیا جائے تو ہمارے معاشرے میں جتنے بھی مسائل ہیں ان کی بنیادی وجہ ہماری دینِ اسلام سے دوری اور محبت کے دعویٰ کے

باوجود نبی پاک ﷺ کی تعلیمات پر عمل پیرانہ ہونا ہے۔ ہم نبی پاک ﷺ سے محبت کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن ان کی تعلیمات پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔ محبت کا تقاضا ہے کہ ہم نبی پاک ﷺ کی سیرت مبارکہ کو پڑھیں اور اپنی زندگی کا ہر لمحہ سیرت مبارکہ کیمطابق گزاریں۔ ہم گفتار کے غازی ضرور ہیں لیکن جہاں پر عمل کی بات آتی ہے وہاں سیرت نبوی ﷺ کی پیروی نہیں کرنا چاہتے اور اس کی توجیہ یہ دیتے ہیں کہ لوگ کیا کہیں گے؟ توجیہ کوئی بھی ہو عملا مسلمان اسلام سے دور بھاگ رہے ہیں یہ جانے بنا کہ مسلمان کی بقاء دین اسلام کی پیروی میں ہے اور اگر دین سے دور رہیں گے تو کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔ آج ساری دنیا میں مسلمان ایک مغلوب قوم کی حیثیت سے زندہ ہیں ۔ وہ فلسطین ہو، کشمیر ہو، یا افریقہ کا کوئی ملک مسلمانوں کی حالت ابتر ہے۔ اس کی وجہ بھی دین اسلام کو چھوڑ کر مغربی نظامِ زندگی کو اپنا لینا ہے۔ مسلمان اس وقت تک مغلوب اور مظالم کی چکی میں پستے رہیں گے جب تک کہ اسلام سے دور رہیں گے۔

ربیع الاول صرف نذر ونیاز، نعتیں پڑھنے اور تقاریر کرنے کا مہینہ نہیں ہے بلکہ یہ مقدس مہینہ ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم فیصلہ کریں کہ حضور پاک ﷺ کے اسوۃ حسنہ کے مطابق زندگی گزاریں گے۔ ہمیں اپنے عمل سے ثابت کرنا ہے کہ اسلام امن وآشتی کا دین ہے۔ اس بابرکت مہینے میں ہمیں اس عہد کی تجدید کرنی چاہیے کہ آنے والے سال میں نمازِ پنجگانہ اور روزہ کے ساتھ ہر وہ کام

کریں گے جن کو نبی پاک ﷺ نے پسند فرمایا اور ہر اس کام سے اجتناب کریں جن کو نبی پاک ﷺ نے ناپسند فرمایا۔اسلام کو نماز اور روزہ تک محدود نہ کریں بلکہ زندگی کے ہر قدم پر اسلام پر عمل پیرا ہوں ۔ اسلام صرف عبادات کا نہیں بلکہ زندگی کے ہر رخ، ہر رشتے کو احسن طریقے سے نبھانے کا نام ہے۔بحیثیت فرد اور بحیثیت قوم ہمیں عملاً اسلام کو نافذ کرنا ہو گا۔

خدا کرے نیا سال سب کو راس آئے

سال 2014 اختتام پذیر ہوا۔ اور سال نو کا آغاز ربیع الاول کے مبارک مہینہ سے ہوا ۔ گذشتہ برس ارضِ وطن کے طول و عرض میں آہیں اور کراہیں گونجتی رہیں۔ پورے ملک میں دہشت گردی، انتہا پسندی، ظلم و بربریت کا دور دورہ رہا۔ امن و امان کی صورت حال پہلے سے بھی بدتر ہوتی نظر آئی ۔ ایک طرف ڈرون حملے تو دوسری جانب دہشت گردوں کے حملوں سے شہید ہونے والوں کے خون سے سرزمین پاکستان سرخ ہوتی رہی ۔ اور بے انتہا دعووں کے باوجود حکومت امن و امان کے قیام میں اس حد تک کامیاب نہیں ہو سکی جس حد تک ہونا چاہیے تھا۔ اس برس بھی دہشت گرد اپنے مزموم عزائم میں کامیاب ہوتے رہے۔ دہشت گردی کے خاتمے کے لیے خیبروں اور آپریشن ضربِ عصب کا آغاز کیا گیا تاکہ ملک سے دہشت گردی کے ناسور کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاک کیا جاسکے ۔ اس آپریشن میں نہتے لوگوں کو شمالی وزیرستان اور متاثرہ علاقوں سے نکال کر آپریشن ختم ہونے تک کیمپوں میں رکھا گیا ہے ۔ یہ آپریشن ابھی تک کامیابی سے جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ یہ زمین دہشت گردوں سے پاک نہ ہو جائے ۔

اس برس کا سب سے بڑا حادثہ اور دل دہلا دینے والا واقع پشاور میں بچوں کے سکول پر حملہ تھا۔ ظلم و بربریت کی سب سے بڑی داستان پشاور میں اس وقت رقم

ہوئی جب اساتذہ کو زندہ جلایا گیا اور ننھے بے گناہ پھولوں کو بلا اشتعال فائرنگ کرکے اور خودکش دھماکوں سے مارا دیا گیا۔جب والدین نے ان پھولوں کے جنازے اٹھائے جنھوں نے بڑھاپے میں ان کا سہارا بننا تھا۔ اس ظلم کے واقع نے پورے ملک کو جہاں رلا دیا وہاں پوری دنیا نے اس واقع کی مذمت کی۔ لیکن اس واقع نے پاکستانی قوم کے عزم و حوصلہ کو کم نہیں کیا بلکہ اس واقع کی وجہ سے تمام سیاست دان، افواجِ پاکستان، عدلیہ ایک میز پر نظر آئے اور دہشت گردی کے خاتمے اور ملک دشمن عناصر کو قرار واقع سزا دینے کے لیے اہم فیصلے کیے گئے جس پر پہلی بار اپوزیشن اور حکومت دونوں متحد تھیں۔ ملک میں دہشت گردی کی عدالتیں بنانے، مجرموں کو قرار واقع سزا دینے امن وامان قائم کرنے اوراس طرح کے واقعات سے بچنے کے لیے اقدامات کی خاطر تمام ادارے اکٹھے نظر آئے۔ پہلی بار ملک میں بڑے پیمانے پر انتہا پسندوں اور دہشت گردوں کے خلاف آپریشن کا آغاز کیا گیا۔ اور بڑے پیمانے پر مجرموں کو پھانسیاں دینے کا نہ صرف اعلان کیا گیا بلکہ اس پر عمل درآمد بھی ہوا۔ اس واقع نے قوم کو پھر سے یکجاہ کر دیا۔ قوم کا یوں ایک میز پر اکٹھا ہو جانا اس بات کا عکاس ہے کہ چاہیے ہمارے کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہو ملک و قوم کی امن وسلامتی کے لیے ہم ایک ہیں اور دہشت گردی کے خاتمے کے لیے فوج تنہا نہیں ہے بلکہ پوری قوم اور سیاست دان ان کے ساتھ کھڑے ہیں اور اقوامِ عالم نے دیکھا کہ اتنے بڑے حادثے نے بھی ان بچوں کے حوصلے پست نہیں کیے۔

پشاور کے بعد سب سے زیادہ ہونے والی اموات کا شکار تھر کا خطہ رہا۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں مور ناچا کرتے تھے اس علاقے میں قحط اور خشک سالی کے آفریت نے ایسے پنجے گاڑھے کہ لاتعداد بچوں، بوڑھوں، جوانوں، مویشیوں، کی جانیں لینے کے بعد بھی اس علاقے کی جان نہ چھوڑی۔ اس آفریت نے نہ جانے کتنے ہیی لوگوں کی جان لی۔ اور ابھی بھی اس علاقے کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ دن بدن مرنے والوں کی تعداد میں کمی ہونے کی بجائے اضافہ ہوتا رہا۔ اور یہ سلسلہ ابھی رکا نہیں۔ تھر کے باسی اس سال سیاست دانوں اور اشرافیہ کی امداد کے منتظر رہے۔ان کے لیے ٹاک شوز تو بہت کیے گئے آرٹیکل تو بہت لکھے گئے، رپورٹس تو بہت بنائی گئ لیکن عملی اقدام نہیں کیے گئے۔ عملا ان آفت زدگان کو نہ تو صوبائی حکومت اور نہ ہی وفاقی حکومت کی جانب سے کوئی توجہ ملی۔

اسی برس کراچی میں امن وامان کی صورت حال پہلے جیسی ہی رہی۔ ٹارگٹ کلنگ، بھتہ خوری کا بازار گرم رہا۔ سنی، شیعہ فسادات بھڑکانے کی کوشش کرتے ہوئے شیعہ علماء کا قتل کیا گیا۔ بوریوں میں ملنے والے جسم، اور اندھی گولیوں کا نشانہ بننے والے بے گناہ افراد انصاف کے انتظار میں رہے۔لیاری، منگو پیر کے علاقوں میں مسلح گروہوں کا راج رہا اور ان گروہوں کی لڑائیوں میں

مارے جانے والے بے گناہ افراد کے لواحقین اس سال بھی اس جنگ کے خاتمے کا انتظار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ کراچی کو فوج کے حوالے کر دینے کی سفارشات پیش کی جانے لگی۔

بجلی۔ گیس اور آٹے کے بحران بھی آتے رہے۔ ناقص منصوبہ بندی کے باعث بجلی کا بحران ابھی تک حل نہیں ہو پایا۔ اگرچہ حالیہ حکومت نے بجلی کا بحران ختم کرنے کے بہت دعوے بھی کیئے لیکن وہ اپنے دعوے پورے کرنے میں ناکام رہی۔

سیاست کے میدان می ں یہ سال گرما گرمی کا سال کہلایا جا سکتا ہے۔ یہ سال دھرنوں، جلسے جلسوں کی نظر ہوا۔ اس سال کےچار مہینے سے اوپر اپوزیشن نے دھرنے میں گزارے جس کے اثرات پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں کمی کی صورت میں عوام کو نظر آئے۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو ان دھرنوں کے وہ نتائج برآمد نہیں ہوئے جن کی اپوزیشن اور عوام کو امید تھی۔ دھرنوں کے بعد پورے ملک میں جلسے جلوسوں کی سیاست کا آغاز ہوا ایک کے بعد ایک جماعت جلسے جلوس کرتی نظر آئی۔ ان جلسے جلوسوں اور دھرنوں نے ملکی معیشت کا پہیہ کئی روز تک جام رکھا۔

جہاں یہ سال آنسوؤں میں گزرا وہاں اس سال نے کچھ خوشیاں بھی دی۔ پاکستان کی بچی ملالہ یوسف زائی کو پوری دنیا میں پذیرائی ملی اور اسے انعام سے نوازا گیا۔ کھیل کے میدان میں بہت عرصے بعد پاکستان نے کامیابیوں کے جوہر دیکھائے۔ اور بہت عرصے بعد اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

سال 2015 ربیع الاول کے مبارک اور بابرکت مہینے میں شروع ہو رہا ہے۔ جہاں نیا سال نئی خوشیوں، نئی منزلوں، نئے ولولوں کا پیغام لایا ہے وہاں یہ ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم فرقہ واریت سے بالاتر ہو کر سوچیں۔ ملک و قوم کی ترقی کو ذاتی مفاد پر ترجیح دیں۔ ترقی کی اس دوڑ میں اپنا حصہ ڈالیں دہشت گردی اور انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے افواجِ پاکستان کا بھرپور ساتھ دیں۔ جو غلطیاں ماضی میں کی گئی ہیں انھیں دھرانے سے گریز کریں۔ اپنے ان ہم وطنوں کا جو کسی مشکل یا آفت کا شکار ہیں ان کی مدد کریں۔ دنیا پر یہ ثابت کر دیں کہ یہ قوم صرف مشکل ہی میں نہیں بلکہ ہر حال میں متحد ہے اور اس وطن کے رہنے والے مشکل سے مشکل اوقات میں بھی اپنے وطن سے غداری نہیں کر سکتے۔ جو ہر مشکل سے بہادری اور جواں مردی کے ساتھ لڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

آیئے نئے برس کے طلوع ہوتے سورج کو ایک نئے عزم ایک نئی امید کے ساتھ خوش

آمدید کہیں۔ اس دعا کے ساتھکہ
نہ کوئی رنج کا لمحہ کسی کے پاس آئے
خدا کرے نیاء سال سب کو راس آئے

آپریشن ضربِ عصب : ضرورت وقت

جہاں پاکستان کا نام آتا ہے وہاں پاکستانی افواج کا ذکر لازم ہے۔ پاکستان کی بری، بحری اور فضائی افواج اپنی پیشہ ورانہ مہارت میں دنیا کی کسی بھی فوج سے کم نہیں ۔پاک فوج دنیا کی آٹھویں بڑی فوج ہے۔ جنگ ہو یا امن پاک فوج پر دو صورتوں میں پاکستانی عوام کی خدمت کے لیے کوشاں رہتی ہے۔ چاہے وہ سیلاب ہو یا زلزلہ، پاک فوج ہی لوگوں کو بحفاظت محفوظ مقامات پر منتقل کرتی ہے۔ جہاں دوسرے تمام ادارے حالات پر قابو پانے سے قاصر رہتے ہیں وہاں پاک فوج کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ وہ نہروں کی بھل صفائی کا موقع ہو یا کسی بھی ہنگامی صورتحال کا سامنا ہو پاک فوج کے جوان ہر دم ملک کے لیے کام کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہ ادارہ ہمارے ملک کا سب سے زیادہ مضبوط اور مستحکم ادارہ ہے۔ پاک فوج اس ملک کی حفاظت کی ضامن ہے۔ خطرات بیرونی ہوں یا اندرونی پاک فوج ہمیشہ استبدالی قوتوں کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہوئی ہے۔ جنگ چاہے بارڈر پر ہو، دہشت گردی کے خلاف ہو ہمارے فوجی جوان کسی قسم کی قربانی دینے سے گریز نہیں کرتے۔ دہشت گردی کی اس جنگ میں جہاں دوسرے اداروں کے افراد نے قربانیاں دیں وہاں پاک فوج کی قربانیاں سب سے زیادہ ہیں۔ پاک فوج کے افسران اور جوانوں نے اس ملک کی خاطر اپنی جانوں کی قربانیاں دی ہیں۔ ملک

کو دہشت گردوں سے پاک کرنے کے لیے پاک فوج کو اپنے ہی علاقوں میں کاروائی بھی کرنا پڑتی ہے۔ جس کے خلاف بہت کچھ لکھا بھی گیا ہے۔

پاک فوج کے خلاف بولنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ اسی فوج کی بدولت وہ اپنے گھروں میں امن وامان سے رہتے ہیں۔ ملکی سرحدیں محفوظ ہیں۔ اور جب ہم چین کی نیند سو رہے ہوتے ہیں اس وقت قوم کے یہ بیٹے ہماری ہی حفاظت کی خاطر ہر موسم کی شدت کو سہتے اور ہماری حفاظت کی خاطر جاگ رہے ہوتے ہیں۔پاک فوج کے خلاف بولنے والے یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ ان کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی عزت اسی فوج کی وجہ سے محفوظ ہے۔اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر یہ فوجی جوان دہشت گردوں سے دست و گریباں ہیں۔ چاہے وہ سوات کا علاقہ ہو یا شمالی وزیرستان کا حکومت کی رٹ کو قائم کرنے اور ملک کو انتشار سے بچانے کے لیے ملک دشمنوں سے برسرپیکار ہیں۔آج کل پاک فوج شمالی وزیرستان میں آپریشن ضرب عضب میں مصروف ہے اور یہ آپریشن کامیابی سے جاری ہے۔ قوموں کی زندگی میں مشکل مرحلے آیا ہی کرتے ہیں اور وہی قومیں زندہ رہتی ہیں جو ان مشکل مرحلوں میں ثابت قدم رہیں۔

اس آپریشن کے خلاف بولنے والے اگر کہتے ہیں کہ یہ آپریشن مسلمانوں کے خلاف ہے اور یہ فیصلہ نہیں ہو پایا کہ یہ لوگ دہشت گرد بھی ہیں یا نہیں، سو نہیں

ہونا چاہیے ۔تو یہی مسلمان اس ملک میں ہونے والی دہشت گردی کے ذمہ دار بھی ہیں ۔میرا سوال یہ ہے کہ اگر یہ لوگ دہشت گرد نہیں تو انھوں نے ہتھیار کیوں اٹھا رکھے ہیں ؟اور یہ کس قسم کے مسلمان ہیں جو مسجدوں ، سکولوں کو نشانہ بناتے ہیں ۔؟؟؟کیا اسلام یہ ہے کہ ملک میں خوف وہراس پھیلایا جائے ؟؟اگر یہ اسلامی حکومت لانا چاہتے ہیں تو جمہوری طریقے سے کیوں کام نہیں کرتے، وہ ملک پاکستان کی حکومت کے خلاف کیوں اعلان جنگ کیئے ہوئے ہیں ؟ یہ لوگ پاکستان کے سکیورٹی اداروں کو کیوں نشانہ بنائے ہوئے ہیں ؟؟؟اگر یہ لوگ دہشت گرد نہیں ہیں تو ان علاقوں میں حکومت کی رٹ کیوں موجود نہیں ہے ؟؟اس آپریشن سے پہلے بھی مذاکرات ہوتے رہے ہیں جس کا کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اور یہ بات روز روشن کی عیاں ہے کہ ادھر مذاکرات ہو رہے تھے تو ادھر دھماکے اور دہشت گردی اپنے عروج پر تھی ۔اور ان مذاکرات کا کبھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ تو کیا ملکی حالات کو ایسے ہی چھوڑ دیا جاتا ؟؟ کسی بھی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے اس آپریشن کے بارے میں کچھ حقائق جاننا ضروری ہے۔ شمالی وزیرستان ایک بڑا علاقہ ہے جس میں طویل عرصے سے حکومت کی رٹ موجود نہیں تھی ۔ یہ علاقہ وہ علاقہ ہے جہاں افغانستان سے ہجرت کرنے والے طالبان کی ایک کثیر تعداد موجود ہے اور تحریک طالبان پاکستان کے کئی اہم رہنماء اسی علاقہ میں پناہ گزیر ہیں۔ طالبان کو اس علاقے میں کافی اثر و

رسوخ حاصلے اور دہشت گردی کی متعدد کاروائیوں میں ملوث افراد کے تانے بانے اسی علاقہ میں موجود طالبان سے ملتے رہے۔دہشت گردی کی بڑھتی ہوئی کاروائیوں کو روکنے کے لیے متعدد بار طالبان سے مذاکرت بھی کئے گئے جو کہ ہمیشہ ناکام ہو گئے ۔بلکہ مذاکرات کو آڑ بنا کر ملک میں مزید بدامنی پیدا کی گئی ۔اس آپریشن کا مقصد ملک پاکستان میں امن و امان قائم کرنا ہے اور ایسی ہر قوت سے پاک کرنا ہے جو پاکستان کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں اور عوام میں خوف وہراس پیدا کرنا چاہتے ہیں ۔اس آپریشن کے آغاز میں ہی ایسے تمام لوگ جنھوں نے ہتھیار پھینک دیئے تھے ، عورتوں اور بچوں کو اس علاقے سے نکال کر محفوظ کیمپوں میں شفٹ کر دیا گیا ان کیمپوں کی تعداد تین ہے اور یہ کیمپ تمام بنیادی سہولیات سے مزین ہیں ۔ان تمام کیمپوں میں اشیائے خردونوش اور سہولیات فراہم کرنے کے لیے پاک فوج کی ایک دن کی تنخواہ کاٹ کر ان مہاجر کیمپوں میں اشیائے صرف پہنچائی گئی اور مسلسل پہنچائی جا رہی ہیں ۔اور ان مہاجرین کے ساتھ یک جہتی کے اظہار کے طور پر پاکستان آرمی کے جنرل اور چیفآف آرمی سٹاف نے عید کا دن ان مہاجرین کے ساتھ گزارا۔آپریشن کے دوران یہ امن پسند لوگ ان کیمپوں میں پناہ گزین رہیں گے اور آپریشن ختم ہوتے ہی یہ تمام لوگ اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے۔اور سوات کی طرح معمولات زندگی امن وامان سے پورے کریں گے ۔

شمالی وزیرستان کو فلسطین کے غزہ سے مقابلہ کرنے والوں سے میرا ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا فلسطین میں بھی ایسا ایک بھی مہاجر کیمپ موجود ہے ؟؟؟ کیا اسرائیلی فوج کی تنخواہ سے عورتوں اور بچوں کو کھانے پینے کی اشیاء فراہم کی جاتی ہیں؟؟؟ کیا وہاں مہاجر کیمپوں میں پناہ لینے والوں کی حفاظت کی ذمہ داری لی جاتی ہے ؟؟؟ کیا اسرائیلی آرمی چیف بھی اپنی خوشیاں فلسطینی پناہ گزیروں کے ساتھ مناتے ہیں ؟؟؟نہیں۔ بلکہ وہاں تو مہاجر کیمپ تک اسرائیلی کاروائیوں سے محفوظ نہیں۔

جس نے حکومت پاکستان کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے ہوں اور ملک کو نقصان پہنچانا چاہتا ہو وہ اگر دہشت گرد نہیں بھی تب بھی وہ غدار ہیں۔ میری اصطلاح میں جو بھی اس وطن سے غداری کرے وہ کوئی صحافی ہو، عالم ہو، وہ کوئی بھی ہو اسے سخت سے سخت سزا ملنی چاہیے کیونکہ جیسا بھی ہے اگر یہ وطن سلامت ہے تو اس دنیا میں ہم عزت کے ساتھ جی رہے ہیں۔اس ملک کو حاصل کرنے کے لیے ہم نے بے انتہا قربانیاں دی ہیں ۔یہ ملک ہماری ماؤں، بہنوں کی عزت اور ہماری اگلی نسلوں کے بقاء کی ضمانت ہے۔ اور اپنی اگلی نسل کو ایک بہترین ریاست دینے کے لئے ضروری ہے کہ اس ملک کو انتشاراور دہشت گردی سے بچایا جائے۔اور ملک کی اقتصادی صورتحال کو بہتر بنانے کے لیے کام کیا جائے۔تاکہ ہماری اگلی نسل کو رہنے کے لیے پر امن، مضبوط اور محفوظ ریاست میسر ہو۔

ٹریفک حادثات تدارک ممکن ہے

موسم سرما اپنے جوبن پر ہے۔ یہ موسم اپنے ساتھ دھند کا ایک لاامتناہی سلسلہ لے کر آتا ہے۔ ملک کے طول و عرض ممیں روز بروز سردی اور دھند میں اضافہ کی وجہ سیمیدانی علاقوں حد نگاہ میں تقریبا صفر ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے ٹریفک جیم کا مسئلہ جنم لیتا ہے اس کے ساتھ ساتھ اس موسم میں ٹریفک حادثات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ پاکستان بیورو آف سٹیٹیسٹکس کی رپورٹ کے مطابق سال 2013 میں ٹریفک حادثات کی تعداد 8885 رہی جبکہ ان حادثات میں ہونے والی اموات کی تعداد 4672 جبکہ سال میں ٹریفک حادثات میں ہونے والی اموات کی تعداد اس سے کہیں زیادہ رہی۔ WHO. کے مطابق پاکستان میں ٹریفک حادثات میں ہونے والی اموات بیس ہزار سے تجاوز کر گئی جو کہ کل اموات کا 1.58% ہیجبکہ ٹریفک حادثات میں ہونے والی اموات کی شرح 15.55% ہے۔ جو کہ دنیا کے اکثر ممالک سے کہیں زیادہ ہے۔ ٹریفک حادثات کی کئی وجوہات ہیں۔ ان وجوہات میں ایک بنیادی وجہ تیز رفتاری بھی ہے۔ تیز رفتاری عموما گاڑیوں میں تصادم کا سبب بنتی ہے۔ تیز رفتاری کے سبب پہاڑی علاقوں میں سفر کرنے والی بسیں ڈرائیور کا کنٹرول نہ کر سکنے کی صورت میں عموما گہری کھایوں میں جاگرتی ہیں یا الٹ جاتی ہیں۔ بسوں کے الٹ جانے کی

دوسری بڑی وجہ گنجائش سے زیادہ لوگوں کو بس میں سوار کیا جاتا ہے۔ تیز رفتاری ہر موسم میں نقصان دہ ہے تاہم موسم سرما میں خصوصا حدِ نگاہ صفر ہونے کی وجہ سے اگر گاڑی کی رفتار کو مناسب حد تک نہ رکھا جائے تو ٹریفک حادثات کا سبب بنتی ہے۔ تیز رفتاری ہمارے ملک میں ایک معمول کی حیثیت رکھتی ہے جس کی جانب کوئی توجہ نہیں دی جاتی خصوصا نوجوان ڈرائیور گاڑی کی رفتار کو زیادہ رکھنا پسند کرتے ہیں۔ تیز رفتاری کی وجہ سے ہونے والے حادثات میں عموما جانی نقصان زیادہ ہوتا ہے۔

حال ہی میں کراچی میں ہونے والے حادثے نے کئی خاندانوں کے چراغ گل کر دیئے۔ یہ حادثہ ایک آئل ٹینکر کے بس سیتصادم کی وجہ سے ہوا۔ آئل ٹینکر سے تصادم کی وجہ سے بس اور ٹینکر دونوں میں آگ بھڑک اٹھی اور پوری بس جل کر خاکستر ہو گئی۔ اس حادثہ میں 59 جبکہ بعض اطلاعات کے مطابق 62افراد زندہ جل گے۔ جبکہ بس ڈرائیور اور کنڈکٹر جائے وقوعہ سے فرار ہو گئے۔ اس قدر جانی نقصان کی وجہ یہ تھی بس کے شیشے فکسڈ ہونے کی وجہ سے ان کو کھولنا ممکن نہ تھا۔ بس میں کسی ایسے اوزار کی غیر موجودگی جس کی مدد سے شیشوں کو توڑا جاسکے نے بھی اموات میں اضافہ کیا۔ سونے پر سوہاگہ فائر بریگیڈ کا عملہ بھی بروقت جائے حادثہ پر نہ پہنچ سکا۔ جس کی وجہ سے سوائے چند ایک افراد کے کوئی شخص اپنی جان بچانے میں کامیاب نہ ہو سکا اور تقریبا تمام مسافر اس حد تک جھلس

گئے کہ اب کے مردہ اجسام بھی قابلِ شناخت نہ رہے۔اوراب لواحقین کو اپنے پیاروں کی شناخت کے لیے ڈی این اے ٹیسٹ کا انتظار کرنا پڑے گا۔

اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کا زندہ جل جاناایک الم ناک حادثہ ہے اور اس بات کی علامت ہے کہ ہمارے بہت سے اداروں کی کارکردگی ابھی تک تسلی بخش نہیں ہے ۔اداروں کی کارکردگی کا غیر تسلی بخش ہونا ایک جانب لیکن دوسری جانب اس طرح کے حادثات سے بچنے کے لیے مناسب احتیاطی تدابیر اختیار نہ کرنا بھی حادثات کی وجوہات میں شامل ہے۔ ہمارے ملک میں گاڑیوں کی رفتار کو ڈرائیور حضرات کبھی مدِ نظر نہیں رکھتے۔ حد سے زیادہ رفتار بھی بہت سے حادثات کا سبب بنتی ہے۔خاص طور پر موسم سرما میں جب دھند کی وجہ سے حدِ نگاہ صفر ہو جاتی ہے ایسے وقت میں گاڑی کی رفتار کو مناسب حد تک رکھا جانا ضروری ہے تاکہ اس طرح کے حادثات سے بچا جاسکے۔ بعض علاقوں میں ٹریفک پولیس کا نظام نہایت فرسودہ ہے جس کی وجہ سے گاڑیوں کی سپیڈ کو چیک نہیں کیا جا سکتا۔ تیز رفتاری اور جگہ سے زائد مسافروں کو بس میں سوار کرنا اس طرح کے حادثات کی بنیادی وجہ ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ عموما دیکھا گیا ہے کہ ایئر کنڈیشن بسوں میں شیشے ایئر ٹایٹ ہوتے ہیں اور ان شیشوں کو کھولا نہیں جا سکتا، نہ ہی ایمرجنسی میں ان

شیشوں کو توڑنے کے لیے بس میں کسی قسم کا کوئی اوزار موجود ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اکثر و بیشتر بسوں میں کوئی ایمرجنسی دروازہ موجود نہیں ہے جس کو کسی ناگہانی حادثہ کے وقت استعمال میں لایا جاسکے۔ اگر ان بسوں میں شیشوں کو توڑنے کے کوئی اوزار موجود ہو یا کوئی ایمرجنسی دروازہ موجود ہو تو اموات کی تعداد میں خاطر خواہ کمی لائی جاسکتی ہے۔ جبکہ کسی بھی حادثہ کی صورت میں ایمرجنسی ڈور وہ واحد راستہ ہے جو اموات میں کمی کا سبب بن سکتا ہے۔ حالیہ واقع میں بھی حادثہ کا شکار ہونے والی بس کی کھڑکیوں نہ صرف ائیر ٹائٹ تھی بلکہ ان کو توڑنے کے لیے کوئی اوزار موجود نہیں تھا اور نہ ہی کوئی بس میں کوئی ایمرجنسی ڈور تھا جس کے ذریعے لوگ اپنی جان بچا سکتے۔ اس حادثے میں جس ادارے کی نااہلی سامنے آئی وہ ہے ٹریفک پولیس اور فائر بریگیڈ۔ حادثات پر قابو پانے کے لیے ٹریفک پولیس مستعد نظر نہیں آتی۔ ٹریفک پولیس کا مناسب نظام جدید نہ ہونے کی وجہ سے بسوں کی سپیڈ کو چیک کرنے کا کوئی نظام موجود نہیں ہے اور نہ ہی غلط سمت پر سفر کرنے والی ٹریفک کو چیک کیا جاتا ہے۔ اس طرح کے حادثات ٹریفک پولیس کی کارکردگی پر ایک سوالیہ نشان ہے۔ صوبائی حکومت کے بے پناہ دعوؤں کا پول اس وقت کھل جاتا ہے جب اس قسم کے حادثات منظرِ عام پر آتے ہیں۔ دوسرا بڑا ادارہ جسے ہمارے ملک میں بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے وہ فائر بریگیڈ ہے۔ پاکستان میں

فائر بریگیڈ کے ادارے کو کبھی قابلِ توجہ نہیں سمجھا گیا۔ پاکستان کی فائر بریگیڈ میں نہ تو جدید ساز و سامان فراہم کیا گیا ہے اور نہ ہی فائر بریگیڈ کا عملہ تربیت یافتہ ہے۔ خصوصا تیز رفتار گاڑیوں کی غیر موجودگی فائر بریگیڈ کی کارکرگی کو مزید خراب کرتی ہیں۔ کیونکہ آگ لگ جانے اور اس طرح کے حادثات کی صورت میں فائر بریگیڈ وہ واحد ادارہ ہے جو کسی بھی حادثہ میں ہونے والی اموات کی تعداد میں کمی کا سبب بن سکتا ہے۔

حالیہ حادثہ میں ٹریفک وارڈن کی غیر موجودگی، ٹریفک پولیس کی نا اہلی کے ساتھ ساتھ فائر بریگیڈ کی دیر سے آمد اور آگ بجھانے میں ناکامی بھی اموات کی تعداد میں اضافے کا سبب بنی۔ اس کے ساتھ ساتھ سندھ، کے پی کے اور بلوچستان میں شہری دفاع کا کوئی موثر ادارہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ سوائے صوبہ پنجاب میں جہاں ریسکیو 1122 کی موجودگی شہری دفاع اور اس طرح کی ایمرجنسی سے نمٹنے کے لیے کسی اور صوبے میں ایسے ادارے یا تو موجود نہیں یا غیر فعال ہیں۔

توجہ طلب امر یہ ہے کہ پورے ملک کی ٹریفک پولیس کو فعال کیا جائے۔ اسلام آباد سٹی ٹریفک پولیس کی طرز پر پورے ملک کی ٹریفک پولیس کو جدید سسٹم سے لیس کیا جائے۔

ان حادثات کو مکمل طور پر روک دینا تو شاید ممکن نہیں ہے

تاہم ٹریفک پولیس کی کارکردگی کو بہتر بنا کر ان حادثات کی تعداد میں کمی کی جاسکتی ہے ۔ہر سڑک پر سکیورٹی کیمرہ لگایا جائیے اور ٹریفک وارڈن کی ہر سٹرک پر موجودگی کو یقینی بنایا جائے ۔تاکہ اس طرح کے حادثات کو بروقت نہ صرف روکا جاسکے اور اگر کوئی حادثہ ہو جائے تو اموات کی تعداد میں خاطر خواہ کمی لائی جاسکے ۔ٹریفک پولیس اور فائر بر گیڈ دونوں اداروں کی کارکردگی کو بہتر بنانا ٹریفک حادثات پر قابو پانے کے لیے از حد ضروری ہے۔

اقدار کا زوال

معاشرتی اقدار وہ تمام رویے ، رہن سہن کے انداز ، لباس ، رسم و رواج ہیں جو کسی بھی معاشرے میں رائج ہوتے ہیں ۔یہ اقدار سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتے ہیں ۔اقدار معاشرے کی عکاس ہوتی ہیں ، یہ معاشرے کا ایک عمومی رویہ ہے ہر معاشرے اور ہر مذہب کی اپنی الگ اور مخصوص اقدار ہوتی ہیں اور اسی وجہ سے ایک معاشرہ دوسرے معاشرے کی نسبت ممتاز ہوتا ہے ۔۔اقدار ہی معاشرے میں کسی مخصوص رویے یا کام کو قابلِ قبول یا قابلِ اعتراض بناتی ہیں ۔اکثر و بیشتر دیکھا گیا ہے کہ ایک معاشرے کی اقدار دوسرے معاشرے کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوتی ۔ بعض اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک معاشرے میں جو رویہ قابلِ ستائش ہے وہ دوسرے معاشرے میں قابلِ مذمت ہوتا ہے ۔اس تمام رویے کے ذمہ دار مخصوص معاشرے میں بسنے والوں کی سوچ ، ذہنی اور اخلاقی اقدار ہیں ۔ معاشرتی اقدار کا قانون کی صورت میں کہیں لکھا ہونا بھی ضروری نہیں کیونکہ یہ اقدار معاشرے کی روح میں رچی بسی ہوتی ہیں ۔ اقدار کی پابندی بالکل اسی طرح کی جاتی ہے جیسے کسی ملک کے آئین اور قانون کی ۔یہ اقدار وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یا معاشرتی تبدیلیوں کے باعث تبدل ہوتی رہتی ہیں۔یہ تبدیلیاں مثبت بھی ہوتی ہیں اور منفی بھی ۔ ان تبدیلیوں کا مثبت یا منفی ہونا بھی معاشرے میں

رائج اقدار پر منحصر ہے۔ان اقدار کے برعکس کام کرنے والوں کو مخالفتوں کا سامنا بعض اوقات معاشرتی بائیکاٹ کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔۔ ہر نسل چاہتی ہے کہ اس کی اقدار اگلی نسل میں منتقل ہوں۔معاشرتی اقدار میں مذہب کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ہر مذہب کے ماننے والوں کے رہن سہن میں فرق اور بعض اوقات تضاد بھی ہوتا ہے۔ہر مذہب لباس کے معاملے میں کچھ قواعد وضع کرتا ہے۔گویا ہر معاشرے اور مذہب میں لباس کی بھی اپنی ایک حیثیت ہے اور یہ لباس ہی ہے جو ایک معاشرے کو دوسرے معاشرے سے الگ کرتا ہے۔اسلامی اقدار میں عورت کی ایک اہم حیثیت ہے۔عورت کے احترام کی خاطر اسے پردہ میں رہنے اور بوقتِ ضرورت اگر کام کاج کرنا پڑے تو خود کو ڈھانپ کر باہر نکلنے کا حکم دیتا ہے۔اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ مرد ہو یا عورت دوسرے مذاہب کے ماننے والوں یکی پیروی نہ کریں اور ادنی مشابہت سے بھی اجتناب کریں۔ حضوپاک ر ﷺ کا ارشاد ہے "مشرکیں جو اللہ تعالی کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں ان سے اپنے ظاہر وباطن کو الگ رکھو"۔

مغربی تہذیب کی یلغار ہماری تہذیب پر بہت بری طرح اثر انداز ہوئی ہیں۔اس یلغار نے ہماری تہذیب کو بڑی حد تک متاثر کیا ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہاں بہت سی معاشرتی روایات دم توڑ رہی ہیں وہاں اسلامی اقدار بھی زوال پذیر ہوتی جارہی ہیں۔وہ عورتیں جو لباس اور دوپٹے کا خیال رکھتی تھی اب

زیادہ سے زیادہ عریانی کو پسند کرتی ہیں۔ان دم توڑتی اقدار میں لباس اور بالخصوص دوپٹہ بھی ہے۔ نئی تہذیب کی دلدادہ خواتین دوپٹے سے بے بہرہ ہو چکی ہیں۔ اور ماڈرن کہلانے کے لیے آج کی عورت خود کو زیادہ سے زیادہ عریاں کرنا پسند کرتی ہیں اور ہمارے معاشرے کا مرد ایسی ہی خواتین کو ترقی کی منازل طے کرنے میں مدد کرتے ہیں۔اور اس رویے کو معاشرے میں عام کرنے میں اہم کردار میڈیا بھی ادا کر رہا ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک میں صبح ہوتی ہے تو سوائے سرکاری ٹی وی چینل اور چند ایک پرائیوٹ چینل کے ،ہمارے ملک کے بیشتر چینلز پر مارننگ شوز کے نام پر ناچ گانا، نیم عریاں ٹی وی اینکرز، ستاروں کا حال بتانے والوں کے ساتھ ٹی وی پر نظر آتےہیں ۔ شوز ایک سے دو گھنٹوں پر محیط ہوتے ہیں اور ان تمام مارننگ شوز میں جو چیز مشترک ہے وہ ہے ناچ گانا۔ایک ٹی وی اینکر سے میری بات ہوئی تو ان کا کہنا تھا کہ "ہم وہی دکھاتے ہیں جو عوام دیکھنا چاہتے ہیں"۔ان کا یہ کہنا ہمارے معاشرے کی اخلاقی پسماندگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔بجائے اس کے کہ دن کے آغاز میں تلاوت قرآن یا دینی تعلیمات کے پروگرام پیش کئے جائیں ہر چینل اپنی ریٹنگ بڑھانے کے لیے ناچ گانے، عریانی یا نجومیوں کا سہارا لے رہا ہے جو کہ اسلام کے منافی ہے۔ ان چینلز کو کنٹرول کرنے والا ادارہ پیمرا چینلز کے اس عمل پر ایک خاموش تماشائی بنا نظر آتا ہے۔

ہمارے ملک کے برعکس ہر ملک ، یہاں تک کہ ہمارے ہمسایہ ملک میں صبح کی نشریات کا آغاز ان کی مذہبی تعلیمات سے ہوتا اور ان کا ہر چینل چاہے وہ سرکاری ہو یا پرائیویٹ اپنے دن کا آغاز مذہبی پروگراموں سے کرتے ہیں اور ان کی صبح کا پہلا گھنٹہ مذہب کے لیے مختص ہو چکا ہے۔

یہاں تک کہ ٹی وی چینلز میں علماء کا انٹرویو کرتے ہوئے بھی خواتین اکثر و بیشتر مغربی لباس میں ملبوس ، دوپٹے کے نام پر کپڑے کی ایک دھجی یا دوپٹے سے عاری ہوتی ہیں ۔ دین کی تعلیم اور ملک میں اسلامی نظام عام کرنے کا دعویٰ کرنے والی جماعتوں کے ارکان ان خواتین پر کسی قسم کا کوئی کدغن نہیں لگاتے۔ چاہے وہ مذہبی جماعتوں کے نمائندے ہوں یا کوئی اور ،اینکرز کے اس طرح کے لباس پر کوئی احتجاج نہیں کرتا۔ جو لوگ ملک میں خلافِ راشدہ کا نظام لانے کی بات کرتے ہیں وہ بھی ان اینکرز کے بارے میں بات کرنے سے گریزاں ہیں ۔ مغربی لباس میں ملبوس یہ اینکرز گھنٹوں علماء کرام ، اسلامی سیاسی جماعتوں کے ارکان سے انٹرویو کرتی ہیں یا ٹاک شوز کرتی ہیں ۔ لیکن ان پر کسی قسم کی تنقید نہیں کی جاتی ۔ اگر علمائے کرام اور مذہبی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ احتجاج کے طور پر یہ شرط رکھ دیں کہ وہ ایسے کسی پروگرام میں جس کی اینکر مغربی لباس میں ملبوس ہو یا بنا دوپٹہ کے نیم برہنہ ہو شمولیت اختیار نہیں کریں گے تو یقینا حالات میں بہتری آئے گی ۔چینلز بھی اس بات کا خیال

کرنا شروع کر دیں گے۔ صرف ٹاک شوز نہیں بلکہ ٹی وی ڈراموں میں بھی مغربی لباس کی ترویج کی جا رہی ہے اور دوپٹہ آہستہ آہستہ غائب ہوتا جا رہا ہے جسکی وجہ سے معاشرے میں ایک عجیب سوچ پنپ رہی ہے کہ جو شخص پینٹ شرٹ میں ملبوس ہو گا اور جو عورت بے پردہ دوپٹہ سے عاری ہو گی وہ تعلیم یافتہ کہلائے اس کے برعکس اگر کسی مرد کی داڑھی ہو گی چاہے وہ دنیاوی تعلیم میں چاہے کتنا ہی آگے کیوں نہ ہو وہ دقیانوسی کہلائے گا،اسی طرح جو عورت پردہ کرتی ہو گی وہ تعلیم سے بے بہرہ، پچھلی صدی کی مخلوق اور دقیانوسی کہلائے گی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس قسم کے خیالات کی جڑیں مضبوط سے مضبوط ہوتی جا رہی ہیں۔ معاشرے میں منفی تبدیلی آ رہی ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرہ اخلاقی انحطاط کا شکار ہو رہا ہے۔ بات صرف یہاں تک محدود نہیں ہے۔ کسی بھی پروگرام کے دوران چلنے والے اشتہارات میں عریانی اس قدر عام ہو چکی ہے کہ انسان اپنی فیملی کے ساتھ بیٹھے ہوئے یہ سب دیکھتے ہوئے شرم سار ہو جاتا ہے۔ اور یہ اشتہارات مذہبی پروگراموں اور سیاسی مذاکروں میں بھی چلتے ہیں۔ان اشتہارات اور پروگراموں پر پیمیرا کو ایکشن لینا چاہیے کیونکہ اس قسم کے لباس اور اقدار کی تشہیر سے ہماری اگلی نسل میں پردہ اور اسلام سے بیزاری کے جذبات پنپ رہے ہیں۔اور کمسن بچے جب اس قسم کے اشتہارات دیکھتے ہیں تو ان کے ذہنوں پر بہت برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

یہ میڈیا کی ذمہ داری ہے کہ نئی نسل نسل میں اسلام مخالف اور اپنی تہذیب سے بے زاری جیسے خیالات کو پنپنے سے روکیں اور لباس کے معاملے میں پابندی عائد کی جائے کہ ایسا کوئی فیشن ٹی وی میں نہ دیکھایا جائے گا جس سے نئی نسل پر برے اثرات مرتب ہوں۔یاد رکھیے ! ہم اپنے بچوں کو جس ثقافت کا بچپن سے عادی بنائیں گے بڑے ہو کر وہی ثقافت ان کو اچھی لگے گی اور اتنا ہی اپنی طرف کھنچے گی۔

دھند میں لپٹا سورج

اس حسین وادی کا دھند سے گہرا رشتہ ہے۔یہ وادی سال کے بیشتر حصہ میں دھند کی چادر اوڑھے اپنا اصل رنگ روپ ساری دنیا سے چھپائے رکھتی تھی۔اپنے مکینوں کے دکھوں، تکلیفوں پر دبیز چادر ڈال کر انھیں ساری دنیا سے کاٹ دیا کرتی تھی۔یہ سوگوار وادی اکثر اپنے چہرے کے آنسو چھپانے کے لیے اسی دھند کا سہارا لیا کرتی تھی۔سفید دھند اور اس وادی کا اٹوٹ بندھن صدیوں سے قائم ہے اور ابد تک قائم رہے گا۔نہ ٹوٹنے والے اس رشتے کو دونوں فریق مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔

شانزے بھی اس وادی کی طرح اپنے چہرے کو مسکراہٹوں اور مصنوعی سہاروں سے ہمیشہ چھپائے رکھتی تھی۔بظاہر دنیا دار لیکن اندر سے اس دنیا سے نفرت کا جذبہ رکھے وہ اسی دنیا کی رنگینیوں میں جی رہی تھی۔وہ اکثر سوچا کرتی تھی کہ یہ دھند اس کے اندر زیادہ تھی یا باہر۔اس کی زندگی میں محبت کے بہت سے قصے موتیوں کی طرح جڑے تھے لیکن وہ آج بھی محبت کی تلاش میں ہے۔اسے کسی سے شدید محبت ہے لیکن کس سے وہ خود بھی اس سے واقف نہیں۔اس کا دل و دماغ اسی کشش و پیچ میں رہتا ہے کہ اسے کس سے محبت ہے۔محبت ہے بھی یا نہیں۔وہ یہ

سمجھنے سے بھی قاصر ہے کہ یہ عشقِ حقیقی ہے یا عشقِ مجازی۔اس کی روح اکثر اس محبت میں محوِ رقص رہتی ہے۔ وہ عشقِ حقیقی کی جانب دیکھتی ہے تو خود کو ان فٹ محسوس کرتی ہے۔اس نے تو کبھی ڈھنگ سے نماز تک نہیں پڑھی سر پر دوپٹہ تک لینے کی زحمت نہیں کی لیکن اگر یہ عشقِ مجازی ہے تو اس کا محور کون ہے ؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب وہ آج تک نہیں جان پائی۔ وہ نہ و درویش ہے اور نہ ہی مجذوب وہ دنیا داری میں ڈوبی ہوئی عورت ہے۔بظاہر لوگوں کی نظر میں وہ ایک بھٹکی ہوئی عورت ہے۔ وہ کوئی عام عورت نہیں ایک اعلیٰ عہدہ دار، دنیاوی طور پر کامیاب، دولتمند اور ایک سماجی کارکن کی حیثیت سے کام کرنے والی وہ معاشرے میں ایک مقام رکھتی تھی۔اس میں صرف ایک خوبی تھی کہ اس سے لوگوں کا دل دکھانے سے بہت خوف آتا تھا۔ایک سوشل لیڈی ہونے کی وجہ سے مختلف جگہوں پر آنا جانا رہتا تھا وہ مختلف لوگوں سے ملنا جلنا بھی اس کی زندگی کا حصہ تھا۔

اسی وادی میں جب وہ پہلی بار اس سے ملا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کی تلاش پایائے تکمیل کو پہنچ گئی ہے۔ایک فوجی افسر، جس کی کانچ سے نیلی آنکھیں، اعتماد سے بھرپور لہجہ، چوڑے شانے اور مضبوط جسم اس کی جانب کسی کو بھی مائل کرنے کے لیے کافی تھا۔اپنی اصل عمر سے کئی سال بڑا نظر آنے والا یہ شخص اس کی زندگی میں آنے والا وہ واحد شخص تھا جس نے اس سے متاثر کیا تھا۔

وہ اس کی جانب بے اختیار دیکھنے لگی تھی۔

سیاست سنبھالنا فوج کا کام نہیں ہے۔ فوج کا کام ہے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرنا، "اس زمین کے خطے کی حفاظت کرنا۔ ہمیں اس لیے جاگنا ہے کہ اٹھارہ کروڑ لوگ چین کی نیند سو سکیں۔" اعتماد سے بھرپور لہجہ، اس کے بے انتہا سچا ہونے کی علامت تھا۔ بہت سے لوگوں کے درمیان اس کی مستحکم آواز متاثر کن تھی۔

لیکن! مسٹر فوج ملک کے ہر معاملے میں ٹپک آتی ہے۔" چہرے پر مسکان سجائے شستہ" انگریزی میں بولتے ہوئے شانزے نے کہا

حارث۔ میرا نام حارث ہے۔" جواباً اس نے بھی مسکرا کر اپنا تعارف کرایا"

شانزے۔" شانزے نے بھی تعارف کرایا"

مس شانزے۔ یہ جو آپ لوگ آرام سے سوتے ہیں ناں آپ کی نیندوں میں ہم" جیسے لوگوں کی نیندیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ مجھے دیکھیے! میں پچھلے تیرہ برس سے نہیں سو پایا۔ میں سوتا ہوں تو مجھے اپنے تکیے سے خون کی بو آتی ہے۔ ان تمام لوگوں کے خون کی بو جو میری جگہ اپنی جان دیتے رہے اور میں ان ساتھیوں کی لاشیں اٹھاتا رہا۔" اس کے لہجے کی پختگی اور مضبوطی شانزے کو مبہوت کیے

دے رہی تھی۔

مسٹر حارث! یہ واقع ہی ایک مشکل کام ہے لیکن فوج کا بعض معاملات میں دخل بہتر نہیں۔" اب اس کا لہجہ قدرے پست تھا

مس۔ یہ کہنا آسان ہے لیکن یوں جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنے لوگوں کی حفاظت کرنا" اپنے ساتھیوں کو اپنے سامنے جان دیتے ہوئے خون میں لت پت دیکھنا اور پھر ان بیٹوں کی لاشوں کو ان کی ماؤں کے سامنے جا رکھنا آسان نہیں ہے۔ پھر جب آپ جیسے لوگ ہم جیسوں پر تنقید کرتے ہیں تو ہمیں اپنے حوصلے پست ہوتے نظر آتے ہیں۔اس دہشت گردی کی جنگ میں ہم میں سے کتنے شہید ہوئے آپ لوگ کیا جانیں۔آپ وہ لوگ ہیں جو دور بیٹھ کر صرف تنقید کر سکتے ہیں۔آپ لوگ ہماری کمروں پر دیوار کی طرح کھڑے ہونے کی بجائے ان میں چھرا گھونپ رہے ہیں۔" اس کے لہجے میں نہ جانے کتنے برس کا دکھ جھلک رہا تھا۔

وہ اس شخص کے دکھ کو اپنے اندر اترتا محسوس کر رہی تھی اس شخص کا پراعتماد لہجہ اس کے سچا ہونے کا پتہ دیتا تھا۔وہ اس کی آنکھوں میں ڈوبتی جا رہی تھی۔حارث سے اس کی کیفیت چھپی نہ تھی وہ بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بات کر رہا تھا۔کافی دیر کی گفتگو کے بعد انھوں نے موبائل نمبروں کا تبادلہ کیا اور دونوں ایک دوسرے کے دلوں پر انمٹ نقوش لیے اپنی اپنی منزلوں کو لوٹ گئے۔

وقت اپنی رفتار سے گزرتا گیا کہ چند دونوں بعد شانزے کو حارث کی جانب سے ایک مسیج موصول ہوا۔

مس شانزے کیسی ہیں آپ۔"؟ شانزے نے میسج کھولا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے" کانچ سی نیلی آنکھیں اور سچائی سے مزین چہرہ چھپاک سے آن کھڑا ہوا۔ اس نے مسیج کا جواب دیا اور اپنی جانب سے مدد کی آفر بھی کی۔ اس کے بعد ان کی اکثر میسج اور کال پر بات ہونے لگی۔ مختلف موضوعات لیے۔ ملکی مسائل سے لے کر عالمی افق میں ہونے والی تبدیلیوں پر۔ یہاں تک کہ شانزے کے اندر کی عورت جاگ گئی۔ عورت جس کا خمیر ہی محبت سے اٹھا ہے۔ عورت چاہے جتنی بھی سوشل ہو، جتنے بڑے عہدے پر فائز ہو جائے بظاہر کتنی ہی مضبوط کیوں نہ بن جائے محبت سے گندھی ہوتی ہے عورت کا دل ہمیشہ نرم رہا ہے مرد کی نسبت عورت ہر بات کو نہ صرف زیادہ گہرائی سے محسوس کرتی ہے بلکہ اس کے دل کی نرم زمین محبت کے پودے کو تناور درخت بنانے میں دیر بھی نہیں لگاتی۔

شانزے اظہار کے معاملے میں کبھی کنجوس نہیں رہی اس نے حارث سے بھی اپنے جذبات کو چھپانا مناسب نہ جانا۔ اس نے حارث کو فون کیا خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد اس نے کہا

"حارث میرے دل میں آپ کے لیے ایسے جذبات پیدا ہو چکے ہیں جنھیں آپ ساتھ رہنے کی خواہش کہہ سکتے ہیں۔"الفاظ کی سچائی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

"یہیں رک جاؤ۔ تم جو بھی کہہ رہی ہو مت کہو۔ میں جو کام کر رہا ہوں اس میں اس طرح کی کسی چیز کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میں آج تک تم سے بات کرتا رہا ہوں صرف ایک انسان کی حیثیت سے، جنس سے مبرا اور بالاتر۔" اس نے تلخی سے کہا

"کیا تم اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر یہ کہہ سکتے ہو کہ تمھارے دل میں میرے لیے کسی قسم کے کوئی احساسات نہیں ہیں؟"شانزے نے پر یقین لہجے میں کہا

"شانزے! مجھے مشکل میں مت ڈالو۔ میں تمام جذبات پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔"حارث کے لہجے میں تلخی سے زیادہ دکھ چھلک رہا تھا۔

"دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہو؟" شانزے نے پھر وہی سوال دھرایا

"میں نے کہا ناں۔ میرے لیے میرا فرض زیادہ اہم ہے۔ اپنی ذات سے کہیں زیادہ اہم۔ تمھیں سمجھ کیوں نہیں آتی۔"حارث کسی الوہی جذبے کے تحت کہہ رہا تھا۔ شاید وہ جذبہ اس عارضی محبت کے جذبے سے کہیں بڑھ کر تھا

حارث۔"شانزے کچھ کہنا چاہتی تھی۔"

"شانزے۔ میرے اور میرے فرض کے درمیان مت آؤ۔ میں تمھاری ذات کو اپنے سر پر سوار نہیں کر سکتا۔ تمھیں میرے راستے سے ہٹنا ہوگا۔ میری راہ کھوٹی مت

کرو۔ "اس کے لہجے میں سختی تھی

تم اتنے پتھر دل کس طرح ہو سکتے ہو ؟۔"شانزے نے کہا"

میں ہوں پتھر دل۔ اس لیے کہ اگر میں پتھر دل نہ ہوں تو اس ملک کی نا جانے کتنی" عورتیں بیوہ ہو جائیں، نہ جانے کتنی مائیں اپنے بیٹوں کو کھو دیں۔ میرے لیے ایک ذات اہم نہیں اس ملک کی ہر لڑکی کی عزت کی حفاظت اہم ہے۔ملک کے چپے چپے کی حفاظت " اس کے لہجے میں حب وطنی کا جذبہ کسی سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مار رہا تھا

کیا تم کہہ سکتے ہو کہ تمھارے دل میں کوئی جذبہ موجود نہیں ؟ " شانزے نے پھر" وہی سوال دھرایا۔ اسے یقین تھا کہ حارث کے دل میں بھی اس کے لیے یہی جذبات ہیں جو وہ محسوس کرتی ہے۔

جذبہ۔۔"یہ لفظ کہہ کر اس نے گہری سانس لی پھر یوں گویا ہوا۔"

ہاں۔ بتاؤ مجھے۔ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے ؟ شانزے نے اسرار کیا

میرے دل میں تمھارے لیے نرم گوشہ ضرور ہے۔ میں جذبات سے عاری نہیں۔ " میں بھی انسان ہوں لیکن میرے لیے کسی بھی چیز سے زیادہ اہم میرا فرض ہے۔ مجھے علم ہے کہ میری زندگی میں اس قسم کی کسی چیز کی گنجائش ہے ہی نہیں۔ مجھے معاف کر دینا۔شانزے۔" اس نے ایک گہری سانس لی اور فون بند کر دیا۔ شانزے کے سر پر گویا آسمان ٹوٹ پڑا، زمین آہستگی سے پاؤں کے نیچے سے سرک گئی۔ موبائل اس کے ہاتھ سے گر پڑا اور وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔اس کی تمام ہمت

اور حوصلہ جواب دے گیا

اسی لمحے شانزے کو محسوس ہوا کہباہر کی دھند تمام عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لی گی یا اس کے اندر کی دھند اس قدر بڑھ جائے گی کہ اندر اور باہر کی دھند آپس میں جاملیں گی۔ دھند آہستہ آہستہ پھیلنے لگی۔

حارث۔ یہ دھند مجھے کھا جائے گی۔ حارث۔" اس نے اپنی پوری قوت سے چیخ کر کہا" حارث۔۔"۔ وہ چیخ چیخ کر پکارنے لگی"

مجھے بچاؤ حارث۔مجھے بچا لو۔ تم تو محافظ ہو تو میری حفاظت کیوں نہیں کرتے "۔ وہ" چیختی رہی

لیکن یہ آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ دھند آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا جسم آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہونے لگا۔اس کے کانوں میں حارث کے جملے گونج رہے تھے اس نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔لیکن آوازیں متواتر آتی رہی اور یہ آوازیں بلند سے بلند تر ہوتی چلی گئی۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ شاید اس کا دم گھٹ جائے گا۔ دھند بڑھنے لگی یہاں تک کہ اس کے اندر کی دھند باہر کہ دھند سے جا ملی۔ چہار جانب دھند ہی دھند تھی اور اس دھندکے درمیاں قطرہ قطرہ اس کا جسم تحلیل ہونے لگا۔ وہ دھند میں تحلیل ہوتے اپنے جسم کو دیکھنے لگی۔اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔تکلیف کا احساس اس کے رگ وپے میں سرایت کر گیا۔ یہ ایک عجیب سا درد تھا جو اس کے جسم کی حدود سے نکل کر

اس کی روح تک میں اتر گیا تھا۔ ایک ایسا درد کہ وہ چاہتی تھی کہ نہ تو یہ درد کم ہو نہ زیادہ بس دھیما سا سلگتا رہے۔ کسی انگارے کی صورت جو نہ تو جل پاتا ہے نہ بجھ سکتا ہے۔ اس کی روح اس گیلے کاغذ کی مانند سلگنے لگی جس کو آگ لگی ہو لیکن وہ جل نہ پائے۔ پھر یوں ہوا کہ اس کی ذات ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بالآخر اس دھند میں مکمل تحلیل ہوتی چلی گئی۔ ایک ایک ٹکڑا اس کی آنکھوں کے سامنے کئی کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہوتا چلا گیا۔

اور فرض۔ فرض۔۔ چاروں جانب یہ لفظ گونجنے لگا اور اس کی روح اس لفظ کے گرد رقص کرنے لگی۔

داستاں کا حسن ٹھہرے داستاں ہونے کے بعد

میرے چہار جانب رونے دھونے کی آوازیں آ رہی تھی۔ میرا مردہ جسم گھر کے صحن میں لوگوں کے ایک ہجوم کے درمیان ایک چارپائی پر کفن میں لپٹا رکھا تھا۔بین کرتی ،برسوں سے ناراض بہن ، بھیگی پلکیں اور اداس چہرہ لیے وہ بیٹے جنھوں نے کبھی خود سے میری خیریت دریافت کرنا پسند نہیں کیا تھا اور اگر میں ان کو فون کرتا تو وہ مجھ سے بات کرنا تک گوارہ نہیں کرتے تھے۔، میری بہو جو میرے کمرے کے باہر سے گزرتے ہوئے کمرے میں آ کر میرا حال پوچھنے سے ہمیشہ گریزاں رہی۔اپنے بچوں تک کو مجھ سے ملنے کی اجازت نہ دی اور جب میں جاں بلب تھا تو وہ بناؤ سنگھار میں مصروف رہی۔تازہ مہندی سے رنگے بال لیے آج چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ میرا بڑا بیٹا جو مجھے اس لیے ملنا اس لیے گوارہ نہیں کرتا تھا کہ اسے محسوس ہوتا تھا کہ میں نے اس سے کوئی بھلائی نہیں کی آنسوؤں سے بھیگے چہرے کو رومال سے بار بار صاف کر رہا تھا۔اور وہ جو میرا حقیقی وارث تھا میرا چھوٹا بیٹا۔نم آنکھیں ، سرخ چہرہ لیے ، ابان پر سورۃ یٰسین کا ورد کرتے ہوئے میرے آخری سفر کی تیاریوں میں مصروف تھا۔وہ لوگ جنھوں نے مجھے دیکھا تک نہیں تھا وہ بھی رو رہے تھے۔کچھ لوگ اونچی آواز میں تلاوت کر رہے تھے۔میری بہن بین کرتے کرتے نڈھال ہو کر میرے مردہ جسم پر گر پڑی تھی۔اس کا بین

صرف ایک جملے پر مشتمل تھا۔ہائے میرا اکلوتا بھائی چلا گیا۔

میں ان سب سے بے نیاز چہرے پر مسکان سجائے ، اس غم پر حیران انھیں دیکھ رہا تھا میں حیران تھا کہ ان سب کو بھلا اتنا غم کیونکر ہوا کہ وہ اس طرح رونے لگے ۔۔ کبھی میرے دل میں خیال آتا کہ ان سب سے پوچھوں کہ اگر میں اتنا ہی اہم تھا تو میری زندگی میں پلٹ کر میرا حال تک کیوں نہیں پوچھا۔اگر یہ سب میری زندگی میں میر اخیال کرتے تو شاید میری زندگی میں کچھ دن اضافہ ہو جاتا۔لیکن اب یہ میری آواز سننے سے قاصر تھے ۔میں ان سب کو یوں روتے دیکھ کر بے زار ہونے لگا تھا۔ میرے جسم کو قریبا دو گھنٹے تک اسی طرح رکھا گیا۔

پھر چند منٹ کے بعد ایک مولوی ،گاؤں کے کچھ لوگ اور میرا سب سے چھوٹا بیٹا ، جس نے آخر وقت تک میرا خیال رکھا تھا سرخ آنکھیں لیے ، میری چارپائی کے گرد اکٹھے ہو گئے ۔ کسی نے اونچی آواز میں کہا، راستہ دیں میت کو غسل دینا ہے ۔

میری بہن کی آواز بلند ہونے لگی ۔مت لے کے جاؤ میرے بھائی کو۔ وہ مسلسل بین کر رہی تھی۔ میری بیوی اٹھنے سے قاصر تھی بنا کچھ کہے ۔میں اسے دیکھ

کر مسکرایا۔

میرا بیٹا اور گاؤں کا ایک اور لڑکا عورتوں کو پیچھے ہٹاتے میرے پاؤں کی جانب آ گئے ۔پھر سب نے مل کر میری چارپائی کو ایک الگ کمرے میں غسل کے لیے لے جانے کے لیے اٹھایا۔ میری بہن نہ جانے کتنے ہی برسوں سے مجھ سے نہ ملی تھی ، میں اس کا چہرہ دیکھنے کو بہتتر سا تھا۔ آج جب میری چارپائی اٹھائی گئی تو وہ میرے چارپائی کے پائے کے ساتھ لپٹ گئی ، نہ دوپٹے کا ہوش نہ لباس کا خیال ۔ ایک لڑکا آگے بڑھا اور بولا خالہ جی جانے دیں آگے ہی بہت لیٹ ہو چکے ۔

چند لمحوں میں میرے جسم کو اٹھا کر ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ ایک نیا سفید لباس کفن کی صورت ، غسل کے لیے ایک نئی صابن کی ٹکیہ موجود تھی ۔ میرا واحد لاڈلا بیٹا ، جو بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا ، میرے جسم کو غسل دینے لگا۔ میرے جسم کو غسلا کر ایک نئی چارپائی پر رکھ کر ارد گرد گلاب کی پتیاں ڈال دی گئی ۔ اور چارپائی پھر سے پنڈال کے بیچ میں لا کر رکھ دی گئی ۔ میری چارپائی پھر سیصحن میں رکھے جانے کی دیر تھی کہ باتیں کرتی عورتیں پھر سے بین کرنے لگی ۔ میرا لاڈلا نواسا بھی میری چارپائی کے پاس آن کھڑا ہوا۔ کبھی سر کی جانب سے ، کبھی پاؤں کی جانب سے میری چادر کو کھینچتا اور بار بار اپنی ماں سے

کہے

ماما ! ۔۔ نانا ابو اتنی دیر سے سو رہے ہیں کب اٹھیں گے ۔ پھر مجھے پکارے ۔ نانا ابو اٹھیں نا ۔ ماما ! نانا ابو کو جگائیں ناں ۔۔۔

میرا دل چاہا کہ اٹھوں اور ہمیشہ کی طرح اس کا منہ چوم لوں لیکن آج میں یہ خواہش پوری نہیں کر سکتا ۔ عورتیں اس کو پیچھے ہٹاتی اور بین کرتی رہتی رہی ۔

اب یہاں میرا دم گھٹنے لگا تھا میرا دل چاہا کہ جلد از جلد میرے جسم کو ان دکھاوا کرنے والے لوگوں کے بیچ سے اٹھا لیا جائے ۔ لیکن ساتھ ہی لوگوں کو ابھی بھی میرے اس بیٹے کا انتظار تھا جو ابھی تک نہیں پہنچ پایا تھا کہ شاید وہ میرا چہرہ دیکھنے ہی آ جائے ۔ لوگ اس بات سے ناواقف تھے کہ وہ جو کبھی میرے پاس اس لیے نہیں بیٹھا تھا کہ اسے مجھ سے بدبو آتی تھی ، دوائیوں کی ، الٹی کی اور بیماری کی وہ کس لیے میرے مردہ چہرے کو دیکھنے آتا ۔ اور میری یہ خواہش تھی کہ وہ میرا چہرہ نہ دیکھ سکے مبادا اس کہ بدبو اسے تنگ کرے گی ۔ اور وہ آ بھی نہیں پایا ۔

مولوی حضرات بار بار عورتوں کو میرے جسم سے دور ہٹنے کے لیے اونچی آواز میں منع کر رہے تھے ۔ اب میری نسل سورت یٰسین کی تلاوت کرنے لگی تھی ۔ ان کی

بھیگی آواز مجھے حیرت میں مبتلا کر رہی تھی ۔ میں اتنا اہم تو کبھی نہیں تھا کہ اس قدر غم زدہ ہوا جائے ۔ اب میں تھکنے لگا تھا۔ وقت جیسے تھم سا گیا تھا۔ ضنازے کا مقررہ وقت طویل سے طویل تر ہوتا جا رہا تھا چند لوگوں کے علاوہ ان ریاکاروں کے بیچ وقت گزرنا بے حد تکلیف دہ تھا۔

بالآخر یہ وقت کٹتے کٹتے کٹ ہی گیا۔ مولوی صاحب نے اعلان کیا کہ اب چارپائی اٹھائی جائیگی ۔ میں مسکرانے لگا

! آہ ! سکون ! ایک ابدی سکون

میری بہن ، میری بہویں اونچی آواز میں چلانے لگی اور میری بیٹیوں کو چیخ چیخ کر کہنے لگی کہ باپ کو روک لو۔ میں حیران تھا کہ میرے مردہ جسم کی اب ان کو کیا ضرورت ہے اور یہ کیونکر ممکن ہے ۔

چند لوگمیری چارپائی کو اٹھاکا کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے جنازہ گاہ کی طرف چلے ۔ میری بہن جو مجھ سے کبھی ملنے کی روادار نہ تھی آج میری میت کے پیچھے بھاگ رہی تھی کہ کسی نے اسے پکڑ کر روکا۔ وہ زمیں پر بیٹھتی چلی گئی ۔ ساتھ ہی باقی عورتیں بھی روتے روتے چپ کر گئی اور میری بین کو دلاسا دینے لگی ۔

میری میت کو جب دفنانے کا وقت آیا تو صرف ایک بیٹے کہ جو کہ میرا حقیقی وارث تھا اس نے میرے جسم کو سہارہ دیا باقی بیٹے نہ جانے کہاں گئے۔وہ میری لحد میں مجھ سے پہلے اترا میرے جسم کو سہارا دے کر مجھے میری ابدی آرامگاہ میں اتار دیا۔

دن گزرتے گئے۔ میری نسل کئی روز تک غریبوں میں کھانے کی دیگیں بانٹتے رہی ۔عورتیں روز رات کو آتی اور میری بیوی کے گلے لگ کر بہت سے دن روتی رہیں ۔میری بہوئیں تسبیح ہاتھ میں لے کر روتی رہی لیکن ان کا یہ سوگ منانا، رونا دھونا میری زندگی میں کئے گئے.برے سلوک کا نعم البدل نہیں تھا۔

آج میں اس تمام داستان کا مرکزی کردار تھا۔ایک ایسا کردار جو اپنی ہی زندگی کی بازی اپنوں کے رویوں کی بدولت ہار گیا تھا۔ میں داستاں کا حسن تو تھا مگر داستاں ہونے کے بعد

ویلنٹائن ڈے: اظہارِ بے شرمی کا دن

فروری کے مہینے کے آغاز کے ساتھ ہی تقریبا پوری دنیا میں ویلنٹائن ڈے کو منانے کی تیاریوں کا آغاز ہو جاتا ہے۔ یہ دن فروری کی چودہ تاریخ کو پوری دنیا میں محبت کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے جس میں محبت کا ثبوت پیش کرنے کے لئے نوجوان لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کو تحائف دیتے ہیں۔ سرخ رنگ کے لباس اور سرخ رنگ کے تحائف کو اس دن سے مخصوص کیا جاتا ہے۔ 14 فروری کی آمد کے ساتھ ہی پورے ملک میں تقریبا ہر دکان پر سرخ رنگ کے تحائف، اور غبارے نظر آنے لگتے ہیں۔ آج سے چند برس پہلے تک پاکستان میں یہ دن اس طرح سے نہیں منایا جاتا تھا ۔ لیکن نجی ٹی وی سٹیشنز نے اس دن کی تشہیر کی جس کی وجہ سے عام لوگوں میں بھی یہ دن منایا جانے لگا۔ اور اب اس دن صبح سے لیکر شام گئے تک ٹیل ویژن پر تقریبا ہر چینل اس دن کی مناسبت سے نہ صرف پروگرام بنائے جاتے ہیں بلکہ سپیشل ٹرانسمشن کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ میڈیا عوام کی سوچ پر بہت حد تک اثر انداز ہوتا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان جیسے اسلامی ملک میں اس طرح کی غیر اسلامی اور غیر شرعی تقریبات کو منانا نہ صرف عام ہوتا جا رہا ہے بلکہ عوام ان تقریبات میں بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لینے لگے ہیں۔ اس کا اندازہ فروری کے آغاز سے ہر گلی محلے سے لیکر بڑے بڑے سٹورز تک میں سرخ رنگ اور

"love سرخ رنگ کے تحائف، خاص الخاص سفید بھالو پر سرخ رنگ سے کندہ لفظ
you " نظر آنے لگتا ہے۔ تحائف کی دوکانوں کو خاص طور پر سرخ رنگ سے سجایا جاتا
ہے۔ اس دن کو منانے والوں میں نوجوان نسل پیش پیش نظر آتی ہے۔ مغربی تہذیب
کی تقلید کے دلدادہ یہ نوجوان جو ترقی کا معیار ہر طرح کی اقتدار سے آزادی کو سمجھتے ہیں
وہ اس دن کو منانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ 14 فروری کو نجی سطح پر پارٹیوں کا
انعقاد کیا جاتا ہے اور اس دن کی تقریبات کو ہر طبقہ بالخصوص پوش طبقہ میں کروفر کے
ساتھ منایا جاتا ہے۔

اس دن کی تقریبات باضابطہ آغاز تیرہویں صدی میں سینٹ ویلنٹائن کی یاد میں کیا گیا
جس نے غیر قانونی طور پر فوجیوں کی شادیاں کروائیں اور غیر قانونی طور پر عورت اور
مرد کے تعلقات کو نہ صرف جائز قرار دیا بلکہ اس نے غیر قانونی طور پر لڑکے لڑکیوں
کے ملنے اور تحائف کا تبادلہ کرنے کو جائز قرار دیا جس کی پاداش میں فروری ہی کے
مہینے میں اسے پھانسی دے دی گئی۔ تیرویں صدی کے آغاز سے 14 فروری کو محبت
کرنے والوں کے دن کے طور منایا جانے لگا۔ پہلے پہل یہ دن چند ہی ممالک میں منایا
جاتا تھا جن میں فرانس، امریکہ اور مغربی ممالک قابلِ ذکر ہیں لیکن اب ویلنٹائن ڈے
تقریباتمام دنیا میں منایا جانے لگا ہے۔ اور اس دن کی تقریبات منانے میں مسلمان مما
لک بھی شامل ہیں۔

فروری کے مہینے کے آغاز سے ہی اس بحث کا آغاز شروع ہو جاتا ہے کہ ویلنٹائن ڈے منایا جائے یا نہیں ۔ نوجوان نسل اس ابہام کا شکار ہے کہ یہ دن کسی سے بھی حقیقی محبت کے اظہار کے طور پر منایا جا سکتا ہے یا نہیں ؟ یہ بحث ہر سال کسی بھی حتمی نتیجے پر پہنچے بنا ختم ہو جاتی ہے۔ کسی بھی تہوار کو منانے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ وہ تاریخی اور تہذیبی اعتبار سے کس قوم سے متعلق ہے اور اس کے معاشرے پر کس قسم کے اثرات مرتب ہوں گے ۔

اسلامی لحاظ سے دیکھا جائے تو کوئی بھی غیر اسلامی تہوار منانا جائز نہیں۔ اسلام میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ کون کون سا تہوار منایا جائے اور کس تہوار کو منانا جائز نہیں ۔اس میں کسی قسم کے ردوبدل کی اجازت نہیں ہے ۔ اسلام میں تہوار ، ذاتی خیالات کے تحت نہیں بلکہ ایک مجموعی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ابنِ تمیہ نے فرمایا

تہوار قانون ، اور مذہبی تہوار وہ ہیں جن کو منانا اللہ نے جائز قرار دیا۔ جو کہ سب کے لیے ایک سے ہیں کسی کا ذاتی خیال ان میں ردوبدل نہیں کر سکتا۔ قرآن پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے

) ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے قانون بنایا اور کشادہ راہِ عمل بنائی ۔

(سورت المائدہ : آیت ۴۸

اس سے مراد یہ ہے کہ ہر قوم کے لیے الگ تہوار مقرر کیے گئے ہیں۔ مسلمانوں کو یہ جائز نہیں کہ کسی قوم کی پیروی کریں۔۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا۔

ہر قوم کی اپنی عید ہوتی ہے اور مسلمانوں کی یہ عید (سال میں دو بار) ہے۔

بلکہ مسلمانوں کو کافروں کے ساتھ مماثلت اختیار کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔اس تہوار کا تعلق تاریخی طور پر خالصتاً عیسائیوں اور یہودیوں ہے اور مسلمانوں سے اس کا کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ویلنٹائن ڈے اگرچہ عیسائیوں کا مذہبی تہوار نہیں تاہم تاریخی اعتبار سے اس تہوار کا سلسلہ عیسائی پادری سینٹ ویلنٹائن سے ملتا ہے۔ مغربی ممالک میں ویلنٹائن ڈے کو شادی یا نکاح سے ہٹ کر محبت کے دن کے طور پر منایاگیااور محبت کو جنسی بے راہ روی سے منصوب کر دیا گیا۔ جس کے نتیجے میں بے حیائی اور اخلاقیات میں تنزلی معاشرے میں عام ہونے لگی۔ بعد ازاں عیسائی مذہبی رہنماؤں نے بھی اس دن کو منانے کی مخالفت کی اور اسے روکنے کے لیے سفارشات بھی پیش کی۔

کچھ لوگوں کا سوال کرتے ہیں کہ کسی سے پیار، محبت کے جذبات کا اظہار کس طرح سے غلاط ہو سکتا ہے؟

اول تو یہ دن کسی سے حقیقی محبت کے اظہار کے طور پر نہیں منایا جاتا۔ بعض نوجوان اس دن کو حقیقی محبت کے اظہار کے طور پر منانا چاہتے ہیں جو کہ غلط ہے۔ اس دن کو منانے کے آغاز سے لے کر آج تک اس محبت کے اظہار کے طور پر منایا جاتا ہے جو کسی بھی رشتے پر مبنی نہ ہو۔ اور اس اظہار میں کسی قسم کی کوئی روک ٹوک نہ ہو۔ اسلام میں بنا نکاح کے کسی قسم کے جنسی تعلقات کی اجازت نہیں۔

اسلام عورت اور مرد کو میاں بیوی کے رشتے میں باندھتا ہے اور ان دونوں کے درمیاں محبت کو جائز قرار دیتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ تمام سال یہ دونوں ایک دوسرے سے اچھا سلوک کریں۔ جتنا اسلام رشتوں کے مابین محبت، عزت و احترام کو فروغ دیتا ہے اتنا کوئی اور مذہب فروغ نہیں دیتا۔ اسلام میں محبت کو صرف ایک رشتہ تک محدود نہیں کرتا بلکہ ہر رشتے کے لیے محبت کا اظہار ضروری قرار دیتا ہے۔ محبت کے اظہار کے لیے ایک کسی ایک دن کا مخصوص کر دینا کسی طور جائز نہیں۔

حدیث پاک میں ارشاد ہوتا ہے تم میں سے بہترین وہ ہے جو اپنے اہلخانہ کے لیے بہترین ہے۔ گویا اسلام اظہارِ محبت کیلیے معاشرتی دائرے مقرر کرتا ہے تاکہ ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا جا سکے جس میں ہر شخص کو اخلاقیات کا پاس ہو۔ معاشرہ بے حیائی اور بے راہ روی سے پاک ہو۔

اسلام ہر اس کام کی ممانعت کرتا ہے جس سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہونے کا خدشہ ہو۔ اسلام محبت کو محدود نہیں کرتا بلکہ لامحدود کرتا ہے۔ پھر محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس کا اظہار صرف ایک دن تک محدود کر دینا بالکل ایسا ہی جیسے دریا کو گلاس میں محدود کر دینے کی کوشش کی جائے۔

یہ کیسا اسلام ہے؟

شہر اقتدار سے متصل علاقے میں ایک مسجد کے اوپر لگے بورڈ نے میری توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ بورڈ پر کچھ اس طرح کی تحریر تھی۔

اس مسجد میں اہلسنت وجماعت کے علاوہ کوئی جماعت امام صاحب کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتی۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کاروائی کی جائے گی ۔ بحکم مسجد انتظامیہ

ایک مسجد پر لگے اس طرح کے بورڈ نے جہاں مجھے حیران کر دیا وہاں یہ سوچنے پر مجبور بھی کر دیا کہ کیا ایک مسلمان کو اللہ کے گھر میں داخل ہونے کے لیے بھی اجازت لینا ہو گی ؟۔ اللہ کے سامنے جھکنے کے لیے مسلمان ہوتے ہوئے بھی دوسرے انسان سے اجازت لینا ہوگی۔ ؟ حیرانی کی بات یہ ہے کہ یہ مسجد ایک مسلمان ملک کی ہے جسے اسلام کا قلعہ کہا جاتا ہے۔ یوں ایک بورڈ کا مسجد کے صدر دروازے کے قریب اس طرح کے بورڈ کا آویزاں ہونا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس عمل کی روک تھام کے لیے نہ تو حکومتی سطح پر اور نہ ہی انفرادی سطح پر کوئی اقدامات کیئے گئے۔۔ اور اس طرح کے بورڈ کا مسجد کے باہر

آویزاں ہونا تو ایک عام سی مثال ہے اس طرح کے بورڈ جگہ جگہ مسجدوں پر آویزاں نظر آتے ہیں ۔ یہ بورڈ ہی نہیں بلکہ ایک فرقہ دوسرے فرقہ کو اسلام سے خارج قرار دیتا ہے ۔ اکثر و بیشتر ایک فرقہ کے علماء دوسرے فرقہ کے خلاف بیان دیتے نظر آتے ہیں ۔ ان بیانات کی وجہ سے دو مکتبہ فکر رکھنے والے مسلمانوں کے درمیان نہ صرف دوریاں بڑھتی ہیں بلکہ ایک فرقے کی دوسرے فرقے کے خلاف نفرت جنم لیتی ہے ۔ صرف علماء ہی نہیں جہاں بھی دو الگ فرقوں کے مسلمان کسی دینی مسئلہ پر بحث کرتے ہیں تو ایک دوسرے کو غلط قرار دیتے ہیں ۔ یہاں تک کہ دوسرے کو کافر تک کہنے سے گریز نہیں کرتے ۔ اب تو نوبت یہاں تک آگئی ہے کہ ٹیلی ویژن پر سر عام صحابہ کرام اور صحابیاتِ کرام ، امہات المومنین کی شان میں گستاخی کردی جاتی ہے ۔ جو کہ سراسر غلط ہے ۔ سیاسی کارکن اور قائد ایک دوسرے پر لعنت بھیجتے اور دوسروں کو اسلام سے خارج قرار دیتے نظر آتے ہیں ۔ اس طرح کے بیانات جلد یا بدیر تصادم کا سبب بنتے ہیں ۔ ان بورڈز اور فرقہ پرستی کے چھوٹے چھوٹے واقعات بعد میں مختلف فرقوں کے مابین محبت کی بجائے نفرت اور دوری کا سبب بنتے ہیں اور اگر ان چیزوں کا تدارک نہ کیا جائے تو انجام تصادم کیصوررت میں نکلتا ہے ۔

فرقہ پرستی کا آسیب صرف ہمارے ملک کو ہی نہیں پوری دنیا کے مسلمانوں کو جکڑے ہوئے ہے ۔ یہ ایک ایسا رویہ ہے جس نے ہماری نسلوں تک میں سرائیت کرتا

جا رہا ہے۔ میری بات ایک فوجی افسر سے ہوئی جن کے دوست آوری کوسٹ کے سرکاری دورہ سے واپس آئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ اور ان کے ایک دوست (جن کا تعلق شیعہ برادری سے تھا) مسجد میں ایک ساتھ نماز پڑھنے کے لیے داخل ہوئے۔ دونوں نے اپنے اپنے طریقہ سے نماز کا آغاز کیا۔ (شیعہ برادری کا طریقہ نماز، دوسرے فرقوں سے الگ ہے) وہ تکبیر کے بعد ابھی بامشکل قیام تک پہنچے تھے کہ مسجد کے دو داروغہ مسجد میں داخل ہوئے، ان کے شیعہ ساتھی کو ٹانگوں سے کندھوں پر اٹھایا اور اٹھا کر مسجد سے باہر چھوڑ آئے۔ واقعہ سنانے والے کہتے ہیں کہ وہ نماز کے دوران یہ سوچ رہے تھے کہ ابھی ان کو بھی ہی مسجد سے اٹھا کر باہر پھینک دیا جائے گا۔ یہ اللہ کا گھر تھا جس کے اندر سے اللہ کے سامنے جھکے ہوئے مسلمان کو اٹھا کر اس لیے باہر پھینک دیا گیا کہ وہ اس مسجد میں نماز ادا کرنے والی جماعت سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ فرقہ پرستی اس وقت امتِ مسلمہ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ اور اس سے بھی بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کا آغاز اور دوسرے فرقوں سے نفرت کا آغاز اس مسجد سے ہوتا ہے جو کہ اتحاد و یگانگت کا مظہر و منبع ہیں۔ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اس جانب کوئی دھیان دینے کو تیار نہیں۔

ہمارے ملک میں اگرچہ ابھی تک اس حد تک حالات خراب نہیں تاہم اب مساجد کے باہر واضع طور پر مسلک یا فرقہ کا نام لکھا ہوتا ہے۔ اگر فرقہ پرستی کا

آغاز مسجد سے ہو تو یہ دین اسلام کی خدمت نہیں بلکہ اسلام کے ساتھ دشمنی ہے۔یہ مسلمانوں کے خلاف ایک قبیح سازش ہے کہ بجائے مسلمانوں کو بیرونی دشمنوں اور سازشوں کے خلاف متحد کرنے کے انھیں اندر سے توڑا اور فرقوں میں بانٹا جا رہا ہے ۔اگر مسلمان یونہی فرقوں میں بٹ کر ایک دوسرے سے لڑتے رہے،اور مرتے رہے تو کسی اور کو ہم سے جنگ کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔فرقوں میں بٹ کر مسلمان کبھی ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتے۔اسلام فرقہ پرستی کی شدت سے مذمت کرتا ہے۔قرآنِ پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے -

جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے یقیناً ان سے تمھارا کوئی واسطہ نہیں۔ان کا معاملہ تو اللہ کے سپرد ہے۔وہی ان کو بتائے گا کہ انھوں نے کیا کیا؟ (الانعام:159)

مسلمان چاہے وہ کسی بھی فرقے سے ہو۔چاہے وہ کوئی بھی انفرادی سوچ رکھتا ہو ہے تو مسلمان۔یہ تمام فرقے صرف اور صرف انفرادی سوچ کے نتیجے میں عمل میں آتے ہیں۔یہ فرقے،،برادریاں صرف پہچان کے لیے ہیں۔اسلام کی بنیاد ایک ہی ہے۔ایک اللہ اور ایک رسول ﷺ۔فرقے صرف اور صرف سوچ کا ایک فرق ہیں جو اگر حد سے بڑھ جائے تو اس کے ہولناک نتائج برآمد ہوتے ہیں۔قرآن میں ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے -

لوگو ! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ در حقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ پرہزگار ہے۔ در حقیقت اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔ (سورت حجرات: 13)

حضرت امام ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا

ایک دوسرے کے ساتھ حسد نہ کرؤ، کساد بازی بازاری نہ کرؤ، ایک دوسرے کی نفرت سے بچو، ایک دوسرے کو دھوکانہ دو، تفرقہ میں نہ پڑؤ اور بھائی بھائی بن جاؤ۔

مساجد کا ہمارے معاشرے میں ایک اہم مقام ہے۔ اگر ایک مسجد کے دروازے دوسرے فرقہ والوں کے لیے بند ہیں تو ملک میں فرقہ پرستی کا عام ہونا کوئی اچھنبے کی بات نہیں ہے۔فرقہ پرستی کا خاتمہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اس کا آغاز انفرادی سطح سے نہ ہو جائے خصوصا مساجد سے۔ کیونکہ مساجد وہ واحد جگہ ہیں جہاں ہر روز لوگ پانچ وقت اکھٹے ہوتے ہیں اور بالخصوص جمعہ کی نماز کے لیئے کثیر تعداد میں جمع ہوتے ہیں۔ اس لیے مساجد کو کسی صورت میں فرقہ پرستی حصہ نہیں لینا چاہیے۔ بلکہ مساجد سے اتحاد کا پیغام عام ہونا چاہیے۔

آج دنیا بھر میں محکوم ہیں ، ظلم کا شکار ہیں اس کی بنیادی وجہ مسلمانوں کا آپس میں متحد نہ ہونا بھی ہے ۔اگر مسلمان متحد ہو کر ان طاقتوں کا مقابلہ کریں جو اسلام کے خلاف.بر سر پیکار ہیں تو کوئی طاقت ایسی نہیں جو ہمارا مقابلہ کر سکے ۔ دین اسلام کی بقا اور ترقی مسلمانوں کے اتحاد سے مشروط ہے ۔

سفید اور بھورے رنگ کی ایک بلی نہ جانے کتنے عرصے سے ہماری گلی میں رہتی تھی۔ دفتر جانے کے لیے مجھے گلی سے باہر سڑک تک پیدل آنا پڑتا ہے۔ دفتر کی گاڑی مجھے سڑک سے پک کرتی ہے۔ میں ہر روز اپنے سٹاپ پر گاڑی کے انتظار میں کھڑی جب ہوتی تو سڑک پر آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھنے کی بجائے اس بلی کو دیکھتی رہتی۔ وہ بلی مجھ سے اور میں اس سے مانوس ہوتی جارہی تھی۔اس کے اور میرے درمیاں ایک ان دیکھا رشتہ بنتا جارہا تھا۔ کم و بیش ایک ماہ پہلے کی بات ہے، ٹریفک زیادہ ہونے کی وجہ سے میرے آفس کی وین معمول سے کچھ زیادہ لیٹ تھی۔ وہ بلی ہمیشہ کی طرح نالی کے کنارے اگے پودے کی جڑ میں بیٹھی تھی۔ میں ہمیشہ کی طرح اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی اسی اثناء میں وہ آہستگی سے اٹھی اور میری جانب بڑھی۔ میں اپنی جگہ کھڑی اسے دیکھ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرے پاس سے گزر جائے گی لیکن وہ میرے پاس آکر میرے پاؤں چاٹنے لگی میں نے اپنے پاؤں ہلکے سے پیچھے ہٹائے۔ وہ بھی غیر محسوس طریقے سے آگے بڑھ آئی اور بدستور میرے پاؤں چاٹتی رہی۔مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے پاؤں اس امید پر چاٹ رہی ہے کہ شاید میں اسے کچھ کھانے کے لیے دوں گی یا اسے اٹھاؤں گی۔ شاید وہ بھوکی تھی یا کم از کم مجھے محسوس ہوا کہ وہ بھوک کی وجہ سے میرے

پاؤں چاٹ رہی ہے۔ میں چاہنے کے باوجود اسے کچھ نہ دے پائی کیونکہ میرے پاس کچھ تھا ہی نہیں دینے کو۔ مجھ سے ناامید ہو کر وہ کچھ دور پڑے پتھر کو چبانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہاں سے ناکام ہونے کے بعد وہ پھر میری طرف پلٹی میں نے تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ ایک شرمندگی کا احساس میرے رگ وپے میں سرائیت کر گیا۔ میں نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ کیٹو! میرے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ اس نے میری ٹانگ پر اپنا سر رگڑا۔ میں کسی بھی مجرم کی طرح اپنی جگہ ساکن تھی۔ وہ ایک مایوس نگاہ مجھ پر ڈال کر پھر سے پودے کی جانب چل دی۔ اسی لمحے میرے دفتر کی گاڑی بھی آ گئی اور میں بھی اپنی منزل کی جانب عازمِ سفر ہو گئی۔ میرا پورا دن ایک احساس شرمندگی اور احساسِ جرم میں گزرا۔ میرے اندر کی لڑکی بار بار مجھے شرمندہ کرنے کو آن کھڑی ہوتی۔ سارا دن میں اس احساسِ جرم تلے دبی رہی کہ میں نے ایک بے زبان کو نہ چاہتے ہوئے بھی ناامید کیا۔ اگرچہ میرے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا پھر بھی میں شرمندہ تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس بلی کے لیے کل کچھ نہ کچھ لے کر آؤں گی۔ اگلے دن میں اسی نیت سے اپنے بیگ میں روٹی کا ٹکڑا لے آئی۔ اس دن میں سٹاپ پر کھڑی اپنی گاڑی سے زیادہ اس بلی کا انتظار کر رہی تھی لیکن وہ نہیں آئی۔ میں نے روٹی کا ٹکڑا گلی کے کنارے یہ سوچ کر رکھ دیا کہ وہ بلی جب بھی آئے گی کھا لے گی۔ میں اگلے دن بھی روٹی کا ٹکڑا لے آئی لیکن جب گلی کے کنارے پر گذشتہ کل والے ٹکڑے کو دیکھا تو وہ روٹی اسی طرح پڑی تھی

بس ایک جانب سے چیونٹیوں کی غذا بنے اس ٹکڑے کا بیشتر حصہ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ اس ٹکڑے کو دیکھ کر ایک شدید دکھ نے مجھے آن گھیرا کہ کہیں وہ بلی کل بھوک کے مارے مر تو نہیں گئی۔ میں افسوس کرنے لگی کہ کاش میرے پاس کچھ ہوتا۔ اس دن کے بعد کافی دن تک میں نے اس کو نہیں دیکھا۔ میری آنکھیں اسے نالی کے کنارے لگے پودے کی جڑ میں، گلی کے ہر کونے میں اس بلی کو تلاش کرتی رہی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ وہ بلی مر چکی ہے اس کے ساتھ ہی ایک انجانا دکھ بھی کہ میں اس کو کچھ نہ دے سکی جبھی وہ مر گئی۔ کافی دنوں بعد وہ بلی مجھے نظر آئی تو میں مسکرانے لگی۔ شکر ہے کہ یہ زندہ ہے اس نے ایک روکھی نگاہ مجھ پر ڈالی اور پلٹ گئی جیسے کہہ رہی ہو کہ جب مجھے تم کچھ دے نہیں سکتی تو تمھارے ساتھ میرا تعلق ہی کیا؟

بظاہر یہ ایک عام سا واقعہ ہے لیکن اس واقع نے میرے دل و دماغ کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اس دنیا میں بستی تمام مخلوق کسی نہ کسی طور، کسی نہ کسی غرض سے بندھی ہے۔ چاہے وہ غرض جذباتی ہو، مالی یا روحانی۔ اور اس غرض کو پورا کرنے کے لیے وہ دوسروں کی محتاج ہے۔ ہمارے ارد گرد پھیلے رشتے، دوست ہمارے سہارے کے محتاج ہیں اور بالکل اسی طرح ہم ان کے سہارے کے محتاج ہیں۔ درخت، چرند پرند، انسان سب ایک دوسرے سے جڑے ہیں۔ ایک کی ضرورت دوسرے کی وجہ سے پوری ہوتی ہے، ایک کا وسیلہ دوسرا بنتا ہے۔ اس بلی کی طرح

اگر کوئی مدد کے لیے ہمارے پاس آتا ہے تو ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اس کی حتیٰ المقدور مدد کریں۔ اگر کوئی کسی کی جانب صرف ضرورت کے لیے دیکھتا ہے تو یہ اس شخص کی خوش قسمتی ہے کہ اللہ نے اپنی پوری مخلوق میں سے اس کو دوسرے کی مدد کے لیے چنا ہے۔ مدد تو درحقیقت اللہ ہی کرتا ہے لیکن وہ کسی کو اس کام کے لیے چن لیتا ہے۔

دوسروں کے ساتھ احسان سے پیش آنا ایک مسلمان کے لیے بہت بڑی سعادت بھی ہے اور اس کا دینی فریضہ بھی۔ جو شخص کسی کے ساتھ بھلائی کرتا ہے، احسان سے پیش آتا ہے اس کی مدد اللہ کرتا ہے اور اسکے ہر کام کو پورا کرنے کے لیے اپنی جناب سے وسیلہ بناتا ہے۔ قرآنِ پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے

(بے شک احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ نہیں۔) سورت الرحمٰن ۔آیت 60

اگر آپ اپنے ارد گرد پھیلے رشتوں کو مالی، روحانی یا جذباتی سہارا نہیں دیں گے تو ایک وقت آئے گا جب وہ آپ کو چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ اگر چھوڑ کر نہ بھی جائیں گے تو مدد کے لیے آپ کی جانب نہیں دیکھیں گے۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ آپ کی ذات سے کوئی مایوس نہ ہو۔

اگر آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو ہمیشہ سہاروں کی تلاش میں رہتے ہیں تو پوری زندگی بھی گزر جائے آپ کو مستقل سہارا نہیں ملے گا۔ اس لیے ضرورت اس امر کی

ہے کہ سہارا ڈھونڈھنے کی بجائے کوشش یہ کریں کہ آپ خود دوسروں کا سہارا بن جائیں۔ یہ سوچ بنا کہ آپ کو شاید اس طرح کا سہارا نہ ملے جس طرح کا آپ چاہتے ہیں یا جس طرح کا آپ نے کسی کو دیا۔ بس بانٹے جائیں۔ مدد کرنے اور آسانیاں بانٹنے سینہ صرف دوسروں کی زندگیوں میں بہتری آتی ہے یا مشکلات میں آپ کی وجہ سے کمی آئے بلکہ آپ کی عاقبت سنور جائے۔ کوئی شخص آپ کی ذات کی وجہ سے اپنے اندر حالات سے لڑنے کا حوصلہ پاتا ہے تو اس کے دل سے بے اختیار آپ کے لیے دعا نکلتی ہے اور یہ بے اختیار دعا قبولیت کے اس درجے پر ہوتی ہے جہاں دعائیں رد نہیں ہوتی۔ معاشرے کو مضبوط بنانے کے لیے باہمی رشتوں کو مضبوط بنانا ضروری ہے اور رشتوں کو مضبوط بنانے کے لیے آپ کو اپنے اندر سے انا کو ختم کرنا ہوگا۔ بغض اور کینہ کو اپنے دلوں سے نوچ پھینکنا ہوگا۔

اگر معاشرے کا ہر فرد دوسروں کے لیے سہارا بننے کی کوشش کرنے لگے اور حسد کی بجائے دوسروں کی مدد کرنے تو ہمارے اسی فیصد مسائل از خود حل ہو جائیں۔ اگر ہر صاحبِ حیثیت شخص اپنے گردونواح میں موجود غریبوں کا خیال کرنے لگیں تو تھر جیسی صورتِ حال کبھی پیش نہ آئے۔ کبھی کوئی بچہ بھوکا نہ مرے، کبھی کسی ہسپتال میں دواؤں کی کمی نہ ہو اور جرائم کی شرح میں نمایاں کمی ہو جائے۔ اگر صرف اتنا ہی ہو جائے کہ ہر شخص از خود دوسرے کی مدد کرنے لگے

تو پورے معاشرے میں آسودگی کا دور دورہ ہو جائے اور معاشرہ ایک فلاحی معاشرہ بن جائے ۔مدد کرنا، سہارا بننا دراصل ایک انفرادی رویہ ہے۔

اس رویے کو اپنانے کے آپ کو کسی ابن مریم، کسی حکمران ، کسی سیاست دان کی ضرورت نہیں بلکہ یہ ایک ایسا رویہ ہے جو کہ اجتماعی طور پر معاشرے کی ترقی اور خوشحالی کا ضامن ہے۔

تہمت ۔ بظاہر چھوٹا لیکن گناہ کبیرہ

معاشرے میں تیزی سے پھیلتی برائیوں میں سے ایک برائی تہمت ہے ۔ تہمت سے مراد کسی نیک شخص کے بارے میں ایسی غلط باتیں پھیلانا ہے جو اس نے نہیں کی ۔اگرچہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے لیکن ہمارا معاشرے میں ہر شخص دوسرے کو نیک یا بد قرار دینے میں مصروف ہے حالانکہ گناہ و ثواب کا فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اور صرف اللہ کا ہے ۔دوسروں کی غلطیوں کی نشاندہی کرنا اور کسی کے بارے میں بات کرنا بے حد آسان کام ہے۔۔ دن بدن یہ رویہ ہمارے معاشرے کا ایک عمومی رویہ بنتا جا رہا ہے کہ دوسروں کے عیبوں کو نہ صرف کریدا جاتا ہے بلکہ ان کی تشہیر بھی کی جاتی ہے جبکہ یہ سراسر غلط ہے۔بنا تحقیق کئے کسی بھی کے بارے میں کچھ بھی کہہ دینا ہمارے معاشرے کا خاصہ ہے ۔ہم میں سے زیادہ تر کو دوسروں کے عیب کریدنے میں ملکہ حاصل ہے ۔ہرایک اپنے عیب چھپانے کی کوشش میں دوسروں کے عیبوں پر بات کرنا چاہتے ہیں۔دوسروں میں عیب نکالنا، کسی پر انگلی اٹھانے اور تنقید کو لوگ اپنا حق سمجھنے لگے ہیں ۔چاہے جس پر انگلی اٹھائی جا رہی ہو وہ انگلی اٹھانے والے سے کہیں بہتر ہو۔ہم میں سے ہر شخص دوسروں کی اصلاح میں مصروف ہے لیکن اپنی اصلاح کرنا پسند نہیں کرتا۔دوسروں کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی اصلاح کرے۔

ہمارے معاشرے میں خصوصا عورتوں کو تہمت کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ عورتیں خود بھی دوسری عورتوں کو تہمت کا نشانہ بنانے سے گریز نہیں کرتی ۔ کسی کے بارے میں بنا تحقیق بات کرنا سراسر گناہ ہے ۔یہ عادت لوگوں کے دلوں میں نفرت اور تعلقات میں دوری پیدا کرتی ہے اور اسلام اس کی شدت سے مخالفت کرتا ہے ۔قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ عورتوں کے بارے میں حکم دیتا ہے ۔

" اے لوگو ! عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔"

مزید ارشاد ہوتا ہے۔ "اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں پھر چار گواہ پیش نہ کر سکیں تو تم انھیں اسی کوڑے لگاؤ اور کبھی ان کی گوہی قبول نہ کرو۔اور یہی لوگ بدکار ہیں ۔ بے شک وہ لوگ جو ان پارسا عورتوں پر جو (برائی کے تصور سے بھی) بے خبر اور ناآشنا ہیں تہمت لگاتے ہیں وہ دنیا اور آخرت (دونوں) جہانوں میں ملعون (ہیں اور ان کے لیے زبردست عذاب ہے۔" (سورت : نور

ایک حدیث نبوی ﷺ کچھ یوں ہے ۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا۔ "کیا تم جانتے ہو کہ غیبت کیا ہے ۔؟؟" صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ "اللہ اور اس کا رسول ﷺ زیادہ جانتے ہیں ۔" آپ ﷺ نے فرمایا۔" کسی کے پیٹھ پیچھے اس کے

بارے میں ایسی بات کہنا جو اسے ناپسند ہو تو یہ غیبت ہے۔"ایک سائل نے عرض کہا کہ" اگر وہ ناپسندیدہ بات اس کے اندر موجود نہ ہو پھر ؟؟" آپ نے جواب دیا۔"اگر وہ ناپسندیدہ بات اس میں ہے تو یہی بات غیبت ہے اگر وہ بات اس میں نہیں ہے تو بہتان ہے (مسلم "

مولانا وحید الدین خان فرماتے ہیں۔"جب بھی آپ کوئی بات کسی سے کہیں تو یہ سوچ کر کہیں کہ آپ کی بات سننے والے کان تک پہنچنے سے پہلے اللہ تک پہنچ رہی ہے ۔یہ احساس اگر زندہ ہو جائے تو اس کے بعد غلط کلام یا بے فائدہ کلام کا خاتمہ ہو جائے۔ "

علامہ زرقانی (شرح موطا امام مالک) میں ایک بڑا عجیب واقعہ لکھاہ کہ مدینہ منورہ کے گرد و نواح میں ایک عورت فوت ہوئی اسے دوسری عورت غسل دینے لگی، جو عورت غسل دے رہی تو اس کا ہاتھ مری ہوئی عورت کی ران پر پہنچا تو اس کی زبان سے نکل گیا۔ میری بہنو! (جو عورتیں ساتھ بیٹھی ہوئی تھی) یہ عورت آج مر گئی اس کے تو فلاں آدمی سے تعلقات تھے۔ غسل دینے والی عورت نے جب یہ کہا تو قدرت کی طرف سے گرفت میں آ گئی اس کا ران پر چمٹ گیا، وہ کھینچتی ہاتھ مردہ کے جسم سے جدا نہ ہوتا۔ یہاں تک کہ کافی دیر ہو گئی میت کے ورثاء نے کہا۔ بی بی جلدی غسل دو، شام ہونے کو آئی ہے ہمیں جنازہ پڑھ

کرکے اس کو دفن کرنا۔ وہ کہنے لگی۔ میں تمھارے مردہ کو چھوڑتی ہوں یہ مجھے نہیں چھوڑتا۔ میت کے ورثاء مسجد کے مولوی کے پاس یہ مسئلہ لے کر گئے۔ مولوی نے فتویٰ دیا: یا تو غسل دینے والی عورت کا ہاتھ کاٹ دیا جائے یا مردہ کا جسم۔ عورت اور مردہ دونوں نے ورثاء نے گوارانہ کیا کہ عورت کا ہاتھ یا مردہ کا جسم کاٹا جائے۔ اسی طرح تین دن گزر گئے، عورت کا ہاتھ میت کے جسم سے جدا نہ ہوا۔ گرمی کا موسم تھا تین دن بعد لاش گلنے سڑنے لگی اور یہ بات آس پاس کے دیہاتوں میں پھیلنے لگی۔ یہاں تک کہ معاملہ حضرت امام مالک (جو کہ اس وقت مدینہ منورہ میں مقیم تھے) کی خدمت میں پہنچا۔ امام مالک نے فرمایا: مجھے وہاں لے چلو۔ جب وہاں پہنچے، پردے کے پیچھے سے غسل دینے والی عورت سے پوچھا: بی بی! جب تیرا ہاتھ چمٹا تو تم نے کچھ کہا تھا۔ اس عورت نے سارا واقعہ حضرت امام مالک کے گوش گذار کیا۔ امام مالک نے پوچھا۔ بی بی! جو تو نے تہمت لگائی اس کے چار چشم دید گواہ ہیں؟ اس نے کہا۔ نہیں۔ فرمایا: کیا اس نے خود تیرے سامنے اقرار کیا تھا؟ کہنے لگی نہیں۔ انھوں نے پوچھا۔ پھر تم نے اس مردہ پر کیوں تہمت لگائی؟ وہ کہنے لگی۔ میں نے اس لئے کہہ دیا تھا کہ وہ گھڑا اٹھا کر اس کے دروازے سے گزر رہی تھی۔ حضرت امام مالک نے اس وقت سورت نور کی آیت ۴ کی تلاوت فرمائی اور فرمایا۔ میں وقت کا قاضی القضاۃ حکم دیتا ہوں کہ اس عورت کو اسی کوڑے لگائے جائیں۔ جلادوں نے کوڑے لگانا شروع کئے اس کا ہاتھ اس وقت تک چمٹا رہا جب تک اسی

کوڑے پورے نہ ہو گئے۔جب اسی کوڑے پورے ہوئے تو اس کا ہاتھ خود بخود مردہ سے جدا ہو گیا۔

یہ واقعہ اگرچہ ایک غیر معروف واقعہ ہے اور اس کی سچا ہونے یا سچا نہ ہونے پر بھی اعتراز کیا جاسکتا ہے۔تاہم اس واقع سے ثابت ہوا کہ جب ایک مردہ پر تہمت لگانے کی اتنی بڑی سزا ہے تو زندہ عورت پر تہمت لگانا کتنا بڑا گناہ ہے۔تہمت چاہے کسی بھی صورت میں لگائی جائے اس کے لیے قرآن میں سزا مقرر ہے۔اور یہ سزا ملزم کو ضرور ملنی چاہیے تاکہ باقی لوگ اس سے سبق سکھیں گے۔

ہمارے معاشرے کا ایک عمومی رویہ ہے کہ جہاں بھی چند لوگ اکٹھے ہوتے ہیں وہاں کسی نہ کسی کی برائی کی جاتی ہے۔یہ رویہ آپ کو ہر جگہ نظر آئے گا چاہے وہ کوئی گلی محلہ ہو،اور بات کرنے والے جاہل ہوں یا پھر کوئی دفتر ہو،اور بات کرنے والے دنیاوی تعلیم میں اعلیٰ وارفع ہوں۔کسی کے کردار پر بات کرنے سے نہیں چوکتے۔اور بنا تحقیق کے بات نہ صرف کر دی جاتی ہے بلکہ آگے بھی پھیلائی جاتی ہے۔جس کی وجہ سے لوگ گرہوں میں بٹ جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی مخالفت کرنے لگتے ہیں ۔دلوں میں نفرتیں سر اٹھانے لگتی ہیں اور لوگ ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں ۔دفاتر میں کام کرنے والے اور خصوصا کسی مجبوری کے تحت کام کرنے والی خواتین اس رویے کا شکار زیادہ ہوتی

ہیں۔
کسی دانا نے کیا خوب کہا ہے کہ اپنے خیالات کی حفاظت کرو، یہ تمھارے الفاظ بن جاتے ہیں اور اپنے الفاظ کی حفاظت کرو یہ تمھارے اعمال بن جاتے ہیں۔
بات کرتے ہوئے ہمیں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے کہ کہیں ہمارے الفاظ ہمارے اعمال کو ضائع نہ کر دیں اور ہماری لاپرواہی میں کی گئی بات کہیں کسی کی زندگی کی تباہی کا شاخسانہ نہ بن جائے۔ کسی کے بارے میں بات کرنے اور خصوصا کسی کے کردار کے بارے میں بات کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔

وجودِ زن سے ہے کائنات میں رنگ

میرا یہ کالم خصوصا ان تمام خواتین کے نام ہے جنھوں نے اپنی زندگیاں اپنے خاندان ،اپنے اہل وعیال کے لیے وقف کر دیں ہیں ۔ان تمام عورتوں کے نام جنھوں نے اپنی محنت سے خود کو عالمی سطح پر منوایا ہے ۔ان تمام ماؤں کے نام جنھوں نے اپنی جوانیاں اپنی اولاد کے نام کر دیں۔ جو ہر ظلم اپنی ذات پر سہتی ہیں لیکن اپنے بچوں پر آنچ نہیں آنے دیتی ۔ان کے بچے ان کے ساتھ چاہے جیسا مرضی سلوک کریں وہ جب ماں کو پکارتے ہیں تو ماں انھیں معاف کر دیتی ہے ۔ جو اپنے بچوں کو خوشیاں دینے کی خاطر بڑے سے بڑے طوفانوں سے ٹکرا جاتی ہیں ۔ان تمام بیٹیوں کے نام جو اپنے باپ ، بھائیوں کی عزت پر قربان ہو جاتی ہیں اور اپنے باپ اور بھائیوں کی خدمت میں دن رات جتی رہتی ہیں ۔ ان تمام بہنوں کے نام جو اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ کھڑی ہو کر ترقی کی دوڑ میں ان کا ساتھ دیتی ہیں یہاں تک کہ بعض بہنیں اپنی وراثت میں ملنے والے ترکے تک کو اپنے بھائیوں کے نام کر دیتی ہیں ۔ ان تمام بیویوں کے نام جو اپنے شوہروں اور سسرال والوں کا ہر اچھا ،برا رویہ برداشت کرتی ہیں لیکن اس کی مونس و غم خوار رہتی ہیں ۔اس کے گھر کی حفاظت اور اس کی نسل کی تربیت کرتی ہیں ۔الغرض عورت اپنے ہر روپ میں محبت اور ، قربانی کا دوسرا نام ہے۔ اور اس قربانی

اور محبت کے صلے میں وہ عزت اور محبت چاہتی ہے۔

عورت معاشرے کا وہ 52% حصہ ہے جس کی وجہ سے 48% مکمل ہے اور ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ عورت کے بغیر معاشر کی بقاء، نسل انسانی کی بقاء ناممکن ہے۔ یہ عورت ہی ہے جو کسی بھی معاشرے کی اگلی نسل کی امین ہوتی ہے۔ نیپولین نے کیا خوب کہا تھا تم مجھے پڑھی لکھی مائیں دو میں تمھیں بہترین قوم دوں گا۔

اگر غور کیا جائے تو درحقیقت عورت ہی نسلوں کو بگاڑنے یا سنوارنے کی ذمہ دار ہے۔ اگر عورت اپنی ذمہ داری سے آگاہ ہے اور اپنی ذمہ داری کو احسن طریقے سے نبھانے کی صلاحیت رکھتی ہے تو وہ نسلوں کو سنوارنے کا موجب بن سکتی ہے کہا جاتا ہے۔ اور اگر عورت اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ نہیں ہے یا اچھے طریقے سے نبھا نہیں پا رہی تو اگلی نسل کو دین سے بے بہرہ رکھے گی۔ عورت جس حدتک دین دار ہو گی اسی حدتک وہ دین کو، ادب واحترام کو اگلی نسل میں منتقل کرے گی۔ کسی بھی شخص، ملک، معاشرہ کی ترقی، مذہب سے قربت، دوری، اقدار کی منتقلی کا دارومدار عورت پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی داناء نے کہا خوب کہا جس نے ایک مرد کو تعلیم دی اس نے ایک فرد کو تعلیم دی اور جس نے ایک عورت کو تعلیم دی اس نے ایک نسل کو تعلیم دی۔ عورت دنیامیں تخلیق

انسانی کی ذمہ دار ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے "ڈرو اس اللہ سے جس کے واسطے سے سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور قرابتوں میں تقویٰ اختیار کرو۔ (سورت نساء۔ آیت ا)

حدیث بنوی ﷺ میں ارشاد ہوتا ہے۔ اے لوگو! عورت کے معاملے میں اللہ سے ڈرو اور ان کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرو(مشکات شریف)

عورت کے مقام کا اندازہ یہاں سے لگا لیجئیے کہ عورت کو نبی نہیں بنایا گیا لیکن نبیوں کی ماں کی حیثیت کے طور پر جنت ان کے قدموں تلے رکھ دی گئی۔

حدیث پاک ﷺ میں ارشاد ہوتا ہے کہ جنت ،ماؤں کے قدموں تلے ہے۔

اسلام میں عورت کا مقام یہ ہے کہ عورت کے حقوق کی خاطر رب تعالٰی ایک پوری سورت (سورت نساء ، پارہ ۵) اتار دیتا ہے۔ عورت کا یہ مقام ہے کہ رحمت العالمین ﷺ ، رحمت دوجہاں ﷺ جب اپنی والدہ ماجدہ کی قبر مبارک پر جاتے ہیں تو آپ ﷺ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں۔ اور آپ ﷺ رونے لگتے ہیں۔ جب حضرت خدیجہؓ کی بہن (حضرت ہالہؓ) نبی پاک ﷺ کے گھر تشریف لاتی ہیں تو آپ

ﷺ ان کے احترام میں کھڑے ہو جاتے ہیں، آپ ﷺ اپنی ازواج کو اونٹ پر سوار کراونے کیلیے اپنے گھٹنے کو سہارا بناتے ہیں اور زوجہ وجہ وجودِ کائنات ﷺ کے گھٹناء مبارک پر اپنا پاؤں رکھ کر اونٹ پر سوار ہوتی ہیں۔ اپنی بیٹی حضرت فاطمہ الزہراؓ کی خاطر اپنی چادر بچھا دیتے ہیں۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد ان کے اہل وایال اور ان کی سہیلیوں کی خبر گیری کرتے ہیں اور انھیں قربانی اور صدقہ میں سے حصہ عنایت کرتے ہیں۔

عورت کے حقوق پر بنی ہوئی تنظیموں اور عورت کے حقوق پر بات کرنے والوں کو چاہیے کہ عورت کے حقوق کا اسلام کی رو سے مطالعہ کریں۔ اگر وہ حقوق جو اسلام نے عورت کو دیے وہ آج کی عورت کو دیے جائیں تو دنیا جنت کا نمونہ پیش کرے اور کسی تنظیم، کسی بل، کسی قرارداد کی ضرورت نہ رہے۔ مسائل وہاں پیدا ہوتے ہیں جہاں عورت کو اسکے جائز حقوق سے بھی محروم رکھا جاتا ہے۔ اس پر بے جا بوجھ تو ڈال دیا جاتا ہے لیکن اس کو سپورٹ نہیں کیا جاتا۔ اور اس رویہ صرف مردوں کا نہیں بلکہ خود عورتوں کا بھی ہے۔ عورت کو اسلام وہ مقام دیتا ہے جو کوئی اور مذہب نہیں دیتا اور جس کی وہ حق دار ہے۔ اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے وراثت میں عورت کا حصہ مقرر کیا اور عورت کی وراثت کے بارے میں قوانین واضع کیے۔ اسلام کے علاوہ کسی مذہب میں عورت کی وارثت کے بارے میں کوئی حقوق واضع نہیں کیے گئے۔ اسلام عورت کو ماں، بہن، بیٹی

اور بیوی کی حیثیت سے عزت واحترام اور بلند مقام دیتا ہے۔ اسلام عورت کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔

نبی پاک ﷺ نے خاص طور حکم فرمایا کہ جن سواریوں پر عورتیں سوار ہوں ان کو آہستہ آہستہ دوڑاؤ کہ یہ کانچ کی صراحیاں ہیں۔انھیں ٹھیس نہ لگ جائے گویا عورت سے نرم رویہ، محبت اور احترام کے ساتھ پیش آیا جائے۔اسلام عورت کو کسی کام کرنے سے نہیں رکتے دیتا بلکہ ہر چیز کی ایک حد مقرر کرتا ہے۔قرونِ اولی میں عورتیں تجارت میں باقاعدہ حصہ لیتی رہی، اسلام کے ابتدائی دور کے غزوات میں عورتیں عملا شامل رہیں۔ اور اس کی شمولیت کے احکامات بھی واضع کیے گئے۔ اسلام عورت کو پابندِ سلاسل نہیں کرتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ عورت اپنی ذمہ داریوں (اولاد کی تعلیم و تربیت، گھر کی ذمہ داری،) کو پہچانے اور اس کو پورا کرنے کی کوشش اس کی اولین ترجیح ہونا چاہیے۔

8 مارچ پوری دنیا میں خواتین کے حقوق کے عالمی دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ لیکن صرف ایک دن کے طور پر منالینا کافی نہیں ہے۔ معاشرے کو مثلِ جنت بنانے کی خواہش رکھنے والے 48% کو اپنے ساتھ چلنے والے 52% حصہ کو سپورٹ کرنا ہوگا ۔ کیونکہ مرد اور عورت دونوں ہی ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں اگر ایک پہیہ دکھ یا ظلم کا شکار ہوگا تو دوسرا پہیہ کبھی بھی اپنی ذمہ داریاں

احسن طریقے سے نبھانے کے قابل نہیں رہے۔ ایک بہترین معاشرے کی تعمیر کے لیے عورت اور مرد دونوں کا ایک دوسرے کا ساتھ دینا از حد ضروری ہے۔

پیوستہ رہ شجر سے

کرکٹ ورلڈ کپ شروع ہوتے ہی پورے ملک میں ایک جوش و جذبہ نظر آتا ہے۔ ملک کے طول و عرض میں ہر شخص کرکٹ کے بارے میں بات کرتا اور رائے دیتا نظر آتا ہے۔ ورلڈ کپ سے پہلے ہی پوری قوم کو اپنی کرکٹ ٹیم سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں جن پر موجودہ ٹیم پورا نہیں اتر پائی۔ بہترین ٹیموں کے ساتھ کھیلتے ہوئے ہماری ٹیم نہ صرف بری طرح ناکام ہوئی بلکہ جیت کے لیے کوشش کرتی بھی نظر نہیں آئی۔ قومی کرکٹ ٹیم کے چیف سلکٹر معین خان کسینو میں پائے گئے جبکہ قومی کرکٹ ٹیم چاہے وہ باؤلنگ ہو، بیٹنگ ہو یا پھر فیلڈنگ ہر شعبے میں مسلسل ناقص کارکردگی کا مظاہرہ کرتی رہی۔ سب سے اہم چیز جو ان میچوں میں دیکھنے کو ملی وہ یہ تھی کہ قومی کرکٹ ٹیم واضع طور پر بٹی ہوئی نظر آئی۔ ٹیم سپرٹ کہیں موجود نہ تھی۔ ہر میچ کے بعد ہار کا سبب ٹیم کے کپتان کو قرار دیا جاتا رہا۔ لیکن کپتان تو کپتان کوئی کھلاڑی بھی انفرادی سطح پر کوئی بھی کھلاڑی وہ کارکردگی پیش نہ کر سکا جس کی قوم کو امید تھی۔ کسی بھی میچ کو جیتنے کے لیے ہر کھلاڑی کو انفرادی کارکردگی کو بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ ٹیم کو اجتماعی طور پر ایک ددوسرے کا ساتھ دینا چاہیے،۔ ٹیم سپرٹ کوئی بھی میچ جیتنے کے لیے ایک ضروری چیز ہے۔ کرکٹ ایک ایسا کھیل ہے جس میں اچھی انفرادی کارکردگی اور ٹیم

سپرٹ دونوں ہی برابر اہم ہیں۔ ہار جیت تو کھیل کا حصہ ہے لیکن کم از کم جیت کے لیے محنت اور کوشش لازم ہے۔ایک دوسرے پر الزام تراشی کی بجائے ہر ایک کو اپنی غلطیوں، اپنی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

دوسروں پر الزام لگانا، اپنی کارکردگی پر توجہ نہ دینا جبکہ کوتاہیوں اور ناکامیوں پر دوسروں کو الزام دینا، یہ رویہ صرف کرکٹ میں نہیں پورے معاشرے کا ایک عمومی رویہ بنتا جارہا ہے۔چاہے وہ سیاست ہو، قومی یا صوبائی اسمبلی ہو، ٹاک شوز ہوں، یا کوئی سرکاری دفتر کوئی شعبہ بھی اس رویے سے مبرا نہیں۔ دوسروں پر تنقید کرنا خود عمل کرنے سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ اور دوسروں پر تنقید کرتے ہوئے کوئی بھی یہ نہیں دیکھتا کہ ان کی اپنی کارکردگی کا گراف کہاں پر ہے۔

اگر سیاست کے میدان پر نظر دوڑائیں تو کم و بیش ہر پارٹی سے تعلق رکھنے والے سیاست دان خود کام کرنے کی بجائے ایک دوسرے پر الزام تراشی کرتے اور کوتاہیوں کے لیے دوسروں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہر سیاست دان دوسروں کی ذاتیات سے لے کر اخلاقیات تک پر تنقید کرتا ہوا پایا جاتا ہے۔دوسروں پر کیچڑ اچھالنے سے گریز نہیں کرتے اور بعض اوقات اخلاقی حدود کی پروا بھی نہیں کرتے۔ ہر ایک طبقہ ایک دوسرے کے بارے میں نہ صرف اس طرح کی

باتوں کو برا نہیں سمجھتے بلکہ اکثر و بیشتر ایک دوسرے کی ذاتیات کے بارے میں بات کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔ کسی کی عزت کو اچھالنا چاہے وہ عام آدمی ہو یا کوئی لیڈر، وہ کوئی بھی ہو، آج کل ہمارے معاشرے کا خاصہ بنتا جا رہا ہے اور اس تمام میں میڈیا پیش پیش ہے۔ اس طرح کے پروگرام آج کل آپ کو ہر چینل پر ملیں گے۔ حکومت ہے تو وہ ہر مسئلے، تمام اداروں میں نااہلی اور کرپشن کا ذمہ دار کا موجب سابقہ حکومت کو قرار دیتی ہے۔ سابقہ حکومت نے تو جو کیا سو کیا؟ سوال تو یہ ہے کہ ابھی جو اہلِ اقتدار ہیں وہ کیا کر سکتے ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ حکومت نے کون سے بحران کا مستقل حل نکالا ہے؟ اس بارے میں کوئی بھی حکومتی نمائندہ بات کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ یہی حال اپوزیشن کا ہے۔ اپوزیشن، حکومت کو الزام دیتی نظر آتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ نے کیا کام کیا؟۔ لیکن نہ تو حکومت اور نہ ہی اپوزیشن عوام کی فلاح و بہبود کے لیے عملی اقدام کرنے کو تیار ہے۔

ملکی سلامتی کے بڑے بڑے مسائل کو لے لیجیئے مثلاً پینے کا صاف پانی، بجلی وغیرہ۔ ان مسائل کا حل روزِ روشن کی طرح عیاں ہے لیکن یہ مسائل اس وقت تک حل ہو ہی نہیں سکتے جب تک کہ انھیں حل کرنے کے لیے عملی اور ٹھوس اقدامات

نہ کیے جائیں۔ ہمارے ہاں کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جو الزام تراشی اور لفاظی کی نظر نہ ہو گیا ہو۔ ہر مسئلے کے آغاز پر تو اس پر بے انتہا بحث کی جاتی ہے۔ ہر اخبار میں وہ مسئلہ شہ سرخی کی صورت میں نظر آتا ہے ہر ٹی وی چینل پر اس مسئلہ پر گھنٹوں پر محیط ٹاک شوز بنائے جاتے ہیں۔ بحث برائے بحث میں وہ مسئلہ وہیں کا وہیں رہ جاتا ہے اس کا نہ تو کوئی اس حل نکلتا ہے اور نہ ہی اس مسئلے کے حل کی جانب کوئی خاطر خواہ پیش رفت ہوتی ہے۔ بیشتر ملکی سلامتی کے اہم فیصلے سیاسی اختلافات کی نظر ہو کر کھٹائی میں پڑ جاتے ہیں اور سالوں گزر جانے کے باوجود ان فیصلوں پر عملدرآمد نہیں کیا جاتا اس کی سب سے بڑی مثال کالا باغ ڈیم کی تعمیر ہے جو کئی سال گزر جانے کے باوجود آج تک نہیں بنایا جا سکتا۔ اس منصوبے پر بیش بہا پیسہ خرچ کیا جا چکا ہے کئی بار اس پر اٹھنے والی لاگت اور اس سے ہونے والے نقصانات اور فوائد کا تخمینہ لگایا جا چکا ہے لیکن اس ڈیم کی تعمیر کا آغاز تک نہیں کیا جا سکا اور اس کی وجہ صرف اور صرف سیاسی اختلافات ہیں۔ ہماری ملکی پالیسی اور فارن پالیسی کی یہی کمزوری ہے کہ جب ہم بگلھیار ڈیم (انڈیا میں بنایا جانے والا وہ ڈیم جو پاکستانی دریاؤں پر بنایا جا رہا ہے۔) کا مقدمہ عالمی سطح پر بلند کرتے ہیں تو ہم ہار جاتے ہیں کیونکہ سندھ طاس کے معاہدے کے مطابق پاکستان کو اپنے دریاؤں پر 50 سال کے اندر سو کے قریب ڈیم بنانا تھے جو ہمیشہ سیاسی محاذ آرائی کا شکار ہوتے رہے اور نہ بن سکے اور آج ہم بجلی کے

بحران کا سامنا کر رہے ہیں۔

یہ اسی الزام تراشی اور لفاظی کی جنگ کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ تو تھر کے بھوک سے بلکتے ہوئے جان کی بازی ہارتے ہوئے بچوں کے لیے کیا جا سکا اور نہ ہی بارشوں کے بعد آنے والے سیلاب کی تباہ کاریوں کو روکنے کے لیے کچھ کیا جا سکا۔ حکومت اور اپوزیشن دونوں ہی اشتہارات اور غیر اہم منصوبوں پر تو بے بہا پیسہ لٹا رہے ہیں لیکن اسی پیسے سےملکی سلامتی کے منصوبوں کے لیے کچھ کرنے کو تیار نہیں۔ اگر اشتہارات پر پیسہ لگانے کی بجائے ان مسائل کے حل پر پیسہ لگایا جائے تو اس پارٹی کو اشتہار لگوانے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔۔ عوام کے مسائل پر ہر نیوز چینل کئی کئی گھنٹے کے ٹاک شوز چلا کر اپنی ریٹنگ تو بڑھوا سکتا ہے لیکن اس کا عوام کو قطعاً کوئی فائدہ نہیں پہنچ پاتا۔ ہر پارٹی سے تعلق رکھنے والے کارکن اور سیاست دان ان ٹاک شوز میں گھنٹوں لمبی بحث کرتے ہیں جبکہ مہینے، اور سال گزر جانے کے باوجود عوامی مسائل جوں کے توں رہتے ہیں۔ ملک، ایک کے بعد دوسرے بحران کا شکار ہوتا چلا جا رہا ہے اور کوئی اس جانب ٹھوس عملی اقدام کرنے کو تیار نہیں ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں وسائل کی کوئی کمی ہے۔ اگر ماہرین ارضیات کی رپوٹوں کو دیکھا جائے تو پاکستان وسائل سے مالا مال ایک ایسا ملک ہے جس

کے اگر اپنے وسائل کا 10 % فی صد حصہ ہی کام میں لایا جائے تو اس ملک کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ اور اس کے لیے کسی بھی عالمی ادارے کی ضرورت نہیں۔ پاکستان کے پاس پاکستان اٹامک انرجی کمشن جیسا ادارہ موجود ہے۔ اس کے ذمہ ملکی وسائل کو تلاش کرنے اور ان کو کام میں لانے کا کام دیا جانا چاہیے اور اگر مالی مجبوریاں آڑے آئیں تو چین یا سعودی عرب جیسے ملک ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ توجہ طلب امر صرف یہ ہے کہ یہ سب نیک نیتی سے کیا جائے اور کرپشن اور سیاست سے پاک ہو۔ ہمارے ملک کا بے بہا وسائل کے باوجود ترقی کی راہ میں کئی ممالک سے بہت پیچھے ہونا صرف یہ بات کا مظہر ہے کہ ملکی بقاء کے مسئلوں کو بھی فائلوں اور سیاسی محاذ آرائی میں جھونک دیا جاتا ہے اور اس سیاسی محاذ آرائی میں وہ مسئلہ جوں کا توں فائلوں میں بند ہو کر الماریوں کی زینت بن جاتا ہے۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی ذرخیز ہے ساقی

حضرت داتا گنج بخش کا فرمان ہے۔

سارے ملک کا بگاڑ تین گروہوں کے بگڑنے پر ہے۔ حکمران جب بے عمل ہوں، علماء جب بے عمل ہوں اور فقیر بے توکل ہوں۔

تمام امت مسلمہ خصوصاً اگر اپنی ارضِ وطن پر نظر ڈالیں تو ہمارا معاشرہ بھی بگاڑ کی جانب مسلسل مائل ہے۔جس کی بنیادی وجہ حکمرانوں کا بے عمل ہونا، علماء کا بے عمل ہونا قابلِ ذکر ہے۔ یہاں ہر ایک گفتار کا غازی تو ہے لیکن عمل سے بے بہرہ۔ ہر گزرتا دن ہمارے معاشرے کو پہلے سے زیادہ ابتری کی طرف لے کر جا رہا ہے۔ اگر حضرت داتا گنج بخش کے فرمان کو مدِ نظر رکھا جائے تو ہمارے معاشرے کے تینوں گروہ ہی اپنی اپنی جگہ بگڑتے چلے جا رہے ہیں اور ان کے سدھرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ۔ارضِ وطن میں بدعنوانی اور کرپشن اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ تقریبا تمام ادارے اس دلدل کی نذر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس بدعنوانی اور کرپشن کو ختم کرنے کے لیے کوئی طبقہ کارفرماء نہیں ہے۔ جمہوریت کے نام پر جاگیردارانہ نظام آج بھی رائج ہے ۔ملک میں نسل در نسل چلتی ہوئی سیاست اور حکمرانی نے ملکی ترقی کو ایک مخصوص پیمانے سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ لینڈ مافیا اور بڑھتی ہوئی غنڈا گردی نے ملک میں خوف وہراس کی

فضاء کو پروان چڑھایا ہے۔جس کی وجہ سے غیر ملکی سرمایہ کاری میں خاطر خواہ کمی واقع ہوئی ہے۔ایک طرف تو دہشت گردی کے خلاف جنگ اور خود کش بم دھماکوں میں ان گنت جانیں بھینٹ چڑھ چکی ہیں تو دوسری طرف تھر میں موت کے مہیب سایے جھٹنے کا نام نہیں لے رہے۔ان گنت اموات نے ملک میں ایک سوگ کی سی فضاء برپا کر دی ہے۔تعلیم ہے تو وہ ایک مخصوص طبقہ سے منسوب ہو چکی ہے۔جبکہ بہت سے علاقوں میں پینے کا صاف پانی تک میسر نہیں ہے۔اگر حالات کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا جائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ تمام کے تمام مسائل خالصتاً انتظامی مسائل ہیں اور ناقص انتظامی حکمتِ عملی کی وجہ سے ابھی تک حل نہیں ہو پائے۔اگر انتظامی کارکردگی بہتر ہو جائے تو یہ مسائل مہینوں میں نہیں بلکہ دنوں میں حل ہو جائیں۔ان انتظامی مسائل کو حل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اقتدار کو نچلی سطح پر منتقل کیا جائے۔ضلع اور تحصیل کی سطح پر مسائل حل کیے جائیں۔

اگر اس سرزمین سے وابسطہ لوگوں کی ذہانت اور اس سرزمین میں موجود وسائل پر نظر دوڑائیں تو یہ بات حیران کن ہے کہ تحقیق سے ثابت ہوا کہ یہاں ہر نئے پیدا ہونے والے بچے کی ذہانت کا معیار پچھلی نسل سے 50% بلند ہے۔یہاں کے لوگوں کی ذہانت دنیا کے کسی بھی اور خطے کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔پاکستانی دنیا کے ہر بڑے ادارے کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہیں۔جس کی سب سے بڑی

مثال دنیا کی سب سے بڑی خلائی تحقیقاتی کمپینی ں ناساہ کے اعلیٰ ترین عہدے پر پاکستانی نژاد سائنس دان کا فائز ہونا بھی ہے ۔ افواج پاکستان نہ صرف دنیا کی بہترین افواج میں سے ایک ہیں بلکہ اسلامی ممالک کی افواج میں سب سے مضبوط اور سب سی بڑی فوجی قوت ہیں ۔ صرف افواج ہی نہیں ، پاکستان ارفع کریم اور علی معین نوازش جیسے بچوں کی سرزمین ہے جنھوں نے انتہائی کم عمری میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کے میدان میں عالمی سطح پر اپنی ذہانت کا لوہا منوایا ۔ یہ نائلہ عالم اور یاسمین درانی جیسے لوگوں کی سرزمین ہے جنھوں نے انسانیت کے لیے کام کرکے وائٹ ہاؤس سے ایوارڈ حاصل کیا ۔ نثار برنی اور عبدالستار ایدھیی جیسے لوگ بھی اسی ملک کا حصہ ہیں ۔ جو انسانیت اور خدا ترسی کا ایک روشن مینار ہیں ۔ صرف یہی نہیں اس سرزمین کے ہنر مند پوری دنیا میں اپنے ہنر کے لیے ایک مخصوص پہچان رکھتے ہیں ۔

صرف انسانی وسائل ہی نہیں یہ زمین قدرتی وسائل سے بھی مالا مال ہے ۔ یہاں ان قدرتی وسائل کی بہتات ہے جو کہ قرب و جوار کے ممالک کو نصیب نہیں ۔ اس سرزمین کے پھل (آم ، مالٹا ، خشک میوہ جات) اور چاول پوری دنیا میں اپنی مثال نہیں رکھتے ۔ اس وطن کے پاس تمام کے تمام موسم ، پہاڑ ، دریا ، صحرا ، ریگستان ، بندرگاہیں ، نیم آباد ، گنجان آباد ہر طرح کی زمین موجود ہے ۔ دنیا کے سب سے طویل اور سب سے بلند ترین پہاڑی سلسلے ہوں ، سرد ترین علاقہ

ہو یا گرم ترین ، بہترین سیر گاہیں ہوں یا قدیم ترین تہذیب کی باقیات سبھی کا تعلقزمین کے اسی ٹکڑے سے ہے۔ضرورت ہے تو صرف اتنی کہ ان سیر گاہوں کو عالمی سطح پر روشناس کروایا جائے۔ ملک میں امن وامان کی صورتحال بہتر بنائی جائے تاکہ دوسرے ممالک کے سیاح یہاں آسانی سے آسکیں۔ سیاحت سے ملک کو کثیر زرِ مبادلہ حاصل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ پاکستان کے بہت سے ایسے علاقے ہیں جو سیاحتی اعتبار سے نہایت اہم ہیں لیکن عالمی سطح پر ان مقامات کے بارے میں آگاہی سرے سے موجود نہیں ہے۔

ان سیاحتی مقامات کے ساتھ ساتھ یہ سرزمین جغرافیائی اعتبار سے ایک اہم حیثیت رکھتی ہے۔ یہ زمین مشرقِ وسطیٰ اور دیگر ممالک کے درمیان ایک مرکز کی مانند ہے۔ کیونکہ ہمارے ملک کے ایک جانب اسلامی ممالک کی پٹی ہے تو دوسری جانب غیر اسلامی ممالک ہیں۔ گویا پاکستان مشرقِ وسطیٰ اور مغربی ممالک کے درمیان ایک گیٹ وے کا کام کر سکتا ہے۔ خطے میں گرم پانی کی بندرگاہیں صرف وطنِ عزیز کے پاس ہیں۔ اگر صرف گوادر میں قریبا 5% تک اضافہ ممکن ہے۔پاکستان GDP کی بندگاہ کو ہی چالو کر دیا جائے تو پہلی سلامی ایٹمی قوت ہونے کی بدولت خطے میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔صرف یہی نہیں اس سرزمین میں ریکوڈک ، چنیوٹ کے مقام پر سونے اور تانبے کے وسیع تر ذخائر اور نمک کیسب سے بڑی کان کھیوڑہ کے مقام پر موجود ہیں۔ جن کی مالیت 250 ارب ڈالر

سے زیادہ ہے جبکہ تھر کے مقام پر (دنیا کے تیسرے بڑے ذخائر) اور سندھ ہی کے علاقے جھارو میں تیز چلنے والی ہوائیں توانائی کے متبادل ذرائع کی صورت موجود ہے۔ اگر ان ذرائع کو احسن طریقے سے استعمال میں لایا جائے تو نہ صرف بجلی کا بحران از خود ختم ہو جائے بلکہ پاکستان بجلی درآمد کرنے کے قابل بھی ہو جائے۔ پوری دنیا میں برآمد کیے جانے والے قیمتی پتھر شمالی علاقہ جات سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ جو کوالٹی کے اعتبار سے ساری دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ بلوچستان کی زمین معدنیات، قدرتی گیس اور خام تیل کے وسیع ذخائر سے لبریز ہے۔ جن کو ابھی تک دریافت نہیں کیا جاسکا۔ اگر ان وسائل کا 10% حصہ بھی کام میں لایا جائے تو اس ملک کی مالی حالت دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ ملک سے کہیں بہتر ہو سکتی ہے۔

الغرض یہ سرزمین چاہے انسانی وسائل ہوں یا قدرتی وسائل، ہر طرح کے وسائل سے مالا مال ہے۔ یہ تمام وسائل ایسے ہیں جنھیں اگر مناسب طریقے سے استعمال میں لایا جائے تو نہ صرف پاکستان اپنے ہر قرضے سے نجات پا سکتا ہے بلکہ دوسرے ممالک کی مالی امداد بھی کر سکتا ہے۔ انہی وسائل کو بروکار لا کر حالیہ بحرانوں سے ابدی نجات حاصل کی جا سکتی ہے اور یہاں کے بسنے والوں کو بہتر معیارِ زندگی دیا جاسکتا ہے۔ ہمارے ملک کے پاس کمی ہے تو ایک ایسے لیڈر کی جس میں قائدانہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ بصارت اس حد تک موجود ہو

کہ وہ حالات کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے ملک کے لیے بہترین فیصلے کر سکے۔ ایک ایسا لیڈر جس کے لیے اپنے ذاتی مفادات کی نسبت ملکی مفادات اہم ہوں۔

پاکستان کا نظامِ تعلیم

لفظ Education یونانی زبان کے لفظ Educatum سے نکلا ہے جس کے لفظی معنی ہیں پڑھانا یا سکھانا۔ تعلیم سے مراد وہ تمام طریقہ ہائے تعلیم ہیں جن کے ذریعے اقتدار، عقائد، عادات، ہر طرح کا علم ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل کیا جاتا ہے۔ ان طریقوں میں داستان گوئی، بحث و مباحثہ، تعلیم و تربیت، روایتی و غیر روایتی طریقہ ء تعلیم شامل ہیں۔ تعلیم کسی بھی قوم کا اثاثہ ہے۔ جو قوم تعلیم کے معیار کو بہتر سے بہترین بناتی ہے وہ کامیاب رہتی ہے۔ تعلیم ہی کسی قوم کو ٹیکنالوجی، دفاع، صحت، صنعت و حرفت، زراعت کے میدان میں کامیابی کی ضامن ہے۔ یہ تعلیم ہی ہے جس کے بل بوتے پر ایک قوم کو دوسری پر برتری حاصل ہوتی ہے۔ نیلسن منڈیلا نے کیا خوب کہا تعلیم دنیا کو بدلنے کے لیے مضبوط ترین ہتھیار ہے۔

تعلیم کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جاپان (جو کہ جنگ عظیم کے دوران تباہ ہو چکا تھا) نے اپنے بجٹ کا ایک بڑا حصہ ٹیکنالوجی اور تعلیم پر صرف کیا اور چند ہی برس میں جاپان اپنی مشینری پوری دنیا کو درآمد کرنے کے قابل ہو گیا۔ آج جاپان اقوامِ عالم کی

صف میں ایک مضبوط حیثیت رکھتا ہے۔ تعلیم کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں جن قوموں نے تعلیم کو ثانوی حیثیت دی وہ قومیں آج اقوامِ عالم کی صف میں بہت پیچھے رہ چکی ہیں ۔ کسی بھی ملک کی ترقی کے لیے تعلیم ایک بنیادی اکائی کی حیثیت رکھتی ہے۔ جتنا کسی ملک میں تعلیم عام ہو گی اسی قدر جرائم میں کمی، صنعت و حرفت میں ترقی، دفاع میں مضبوطی اور معاشرے میں امن و امان کی صورتحال بہتر ہوتی چلی جاتی ہے۔ ملک کی معاشی ترقی کے لیے بھی ضروری ہے کہ تعلیم عام ہو کیونکہ جب تعلیم عام ہوتی ہے تو آگے بڑھنے کے زرائع میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

اسلام میں تعلیم حاصل کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے اور علم حاصل کرنے کے بارے میں واضح احکامات دیئے گئے ہیں۔ اسلام میں تعلیم حاصل کرنے کو کس قدر اہمیت دی گئی ہے اس بات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ غزوہء بدر میں پکڑے جانے والے قیدیوں کو مدینہ کے تین مسلمانوں کو تعلیم دینے کی شرط پر رہا کر دیا جاتا ہے۔ نبی پاک ﷺ اپنےحضرت زید بن حارثؓ کو تعلیم حاصل کرنے کا حکم دیتے ہیں اور وحی کو تحریر میں لایا جاتا ہے۔ حدیث نبوی ﷺ میں ارشاد ہے جس کا مفہوم ہے کہ علم حاصل کرو چاہے تمھیں چین جانا پڑے۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ علم حاصل کرنا ہر مرد اور عورت کے لیے لازم ہے۔ ہر عالم کے لیے ادب و احترام لازم قرار دیا گیا ہے۔۔ صرف یہی نہیں قرآنِ پاک

کی صورت میں ہمیں علم کا ایک خزانہ دے دیا گیا جس کی آیات زندگی گزارنے کے اصولوں، انسانی حقوق، سائنس، حکمت، غور وتدبر سے آراستہ ہیں۔ اسلام میں علم حاصل کرنے کو جہاد کے برابر کا رتبہ دیا گیا۔ یہ علم ہی ہے جو انسان کو شعور عطاء کرتا ہے۔ جو انسان کو جہالت کے اندھیروں سے نکال کر زندگی گزارنے کے اصولوں سے متعارف کرواتا ہے۔

پاکستان کا معیارِ تعلیم دوسرے ممالک کی نسبت کہیں کم ہے۔ عموما تعلیم رسمی ڈگری حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بن چکی ہے۔ ٹیکنکل، غیر رسمی تعلیم نہ ہونے کے برابر ہے۔ ملک کا ایک بڑا طبقہ غربت کی لکیر کے نیچے زندگی گزار رہا ہے۔ جس کی وجہ سے تعلیم پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی بلکہ بچوں کو چھوٹی عمر میں ہی محنت مزدوری پر لگا دیا جاتا ہے۔ اس طرح ملک میں بچوں کی ایک بڑی تعداد تعلیم سے محروم رہ جاتی ہے۔ تعلیمی معیار بہتر نہ ہونے کی دوسری بڑی وجہ تعلیمی نظام میں سیاسی دخل اندازی بھی ہے۔ جب بھی حکومت بدلتی ہے، تعلیمی نصاب میں تبدیلیاں کر دی جاتی ہیں، جو کہ بعض اوقات ملک جیسے بڑے HEC کے ایک بڑے طبقے کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ادارے تک کے فنڈز روک دیئے جاتے ہیں اور اس ادارے کو سیاسی وجوہات کی بناپر ختم تک کرنے کی باتیں کی جانے لگتی ہیں۔

تعلیمی نظام بہتر نہ ہونے کی دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ بجٹ میں تعلیم کے نہایت قلیل رقم مختص کی جاتی ہے۔ ہر سال تعلیم پر خرچ ہونے والی رقم 4% سے 5% کے درمیان رہتی ہے۔ اس کے باوجود یہ شعبہ بھی باقی کئی شعبوں کی طرح کرپشن کا شکار ہے۔ چاہے وہ اساتذہ کی تقرری ہو یا کتب کی تقسیم و ترسیل، ہر جگہ کرپشن اور بدعنوانی کا دور دورہ ہے۔ مفت فراہم کی جانے والی کتب کو مارکیٹ میں فروخت کر دیا جاتا جس سے سکولوں میں کتب کی کمی ہو جاتی ہے اور ناچار طلبہ کو وہ کتابیں مارکیٹ سے خریدنا پڑھتی ہیں۔

ہمارے ملک میں ہر شعبے کی طرح اس شعبے میں بھی مغرب کی اندھی تقلید کی جاتی ہے ۔پرائیویٹ سکولوں طریقہ ہائے تعلیم سے لیکر سلیبس تک مغرب کا استعمال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ مغرب کے معاشرے اور ہمارے معاشرے کی اقدار میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جب مغرب کا سلیبس ہمارے یہاں استعمال کیا جاتا ہے تو کئی جگہ وہ ہماری اقدار سے متصادم ہو جاتا ہے۔ اس طرح معاشرے میں بہتری آنے کی بجائے ابتری کا سبب بنتا ہے۔

پاکستان میں چار طرح کے نظام تعلیم رائج ہیں۔ ایک تو گورنمنٹ اور وہ سکول جو پرائیوٹ پبلک پارٹنر شپ کے تحت کام کر رہے ہیں، دوسرا پرائیوٹ سکول، تیسرا کیمرج سسٹم کے تحت چلائے جانے والے سکول اور چوتھا مدرسے (جو کہ

مختلف مذہبی تنظیموں کے تحت چلائے جا رہے ہیں) ۔ان تمام کے تمام نظام تعلیم کے نصاب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ گورنمنٹ سکولوں میں بھی دو طرح کے نصاب پڑھائے جا رہے ہیں ایک اردو میڈیم تو دوسرا انگریزی میڈیم۔ گورنمنٹ سکولوں کی کتب اور نصاب صوبائی یا وفاقی ٹیکسٹ بک بورڈ واضع کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جو سکول پبلک پرائیویٹ پارٹنرز شپ یا کسی وفاقی ادارے کے تحت کام کر رہے ہیں ان میں آکسفورڈ، یا گابا کی کتب پڑھائی جا رہی ہیں ۔ان سکولوں کا نصاب انتظامیہ طے کرتی ہے۔ جبکہ ہر پرائیویٹ سکول کا اپنا الگ سلیبس ہے۔ ہر پرائیویٹ سکول میں ایک الگ ادارے کی کتب پڑھائی جا رہی ہیں ۔پرائیویٹ سکولوں کا نصاب سکول مالکان اپنی مرضی سے طے کرتے ہیں۔ جس پر کسی قسم کا کوئی check and balance موجود نہیں ۔ ہر سکول اپنا نصاب وضع کرنے میں آزاد ہے چاہے وہ نصاب میں کسی بھی قسم کی کتب شامل کر لیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض پرائیویٹ سکولوں میں ہم جنس پرستی تک پر سیمینار منعقد ہو جاتے ہیں۔ لیکن حکومت یا تعلیمی بورڈ ان سکولوں پر پابندی نہیں لگاتا کیونکہ پاکستان میں تعلیم کے متعلق کوئی قانون سرے سے موجود ہی نہیں ہے ۔اس کے علاوہ کیمرج سسٹم کے تحت کام کرنے والے سکولوں میں انٹر نیشنل نصاب پڑھایا جا رہا ہے ۔ان تمام کے برعکس مدرسوں میں صرف قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم دی جا رہی ہے جبکہ دنیاوی تعلیم سے یکسر عاری یہ نظام تعلیم اپنی ڈگری تو دیتا ہے لیکن وہ ڈگری کسی بھی دوسرے ادارے میں قابلِ قبول نہیں ہوتی نہ ہی ان اداروں سے

فارغ التحصیل طلبہ وطالبات کو نوکریاں ملتی ہیں ۔اگرچہ حکومت نے ارادہ وفاق المدارس قائم کیا ہے تاہم وہ اس حد تک قابل نہیں کہ ان مدرسوں کی ڈگری کو بھی ملکی سطح پر قابلِ قبول بنانے میں مدد کرسکے ۔ان مدرسوں کو انٹر نیشنل اسلامک یونیورسٹی سے ملحق ہونا چاہیے ۔ان تمام اداروں سے فارغ التحصیل طالب علموں میں سے بعض تو کامیاب ہو جاتے ہیں جبکہ بعض نوکریوں کی تلاش میں دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔ملک میں موجود یہ تمام تعلیمی نصاب اپنی اپنی جگہ کام تو کر رہے ہیں لیکن ہر تعلیمی نظام میں نقائص موجود ہیں ۔

گورنمنٹ سکولوں سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات (جن میں سے ماضی قریب میں اعلیٰ عہدوں تک پہنچتے رہے) پچھلے پانچ سال سے بورڈ کے سالانہ نتائج میں کوئی پوزیشن حاصل نہیں کرسکے اس کے برعکس پرائیویٹ سکولوں کے طلبہ وطالبات پہلی دس پوزیشنز پر نظر آئے ۔جو کہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ پرائیویٹ سکولوں میں اب معیارِ تعلیم گورنمنٹ سکولوں کی نسبت کہیں بہتر ہو چکا ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ پرائیویٹ سکولوں کی فیسیں اس قدر زیادہ ہیں کہ کوئی متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا جس کے دو سے زائد بچے ہوں وہ ان سکولوں کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتا ۔اگرچہ حال ہی میں گورنمنٹ سکولوں کے اساتذہ کی تنخواہوں میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا گیا ہے تاہم کوئی چیک

اینڈ بالینس نہ ہونے کی وجہ سے یہ اساتذہ بچوں کو اس حد تک محنت سے نہیں پڑھاتے جس حد تک پرائیویٹ سکولوں کے اساتذہ پڑھاتے ہیں۔پرائیویٹ سکولوں کے برعکس گورنمنٹ سکولوں میں طلبہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ایک ایک جماعت میں پچاس سے زائد طلبہ ہونے کی وجہ سے اساتذہ طلبہ پر اتنی توجہ نہیں دے پاتے۔اگرچہ گورنمنٹ سکولوں کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے حکومت پنجاب نے دانش سکول (سمارٹ سکول) بھی کھولے اس میں اگرچہ طریقہ تعلیم تو بہتر ہے لیکن معیارِ تعلیم اسی سطح پر ہے۔دانش سکولوں میں طلبہ وطالبات کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے، اساتذہ کی تعداد بھی کم ہے ۔اور جو اساتذہ ان سکولوں میں اساتذہ میں پڑھا رہے ہیں وہ اس طریقہء تعلیم سے مناسب واقفیت بھی نہیں رکھتے۔حکومت کو چاہیے تھا کہ بجائے نئی عمارتوں اور نئے سکولوں پر پیسے خرچ کرنے کے پہلے سے موجود سکولوں کی حالتِ زار کو بہتر کرتی۔ہماری ملک کا المیہ یہ ہے کہ تعلیمی نظام میں بہتری لانے کے لیے ایسے فیصلے کر دئے جاتے ہیں جو کہ نہ تو دوررس ہوتے ہیں اور نہ ہی پائیدار ہوتے ہیں۔ہمارے ملک میں ذہین بچوں کی کوئی کمی نہیں ہے اگر کمی ہے تو صرف اور صرف نظامِ تعلیم کو مناسب حد تک درست کرنے کی۔اس نظام کو درست کرنا بھی زیادہ مشکل نہیں، صرف نیک نیتی اور بصارت رکھنے والے افراد اس نظام میں موجود خامیوں کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

تعلیم کے شعبے کی حالتِ زار کو بہتر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ پورے ملک میں موجود تعلیمی اداروں کا نصاب یکساں ہو۔ نصاب ایسا ہونا چاہیے جو ہماری اقدار سے متصادم نہ ہو۔ نصاب بنانے کی ذمہ داری ایک ایسے ادارے کو دی (UGC یا HEC) جائے جو کہ مکمل طور پر سیاسی مداخلت سے مبرا ہو۔۔ چاہے کوئی بھی سیاسی جماعت یا مذہبی جماعت ہو اس ادارے پر دباؤ نہ ڈال سکے۔ اس ادارے میں نصاب بنانے کے لیے ان قابل اساتذہ کو رکھا جائے جو اس ملک کی اقدار کو سمجھتے ہوں، ایسی بصیرت رکھتے ہوں کہ نصاب کو حال کے ساتھ ساتھ مستقبل سے بھی مکمل طور پر ہم آہنگ بنا سکیں۔ نصاب کے معاملے میں قوانین بنانے کی ضرورت ہے۔ تاکہ اگر کوئی ادارہ ہماری اقدار سے منافی یا متصادم کتب پڑھانے کی کوشش کرے تو اس کے خلاف کاروائی کی جا سکے۔ نصاب کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی تقرری، اساتذہ کی بھرتی، کتابوں کی ترسیل و تقسیم کو کرپشن سے پاک کیا جانا ضروری ہے۔

یمن کی حالیہ صورتحال اور پاکستان کا کردار

تقریبا دو ہفتے سے یمن میں جنگ جاری ہے۔ یمن کے حالات دن بدن بگڑتے جا رہے ہیں۔ سعودی عرب اور ایران کے اس تنازعہ میں سب سے زیادہ نقصان یمن کا ہو رہا ہے۔ سعودی عرب کی جانب سے اب فضائی حملوں کا بھی آغاز کیا جاچکا ہے جس کی وجہ سے یمن میں مالی اور جانی نقصانات میں اضافہ ہوا ہے۔ تقریبا تمام ممالک کے باشندے چاہے وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم یمن سے اپنے ملکوں کو لوٹ چکے ہیں تاہم پاکستانی باشندے ابھی تک یمن میں موجود ہیں۔ سعودی عرب نے پاکستان سے فوجی امداد کی اپیل بھی کی ہے۔اور پاکستان نے سعودی عرب کو حمایت کی یقین دھانی بھی کروائی ہے تاہم پاک فوج کو جنگ لیے بھیجا جائے گا یا نہیں اس کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے۔ پاکستان کے سعودی عرب کی حمایت کے بعد یمن میں موجود پاکستانیوں کی جانوں کو مزید خطرات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ یمن میں پاکستانی سفارت کار اور میڈیا کی کوششوں کی وجہ سے حکومت پاکستان کی جانب سے اپنے باشندوں کو یمن سے نکالنے کے لیے ایک طیارہ اور ایک سمندری فریگیٹ بھی یمن بھیجا جاچکا ہے اورمزید طیارے، سمندری جہاز بھیجے جانے کا فیصلہ کیا جاچکا ہے۔ یمن میں موجود پاکستانی باشندوں کی باحفاظت وطن واپسی کی کوششیں جاری ہیں۔

اس جنگ میں پاکستان کیا کردار ادا کر سکتا ہے ؟اس بارے میں بات کرنے سے پہلے اللہ کے احکامات اور تاریخ کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔ اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑپڑیں توان میں صلح کرواؤاور جو صلح نہ کرے اس کے خلاف جنگ کرو۔

تاریخ ہمیں کچھ یوں بتاتی ہے کہ جنگ جمل سے قبل حضرت علیؓ نے حضرت عائشہؓ کو ایک خط لکھااور اپنی فوجوں کو روکنے کی درخواست کی تاکہ حتیٰ المکان جنگسے بچا جاسکے لیکن بعض لوگوں نے حضرت عائشہؓ کو بڑھکایااور جنگ پر اکسایااور حضرت عائشہؓ نے اس درخواست کے باوجود جنگ کاارادہ ترک نہ کیا۔ یہاں تک کہ دونوں گروہوں کا آمنا سامنا جمل کے مقام پر ہوا۔ جب حضرت علیؓ اور ام المومینین حضرت عائشہؓ کے لشکر آمنے سامنے ہوئے اور جنگ میں کئ مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھوں شہید ہوئے اس وقتحضرت علیؓ نے حضرت عائشہؓ کے اونٹ کی خود کونچیں کاٹ دی جس کی وجہ سے جنگ ختم ہو گئ۔ حضرت علیؓ کے احکامات پر حضرت عائشہؓ کو باعزت طریقے سے باحفاظت مدینہ پہنچایا گیا۔ بعد میں حضرت عائشہؓ نے حضرت علیؓ سے معافی بھی مانگی۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو حضرت علیؓ نے جنگ ختم کرنے کی ایک احسن حکمتِ عملی اپنائی۔اس واقعہ سے ثابت ہوا کہ مسلمان اگر آپس میں جنگ کریں تو بہترین حکمتِ عملی

یہ ہے کہ اس اقدام کو روکا جائے ان میں صلح کروا دی جائے۔تاکہ جانی اور مالی نقصان کم سے کم ہو، کیونکہ جب دونوں جانب نعرہ تکبیر بلند ہو اور دونوں جانب خون مسلمان کا بہتا ہو تو صلح سے بہتر کوئی عمل نہیں ہو سکتا۔

اگر ماضی قریب کی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو ہمیں اس جنگ میں پاکستان کا کردار وضع کرنے میں مزید آسانی ہو سکتی ہے۔ ماضی قریب میں جب عراق اور ایران کی جنگ ہوئی جس میں تقریبا 20 لاکھ مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا۔ یہ جنگ کسی طرح رکنے میں نہ آرہی تھی تو اس وقت جنرل ضیاء الحق امتِ مسلمہ کے حق میں کھڑے ہوئے اور اعلیٰ بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے انھوں نے ایک وفد ایران بھیجا اور ایک وفد عراق کی جانب روانہ کیا۔ اس طرح جنرل ضیاء الحق کی بہترین حکمتِ عملی نے مزید مسلمانوں کے قتلِ عام کو روکا اور پاکستان کی بہترین سفارتی کوششوں کے نتیجے میں یہ جنگ اختتام پذیر ہوئی۔ ایسی جنگوں کو روکنا بہترین اقدام ہے کیونکہ اگر دو بھائی آپس میں لڑتے ہیں تو فائدہ ان کے دشمن کا ہوتا ہے۔

ماضی کی طرح پاکستان کا کردار آج بھی یہی ہونا چاہیے کیونکہ سعودی عرب اور ایران دونوں ہی پاکستان کے برادر مسلمان ملک ہیں، دونوں ممالک سے پاکستان کے قریبی سفارتی تعلقات ہیں۔ مرنے والے بھی مسلمان ہیں اور مارنے والے بھی

۔پاکستان کے لیے دونوں ملکوں کی اہمیت یکساں ہے اور ان کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایران ہمارا ایک قریبی ہمسایہ ہے اور ہماری ایران کے ساتھ کئی سو کلومیٹر لمبی سرحد مشترک ہے۔یہ سرحد ایک محفوظ سرحد ہے جس کی جانب سے پاکستان کو کبھی خطرات کا سامنا نہیں رہا۔ سعودی عرب کی حمایت کی صورت میں ہماری یہ سرحد بھی مشرقی سرحد کی طرح غیر محفوظ ہونے کا امکان موجود ہے۔ ان زمینی حقائق کے علاوہ دونوں ممالک پاکستان کی عالمی سطح پر حمایت کرتے چلے آئے ہیں ۔اگر ایران کی جانب دیکھا جائے تو ایران وہ پہلا اسلامی ملک تھا جس نے پاکستان کو عالمی سطح پر تسلیم کیا۔1965 کی پاک بھارت جنگ میں ایران نے بھارت کے خلاف پاکستان کو بے پناہ مالی اور سفارتی مدد فراہم کی۔ایران اور پاکستان کے درمیان کئی معاہدے ہو چکے ہیں اور ایران نے پاکستان کی ہر مشکل وقت میں مدد کی ہے۔اس کی سب سے بڑی مثال پاک ، ایران بھارت گیس کا منصوبہ ہے ۔ اس کے علاوہ ایران اور پاکستان کے درمیان کئی دفاعی ، اور ترقیاتی منصوبوں پر کام جاری ہے۔ جبکہ مسلمانوں کے مقدس مقامات سعودی عرب میں ہونے کی وجہ سے سعودی عرب کے لیے تمام مسلمان دلوں میں نرم گوشہ رکھتے ہیں ۔ خانہ ء کعبہ اور مسجد نبوی ﷺ کی حفاظت میں کھڑے ہو جانا پوری امتِ مسلمہ کے لیے مذہبی فریضہ کا درجہ رکھتا ہے۔اس کے علاوہ سعودی عرب نے 1965 کی جنگ میں پاکستان کو مفت تیل فراہم کیا، ہر مشکل وقت میں سعودی عرب پاکستان کے ساتھ کھڑا رہا۔ ہر مشکل صورتحال میں خام تیل

اور مالی امداد کی صورت پاکستان کی امداد کرتا رہا۔

الغرض دونوں ممالک ہی پاکستان کے برادر ملک ہیں۔ دونوں میں بسنے والے ایک خدا اور ایک رسول ﷺ کے ماننے والے ہیں۔ دونوں جانب بہنے والا خون مسلمان کا ہے ۔ بھائی ہی بھائی کا گلہ کاٹنا چاہتا ہے۔ایک طرف تو ان دونوں میں سے کسی ایک کی حمایت کرنا حکومتِ پاکستان اور افواجِ پاکستان کے لیے کسی طور مفید نہیں کیونکہ کسی ایک کی حمایت (چاہے وہ سعودی عرب ہو یا ایران دونوں) کی صورت میں پاکستان دوسرے دوست اور بھائی کو ہمیشہ کے لیے کھو دے گا۔ جبکہ دوسری طرف پاک فوج کو اس جنگ میں جھونک دینے کی صورت میں پاکستان کو جانی اور مالی دونوں نقصان اٹھانے پڑیں گے اور ان نقصانات کے اثرات نہایت دور رس ہوں گے اور ہماری اپنی سرحدیں محفوظ نہیں رہیں گی ۔

اس وقت مناسب یہ ہے کہ جزل ضیاء الحق کی طرح وزیر اعظم نواز شریف کی جانب سے ایک وفد سعودی عرب کی طرف روانہ کیا گیا ہے تو دوسرا وفد ایران بھیجا جائے ۔

پاکستان کی حتی الامکان کوشش ہونی چاہیے کہ سفارتی کوششوں کے ذریعے دونوں ممالک کے مابین جاری جنگ کے خاتمہکروایا جائے ۔اس جنگ کا خاتمہ اس لیے بھی زیادہ ضروری ہے کیونکہ اس جنگ میں تین اسلامی ملک نقصان اٹھا رہے ہیں ۔ جس کا فائدہ دشمن اٹھا سکتا ہے ۔اگر یہ جنگ بروقت نہ روکی گئی تو

مزید ممالک کا بھی اس کی لپیٹ میں آجانا خدشے سے خالی نہیں۔ اس طرح کی جنگوں سے مسلمان ممالک اپنے وسائل کو جنگ کی نذر کرکے نہ صرف مزید مالی کمزویوں کا شکار ہو جائیں گے، ان کی معاشی حالت ابتری کا شکار ہو گی بلکہ مسلمانوں کی قوت بکھر کر رہ جائے گی۔

علم: ایک خزانہ

حکایتِ سعدی سے اقتباس ہے، کہا جاتا ہے کہ مصر کے امیر کے دو بیٹے تھے ان میں سے ایک نے علم حاصل کیا جبکہ دوسرے نے مال و دنیا سمیٹی۔ علم والا بھائی عالم ہوا اور لوگوں کی نظر میں صاحبِ عزت و احترام ٹھہرا جبکہ مال و دولت کا مالک دوسرا بھائی مصر کے بادشاہ کا وزیر بن گیا۔ مال و دولت والا بھائی اپنی دولت اور وزارت کے نشے میں چور عالم بھائی کو حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ ایک دن وزیر نے دوسرے بھائی کو کہا کہ میں تو وزیر بن گیا ہوں اور تو فقیر کا فقیر ہی رہا۔ عالم بھائی نے امیر بھائی کو جواب دیا۔ میرے بھائی اللہ کا مجھ پر بڑا کرم ہے کہ میں نے علم حاصل کیا جو پیغمبروں کی میراث ہے۔ میں مانتا ہوں کہ میں تو اس چیونٹی کی مانند ہوں جسے راہگزار پاؤں تلے مسل کر گزر جاتے ہیں۔ شکر ہے میں وہ بھڑ نہیں جس کے ڈنگ مارنے سے لوگ چیخنے چلانے لگیں۔ میں اللہ کی عطاء کردہ اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کر ہی نہیں سکتا۔ مجھ میں لوگوں کو ستانے کی قوت ہے نہ ہی دنیاوی منصب۔

اس حکایت سے ثابت ہوا کی علم کی دولت سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں۔ علم کی دولت کو حاصل کرنے کی جدوجہد کرنے والی قوموں کا سر ہمیشہ بلند رہتا ہے۔

جو قومیں علم کے میدان میں آگے نکل گئی وہی کامیاب رہیں۔ علم کی اس دولت کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرنے کے لیے مختلف اداروں کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے۔ تقریباً پورے ملک میں پھیلے گورنمنٹ سکول اور پرائیویٹ سکول یہ خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ حکومت کے ساتھ ساتھ این جی اوز اور امیر لوگوں نے بھی تعلیم کو عام کرنے کے لیے پرائیویٹ سکولوں کا اجراء کیا ہے۔ علم حاصل کرنے کے لیے امیر غریب سبھی اپنے بچوں کو ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی درسگاہوں میں بھیجتے ہیں۔ امیر اپنے بچوں کو مہنگے سے مہنگے سکول میں داخل کرواتے ہیں جبکہ غریب کی دسترس میں صرف گورنمنٹ سکول ہی ہیں۔ ان سکولوں میں ہر جماعت کی بھاری بھر کم فیس رکھی جاتی ہے اور یہ پرائیویٹ سکول صرف امراء کی دسترس میں ہیں۔ پرائیویٹ سکولوں میں سے چند ایک سکول بڑے پیمانے پر کام کر رہے ہیں اور ان کی شاخیں پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں جبکہ چند ایک بالکل چھوٹے پیمانے کام کر رہے ہیں۔ اب تو یہ حالت ہے کہ تقریباً ہر گلی، محلے میں یہ سکول چھوٹے چھوٹے گھروں میں بھی کھلے نظر آئیں گے۔ پرائیویٹ سکولوں میں طلبہ کی راہنمائی گورنمنٹ سکولوں کی نسبت کہیں بہتر کی جاتی ہے اور عام طور پر پرائیویٹ سکولوں کا معیارِ تعلیم گورنمنٹ سکولوں کی نسبت بہتر خیال کیا جاتا ہے۔

پاکستان کے قیام سے لیکر پچھلے چند برس تک گورنمنٹ سکولوں سے تعلیم حاصل

کرنے والے طلبہ پورے ملک میں واضح مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے تھے۔ بورڈ کے سالانہ امتحانات میں بھی گورنمنٹ سکولوں کے طالب علم پوزیشنز حاصل کر پاتے تھے لیکن پچھلے چند برس سے بورڈ کے سالانہ امتحانات کے نتائج ماضی سے کچھ مختلف آ رہے ہیں۔ بورڈ کے امتحانات میں پہلی تین پوزیشنز گورنمنٹ کے مشہور سکولوں کی بجائے چند بڑے پرائیویٹ سکولوں کے حصے میں آ رہی ہیں۔ بورڈ کے سالانہ نتائج میں پرائیویٹ سکولوں کے نمایاں ہونے کی کئی وجوہات ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ بعض بڑے بڑے سکولوں کے مالکان اور بعض اساتذہ بورڈ اور حکومتی سطح پر خاصا اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ اس اثر و رسوخ کے بل بوتے پر کرپشن اور بد عنوانی کے ذریعے پوزیشن اپنے یا اپنے سکول کے بچوں کے نام کروا لیتے ہیں۔ اکثر و بیشتر ایگزیمینیشن سکشن میں پیسبھاری رقوم ادا کرکے بچوں کے 10 سے 20 نمبر بڑھوا لیے جاتے ہیں۔ بظاہر تو ان چند نمبر کوئی بہت بڑی بات نظر نہیں آتی تاہم ان چند نمبروں کے ردو بدل سے پوزیشن میں تبدیلی آ جاتی ہے۔ اس طرح ایک کم محنتی بچے کو وہ پوزیشن دے دی جاتی ہیجو کسی اور بچے کا حق ہو۔ نمبروں کے ردو بدل سے کالجوں کے میرٹ پر بھی فرق پڑھتا ہے۔ اور نعض اوقات حق دار طلبہ بھی اچھے کالجوں میں داخلے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ کرپشن کی یہ صورت کسی بھی محنتی بچے کے مستقبل کے ساتھ کھیلنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ کرپشن اور بد عنوانی کا سہارا لے کے ایک ایسے بچے کا مستقبل سنوار دیا جاتا ہے جس کو اس پوزیشن کے انعام میں

ملنے والے وظیفہ سے کوئی فرق نہیں پڑھتا اور وہ اس وظیفہ کی رقم حاصل کیے بنا بھی اپنی تعلیم جاری رکھ سکتا ہے۔اس کے برعکس وہ بچہ جو محنت تو کر سکتا ہے لیکن اپنی غربت کی وجہ سے آگے تعلیم حاصل نہیں کر سکتا اس کے حقوق کو پامال کر دیا جاتا ہے۔گویا وہ بچہ جو محنت اور لگن سے تعلیم کے میدان میں کامیاب ہونے کی کوشش کر رہا ہو وہ اس بچے سے کہیں پیچھے رہ جاتا ہے جس کے والدین یا سکول مالکان اثر و رسوخ کے حامل ہوں ۔محنت کے باوجود وہ بچہ نہ صرف بددلی کا شکار ہو جاتا ہے بلکہ اپنے جائز حق سے بھی محروم رہتا ہے جو کہ پوزیشن لینے والے طالب علم کا حق ہے۔

ددوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ چند ایک بڑے سکولوں کے علاوہ پرائیویٹ سکولوں میں طلبہ کی تعداد نہایت کم ہوتی ہے۔اس کم تعداد کی ایک بڑی وجہ ان سکولوں کی بھاری بھر کم فیسیں ہیں۔جس کی وجہ سیان سکولوں کی تعلیم ہر ایک کی دسترس میں نہیں ہوتی۔ان سکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بچوں کا لائق یا محنتی ہونا اہم نہیں بلکہ ان کے والدین کا امیر ہونا ضروری ہے۔پرائیویٹ سکولوں میں بچوں کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے یہاں پڑھانے والے اساتذہ بچوں پر خصوصی توجہ دے پاتے ہیں۔پرائیویٹ سکولوں کے برعکس گورنمنٹ سکولوں میں ایک ایک جماعت میں کم و بیش پچاس طلبہ پڑھ رہے ہوتے ہیں۔تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے گورنمنٹ سکولوں کے اساتذہ اس تندہی اور محنت سے نہیں پڑھا سکتے

جو کہ اساتذہ کا فرض اور ان طلبہ کا حق ہے۔ بچوں کی تعداد کا حد سے زیادہ ہونے کی وجہ سے اساتذہ کے لیے ہر ایک پر انفرادی توجہ دینا ممکن ہی نہیں۔ گورنمنٹ سکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ اپنی مدد آپ اور ذاتی کوششوں کے بل بوتے پر آگے بڑھتے ہیں۔ ان کی کامیابی میں اساتذہ کا کردار کچھ کم ہوتا ہے۔ اگرچہ ان گورنمنٹ سکولوں میں پڑھنے والے بچوں کی ذہانت اور محنت پرائیویٹ سکولوں میں پڑھنے والے طلبہ سے کہیں بہتر ہوتی ہے لیکن ان طلبہ کو وہ راہنمائی مل ہی نہیں پاتی جو انھیں پوزیشن لینے میں مددگار ثابت ہو۔

نصابی سرگرمیوں کے علاوہ ایسا بھی اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ گورنمنٹ سکول میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات کو عالمی سطح یا قومی سطح پر منعقد ہونے والے تعلیمی مقابلوں میں بھیجا ہی نہیں جاتا۔ کیونکہ گورنمنٹ سکول میں پڑھانے والے اساتذہ اس طرح کی غیر نصابی سرگرمیوں کو اہمیت نہیں دیتے جبکہ پرائیویٹ سکولوں میں اس طرح کے مقابلوں کے لیے بچوں کی خصوصی طور پر تربیت کی جاتی ہے۔ ان مقابلوں میں حصہ لینے سے نہ صرف طالب علموں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے بلکہ ان بچوں کے اعتماد میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو دنیا میں نام پیدا کرنے والے پاکستانی بچوں کا تعلق پرائیویٹ سکولوں سے ہے۔ جبکہ کسی گورنمنٹ سکول سے تعلیم حاصل کرنے والا

طالب علم عالمی سطح تو در کنار ملکی سطح پر بھی نام نہیں بنا سکا۔یہی وجہ ہے کہ یہ بچے گورنمنٹ سکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی نسبت نہ صرف زیادہ پر اعتماد ہوتے ہیں بلکہ ان میں حالات سے مقابلہ کرنے کی قوت بھی زیادہ ہوتی ہے۔

گورنمنٹ سکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کا قصور صرف اور صرف غربت ہے۔ جو ان کے بہترین مستقبل کی راہ میں حائل ہے۔ بچے کسی بھی قوم کا مستقبل ہیں اور اس مستقبل کی پرورش اور تعلیم کے سلسلے میں امیر غریب یا کسی بھی قسم کی تفریق نہیں کی جانی چاہیے ۔امیر اور گریب دونوں ہی بچے پاکستان کے بچے ہیں، دونوں ہی کو آگے بڑھنے کے مناسب اور یکساں مواقع فراہم کیے جانے چاہیں۔ تعلیم کا شعبہ پیغمبری شعبہ ہے۔ دنیا میں خدا کا حکم نافذ کرنے جتنے بھی پیغمبر آئے انھوں نے تبلیغ کی، قوموں کی تربیت کی ۔ایسے پیغمبری شعبہ میں کرپشن اور بدعنوانی کا ہونا ہماری قوم کی بدنصیبی کی علامت ہے۔ تعلیم جیسے شعبے میں کرپشن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قوم کے مستقبل کو داؤ پر لگا دیا جائے کیونکہ تعلیم کے شعبہ پر ملک و قوم کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ اس شعبہ کو بالخصوص کرپشن سے پاک کیا جانا چاہیے کیونکہ یہ واحد شعبہ ہے جس میں کرپشن کا ہونا حال تک محدود نہیں رہتا بلکہ آج کی کرپشن مستقبل پر بھی بری طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ اور ایک نسل کی کرپشن کا نقصان دوسری نسل

اٹھاتی ہے۔ اس شعبے میں خصوصاً ایگزامینیشن سیکشن میں ایمان دار افسران کی تقرری
اور کرپشن کرنے والوں کے لیے کڑی سزائیں اس شعبے کی کرپشن کو ختم کرنے کا سبب
بن سکتی ہیں۔

اساتذہ : رویہ تعلیم میں مددگار

اساتذہ کا اچھا یا برا رویہ جماعت اور جماعت سے باہر بچوں کی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔اساتذہ کا رویہ یا تو طالب علموں کو تعلیم کی جانب راغب کرتا ہے تا ان کے دل سے تعلیم کی رغبت کو بالکل ختم کر دیتا ہے حد سے بڑھی ہوئی سخت گیری طالب علموں کو تعلیم سے دور کرنے کا سبب بنتی ہے۔ اور بعض اوقات طالب علم کے دماغ میں اس سخت گیری کی وجہ سے ایک گرہ پڑ جاتی ہے جو تمام عمر اس کے ساتھ رہتی ہے۔ جس سبق پر حد سے زیادہ سرزنش کی جائے وہ سبق طالب علم کبھی نہیں سیکھ پاتا۔

اس کی مثال خود میری اپنی ذات ہے۔ میری اپنی زندگی میں ایک ایسا واقع گزرا جس کے اثرات زندگی کے کئی برس گزر جانے کے بعد بھی آج تک میرے ساتھ ہیں۔ بچپن میں مجھے اردو کا حرف " ی "لکھنے میں دقت ہوتی تھی میں اس حرف کو درست طریقے سے لکھ نہیں پاتی تھی۔ مجھے حرف سکھانے والے استاد کے پاس ایک مسواک ہو کرتی تھی جس کو وہ پڑھانے کے دوران بھی استعمال کیا کرتے تھے اور کسی کی غلطی پر یہی مسواک ہاتھوں پر مارا کرتے یا اس مسواک کو ہاتھوں کی انگلیوں میں پھنسا کر دبایا کرتے جس سے ہاتھوں میں شدید درد ہوتا۔ بظاہر یہ کوئی

بہت بڑی بات نہ تھی تاہم اس سزا کا اپنا ایک خوف تھا۔ان کی اس مار کی وجہ سے ہر ایک کے دل میں ایک خوف سا رہتا اور سب کی کوشش ہوتی کہ وہ بہتر سے بہترین لکھ پائیں۔ میں بھی انھی طالب علموں میں سے تھی جو حد سے زیادہ احتیاط سے لکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں " ی "درست نہ لکھ پائی۔ میرے استاد مجھے اکثر لکھنے کے دوران " ی "درست نہ لکھنے پر دائیں ہاتھ کی پشت پر مارا کرتے۔ وہ مجھے جب بھی سکھانے بیٹھتے میرے ذہن میں یہی بات ہوتی کہ اب میرے ہاتھ پر مسواک سے مارا جائے گا۔ یہ سوچمیرے دماغ کو لکھنے سے زیادہ توجہ استاد کے ہاتھ میں پکڑے مسواک پر مذکور رکھتی۔ میں ہمیشہ " ی "درست نہ لکھ سکنے پر مار کھانے کے باوجود کبھی ی درست نہیں لکھ سکی۔ اور میری یہ خامی آج تک میرے ساتھ ہے۔ میں آج بھی " ی "درست نہیں لکھ پاتی۔ہمارے یہاں یہ سوچ عام ہے کہ مار یا ڈانٹ کے ڈر سے بچوں کو بہتر سکھایا جاسکتا ہے۔درحقیقت ایسا نہیں ہے اگر کوئی بچہ ایک ہی غلطی بار بار دہراتا رہے اور اسی غلطی پر مار کھاتا رہے تو اس وہ غلطی کبھی نہیں سدھر پاتی۔مار پیٹ یا ڈانٹ ڈپٹ ایک حد میں رہتے ہوئے بچوں کو سدھانے کے کام ضرور آئی ہے لیکن غلطی پر مار پیٹ کے بعد بھی غلطی کا نہ سدھرنا دراصل یہ ایک نفسیاتی عمل ہے جس کے بارے میں ہمارے سکولوں بالخصوص گورنمنٹ سکولوں میں کوئی شعور ہے ہی نہیں۔ہمارے معاشرے میں ابھی تک یہی سوچ رائج ہے کہ کسی کی بہتر تربیت تب کی جا سکتی ہے جب اس پر حد سے زیادہ سختی کی جائے۔

یہ سوچ خصوصا سکولوں کے اساتذہ میں زیادہ دکھائی دیتی ہے۔

پاکستان میں پرائیویٹ سکولوں میں کام کرنے والے اساتذہ تو شائستہ لب و لہجہ رکھتے ہیں اور مار پیٹ سے بھی گریز کرتے ہیں۔اگر پرائیویٹ سکولوں میں اساتذہ مار پیٹ کا سہارا بھی لیں تو صرف اشد ضرورت کے تحت۔ کیونکہ اگر وہ غیر شائستگی کا مظاہرہ کریں گے تو انھیں اس کے لیے پرنسپل کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔پرائیویٹ سکولوں کے برعکس گورنمنٹ سکولوں کے اساتذہ نسبتا سخت گیر ہوتے ہیں اور بچوں کو اپنی رعایا سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ گورنمنٹ سکولوں میں مار اور ڈانٹ ڈپٹ ایک عام سی بات ہے جس کا شکار صرف طالب علم ہی نہیں بلکہ اس کے والدین بھی ہوتے ہیں۔ گورنمنٹ سکولوں میں والدین کی بھی عزت نہیں کی جاتی اور ان سے نہایت ہی غیر شائستہ انداز میں بات کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ گورنمنٹ سکولوں میں اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافے کے باوجود طلبہ پر کسی قسم کی کوئی توجہ نہیں دی جاتی بلکہ زیادہ سے زیادہ ذمہ داری والدین پر ڈالی جاتی ہے کہ والدین بچوں کو سکھائیں اور استاد کو کم سے کم محنت کرنا پڑے۔ اساتذہ کے اس رویے کے متعلق ایک واقع میری نظر سے گزرا ۔جس کو پڑھ کر میرا دل خون کے آنسو رویا کہ آج اکیسویں صدی میں ہوتے ہوئے بھی ہمارے سکولوں میں اساتذہ کا رویہ کس قدر نا قابلِ تنقید ہے۔ واقع کچھ یوں ہے

ایک بچے نے قبرستان میں جا کر اپنی ماں کی قبر پر جا کر روتے ہوئے اپنا بستہ اس کی قبر پر پھینکا اور کہا۔ چل اٹھ !اور چل میرے ساتھ اور جا کے جواب دے میری ٹیچر کو جو روزانہ مجھے کہتی ہے کہ تیری ماں انتہائی لاپرواہ ہے جو نہ تو تجھے اچھی طرح تیار کر کے بھیجتی ہے اور نہ ہی اچھی طرح سبق یاد کرواتی ہے۔یہ واقع ہمارے اساتذہ کے رویے کی منہ بولتی تصویر ہے کہ ہمارے سکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طالبِ علموں کی مائیں اگر اس دنیا سے اٹھ چکی ہیں تو ان پر توجہ دینے کے لیے کوئی استاد موجود نہیں بلکہ انھیں ہر روز اس بات پر ڈانٹ اور طنز کا سامنا ہے کہ ان کی مائیں لاپرواہ ہیں۔

آیئے اب ذرا اس تمام رویے کی وجوہات کا جائزہ لیں ۔ اس غیر شائستگی کی وجوہات میں سے ایک تو یہ ہے کہ گورنمنٹ سکولوں میں کوئی استاد طالبِ علموں یا ان کے والدین سے چاہےجیسا بھی رویہ اختیار کر لیں انھیں کوئی پوچھنے والا نہیں ۔ وہ اپنے ہر عمل میں چاہے وہ اچھا ہو یا برا اس میں آزاد ہیں ۔ اس رویہ کی دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ گورنمنٹ سکولوں میں نسل در نسل ایک ہی استاد پڑھاتا ہے۔جوانی سے لے کر ایک مخصوص عمر تک استاد نوکری پر رہتا ہے، اس دوران انھیں کسی قسم کے نہ تو کوئی ریفریشر کوسز کروائے جاتے ہیں۔کتب میں تبدیلیوں کے بارے میں بھی اساتذہ کو زیادہ علم نہیں ہوتا۔اس کی ایک

بڑی مثال فیڈرل گورنمنٹ کے ایک سکول کی ہے جہاں سے میری پھپھو نے 1985 سے میٹرک کیا۔ انھوں نیجس استاد سے ساتویں جماعت میں حساب پڑھا۔ اسی استاد سے میری بہن نے 2004 اور آج میری ایک کزن ساتویں میں اسی استاد سے حساب پڑھ رہی ہے۔ان تمام سالوں میں ان اساتذہ کو کوئی ریفرشر کورسز نہیں کروائے گئے۔ نصاب میں تبدیلی تو ہوئی اس تبدیلی کو پڑھانے کے لیے بازار میں موجود (حل شدہ مشقوں) خلاصے کا سہارا لیا جاتا ہے اور بچوں کو بھی یہ حل شدہ مشقیں خریدنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ بچے حساب تک حل شدہ مشقوں کے سہارے پڑھ رہے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان تمام سالوں میں اس ٹیچر کا علم زمانے کی مناسبت سے پرانا نہیں ہوا ؟ اس کے علاوہ اس کی صحت میں بھی فرق آیا ہوگا۔ جو استاد 1985 میں کہیں اچھی تعلیم دے سکتا تھا آج اس کی صحت کیا اسی سطح کی تعلیم دینے کی اجازت دیتی ہے ؟ ان حالات کی ایک اور مثال وہ بچی ہے جو حال ہی میں میرے پاس ٹیوشن پڑھنے کی غرض سے آئی۔ وہ میٹرک کی طالب علم ہے اور حسابمیں خاصی کمزور ہے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہحساب کی ٹیچر کلاس میں آکر کتاب کھول کر موضوع کا نام پڑھتی ہے اور کہتی ہے۔ یہ تو بڑا آسان ہے۔ میں ابھی کرواتی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اسے ساتھ والی کلاس کی ٹیچر سے کوئی ضروری کام پڑھ جاتا ہے جیسے فلاں دکان پر سیل لگی ہے۔ فلاں کی شادی فلاں سے ہوئی، فلاں کی چغلی، فلاں کی بدخوئی۔ اسی دوران اگر کلاس میں بچیاں باتیں کرنے لگیں اور شور مچ جائے تو وہ خفا ہو

کر کلاس سے چلی جاتی ہے اور اسی طرح اس کا پیریڈ ختم ہو جاتا ہے۔ کم و بیش روا رنہ ہی یہی ہوتا ہے۔ ذرا اندازہ کیجیے حساب جیسے ثقیل مضمون کی استاد کا یہ حال ہے تو باقی مضامین کی اساتذہ کا کیا حال ہو گا۔

اسی ٹاپک پر میری بات وقارنساء میں پڑھانے والی ایک ٹیچر سے ہوئی تو ان کا کہنا تھا۔ میں نے اپنا مستقبل تو نہیں بنانا جو محنت کروں یا خود پر بوجھ لوں۔ کوئی ان سے پوچھے کہ وہ اپنا تو نہیں لیکن ملک کا مستقبل تو بنا رہی ہیں۔ اور اگر تباہ ہو گا تو ان ایک کا نہیں بلکہ ان کی جماعت میں موجود پچاس سے ساٹھ لڑکیوں کا مستقبل داؤ پر ضرور لگ جائے گا۔ یہ وہ استاد ہیں جو کہ اپنے فرائض سے غافل ہیں اور کوئی پکڑ نہ ہونے کی وجہ سے انھیں کسی قسم کا کوئی خیال نہیں۔ان اساتذہ سے اگر کسی طالبِ علم کے والدین کچھ بولیں بھی تو والدین کی اس شکایت کا انتقام ان کے بچے سے لیا جاتا ہے۔ جو کہ غیر معمولی سختی یا غیر معمولی طنز کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

توجہ طلب امر یہ ہے کہ گورنمنٹ سکولوں میں بھی ایک ایسا نظام بنایا جائے جس کے تحت ان سکولوں میں پڑھانے والے اساتذہ کو بھی کسی کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے۔ سکولوں میں وقتاً فوقتاً ڈی ای او کا بنا بتائے دورہ اساتذہ کی کارکردگی کو بہتر بنا سکتا ہے۔ایسا نظام واضع ہونا ضروری ہے جس کے تحت

اساتذہ بھی کسی اتھارٹی کے سامنے جوابدہ ہوں۔ وہ اساتذہ جو کئی سالوں سے پڑھا رہے ہیں انھیں ریفرشر کورسز کروائے جائیں تاکہ وہ نئے نصاب اور وقت کے بدلتے تقاضوں کے ہم آہنگ ہو سکیں۔

ادب پہلا قرینہ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

فارسی میں حکیم لقمان کی ایک حکایت ہے جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے حکیم لقمان سے کسی نے پوچھا آپ نے کہا۔ادب کہاں سے سیکھا؟ انھوں نے جواب دیا۔ بے ادب لوگوں سے ۔یعنی اگر کسی بے ادب انسان کے رویے کا جائزہ لیں تو آپ کو اس بات کا اندازہ ہوگا کہ وہ شخص اپنے اردگرد کے لوگوں میں کیا مقام رکھتا ہے۔ لوگ اسے کن الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔ کسی بھی بے ادب انسان کے بارے میں لوگ اچھی رائے نہیں رکھتے۔ اسے عزت کی نگاہ نہیں دیکھا جاتا۔

حدیثِ نبوی ﷺ کا مفہوم ہے کہ وہ ہم میں سے نہیں جو بڑوں کا احترام نہ کرے اور چھوٹوں سے پیار نہ کرے۔

بڑوں کا احترام ایک طرح سے ایمان کا حصہ ہے اور اس شخص کو مسلمانوں کی صف سے خارج سمجھا گیا جو دوسروں کی عزت واحترام کا خیال ملحوظِ خاطر نہ رکھا جائے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ادب واحترام ہمارے معاشرے سے ناپید ہوتا جارہا ہے۔

حکایت سعدی میں ایک واقع کچھ یوں نقل کیا گیا۔ کسی زاہد و عابد شخص اور خوش

خصال کے پاس ایک ایسا غلام تھا جو اپنے آقا کے مقابلے میں بد خصلت اور بری عادات کا مالک تھا۔ وہ کام کاج میں سست اور کاہل تو تھا ہی بد اخلاق بھی تھا۔ ایک روز اس بزرگ شخص کے گھر میں ایک بہت ہی معزز مہمان آیا۔ اس نے غلام کو دیکھ کر اپنے دوست میزبان سے پوچھا کہ اس نے غلام میں کون سی ایسی خوبی دیکھی ہے کہ اس جیسے بد خصلت انسان کو برداشت کر رہا ہے۔ اس نے دوست کو مشورہ دیا کہ اس غلام کو بیچ دے اور کوئی اچھا غلام لے آئے۔ دوست کی بات سن کر اس زاہد و عابد شخص نے جوب دیا دیا۔ دوست ! تم نے جو کچھ کہا ہے وہ سو فی صد درست ہے مگر میں نے تو اس کی بری عادتوں کو دیکھ کر اپنی عادات درست کی ہیں۔ میں نے اسے اتنا برداشت کیا ہے کہ اب مجھے اسے برداشت کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔ اب یہ بے مروتی ہو گی جو میں اس غلام کو فروخت کر دوں۔

ہماری نسل کا المیہ یہ ہے کہ ہم یہ تو چاہتے ہیں کہ ہمارا ادب واحترام کیا جائے، ہمیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے لیکن ہم خود کسی کو عزت دینے کو تیار نہیں۔ والدین کی عزت واحترام اب اس طرح سے نہیں کی جاتی جس طرح سے والدین کا حق ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے گھروں کی حالت یہ ہے کہ بچوں کے سامنے ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے سے گریز نہیں کیا جاتا۔ گھر کے بڑوں میں برداشت کا مادہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ عموما دیکھا گیا ہے کہ باپ بچوں کے

سامنے ان کی ماں کو برا بھلا کہتا ہے بچوں کے سامنے لڑائی جھگڑے سے جہاں ان کی نفسیات پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں وہاں وہ بد تمیزی اور بد تہذیبی سیکھتے ہیں اور اور عدم برداشت کا رویہ بچپن سے ہی ان کی عادتِ ثانیہ بن جاتا ہے۔ یہ بچے جب جوان ہوتے ہیں تو جو رویہ بچپن سے وہ دیکھتے آرہے ہیں وہی رویہ وہ عملی زندگی میں اپناتے ہیں۔یہی بچے جب بڑے ہوتے ہیں تو معاشرے کے مفید شہری بننے کی بجائے معاشرے میں بگاڑ کا سبب بنتے ہیں۔ بچے بڑے ہو کر عدم برداشت کا مظاہرہ کرتے ہیں ۔ نوجوانوں کو تنقید کا نشانہ بنانے والوں کو ان کے بچپن میں اپنے رویے کا جائزہ لینا ہو گا ۔اور آج کے نوجوان کو اپنے بچوں کے لیے رول ماڈل بننا ہو گا۔

صرف ایک گھر کی سطح پر نہیں بلکہ ملکی سطح پر بھی ہمارے یہاں کسی کے کام پر تنقید کی بجائے دوسروں کی ذات کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ تنقید اگر کام پر ہو تو اس کے مثبت اثرات سامنے آ سکتے ہیں لیکن جب بات ایک دوسرے کی ذاتیات پر آ جائے تو کارکردگی بہتر ہونا تو درکنار الٹا یان بازی کے ایک سلسلے کا آغاز ہو جاتا ہے۔اور اس طرح عملاً نہ تو کوئی مسئلہ حل ہو پاتا ہے اور نہ ہی کسی کی کارکردگی میں بہتری آتی ہے۔

کسی بھی سیاسی پارٹی کو ہی لے لیں ، کسی جلسے کو اٹھا کر دیکھ لیں سیاسی

رہنما اپنے حریفوں کو اس طریقے سے مخاطب کرتے ہیں جو کسی طور پر تہذیب کے دائرے میں نہیں آتا اور بعض اوقات تو رہنماؤں کے الفاظ انتہائی حد تک نازیبہ ہو جاتے ہیں ۔ مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنما ایک دوسرے کو فرعون اور طالبان کہنے سے نہیں چوکتے ۔۔ یہی نہیں سیاسی رہنما جلسوں ، پارلیمنٹ ، اور قومی اسمبلی میں ایک دوسرے کو اس طرح للکارتے ہیں جیسے کوئی پہلوان کشتی کے لیے اپنے حریف کو للکارے ۔ صرف سیاسی جماعتوں کے رہنما ہی نہیں ہمارے عہد کے علماء بھی جوشِ خطابت میں دوسرا مکتبہء فکر رکھنے والوں کو کافر، اسلام سے خارج قرار دیتے ہوئے نہیں چوکتے ۔ اس طرح کے خطابات سے دو فرقوں کے مابین اختلافات بڑھتے چلے جاتے ہیں ۔ صرف یہی نہیں بعض اوقات تو رہنما یہاں تک کہتے پائے جاتے ہیں کہ خدا کی عدالت میں فلاں کا انجام برا ہے یا فلاں پر لعنت ہو اس طرح کی باتیں کی جاتی ہیں ۔ یہ باتیں نہ صرف عالمی سطح پر ملک کی جگ ہنسائی کا باعث بنتی ہیں بلکہ ان جلسوں میں شامل نوجوانوں اور بچوں کی نفسیات پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اسلام اس طرح کے بیانات کی شدید مذمت کرتا ہے ۔

حدیث شریف ﷺ میں بیان ہوتا ہے حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ میں نے آپ ﷺ کو فرماتے سنا کہ کوئی شخص کسی کو فسق وکفر کے ساتھ متہم نی کرے اس لیے کہ وہ اس کا اہل نہ ہوگا تو وہ کفر و فسق اسی کی طرف لوٹ آئے گا ۔ (صحیح بخاری

)

اہم اور غور طلب بات یہ کہ ایک عام آدمی کے الفاظ چند محدود لوگوں تک ہی پہنچتے ہیں اور محدود لوگوں کا گروہ ہی ان الفاظ سے متاثر ہو سکتا ہے۔اس گروہ میں اس کے اپنے خاندان کے لوگ، اس کے دوست یا وہ لوگ جو اس کے ساتھ کام کرتے ہیں شامل ہیں ۔اس کے برعکس کسی سیاسی یا مذہبی رہنما کے الفاظ اور اس شخص کے بات کرنے کا انداز معاشرے کے ہر طبقہ تک پہنچتے ہیں اور ہر طبقہ ان الفاظ کو اپنی سوچ کے مطابق اپنے خیال کے مطابق محسوس کرتا اور اس پر عمل کرتا ہے۔ خصوصا مذہبی رہنماؤں کے الفاظ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور ان کے الفاظ معاشرے کے ایک بڑے طبقے کو متاثر کرتے ہیں۔ مذہبی رہنما اگر جوشِ خطابت میں بھی کسی کو برا بھلا کہتے ہیں تو ان کی بات کو حرفِ آخر سمجھا جاتا ہے۔ لوگ ان کی باتوں پر عمل بھی زیادہ کرتے ہیں ۔اس لیے سیاست دانوں، علماء اور رہنماؤں پر ایک بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی زبان کو شائستہ رکھیں اور تنقید تہذیب کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے کریں۔ جوشِ خطابت میں بھی کسی کو فرعون یا دین سے خارج قرار نہ دیں۔

ذرا سوچیئے ! جو نوجوان یا بچے ان جلسوں میں شامل ہوتے ہیں یا یہ جلسے ٹی وی پر لائیو دیکھ رہے ہوتے ہیں وہ کیا سیکھ رہے ہیں ؟ بد تمیزی اور بد

تہذیبی ۔اور کل کو وہ جب عملی زندگی کا آغاز کریں گے تو وہ کس کی پیروی کریں گے ؟ آج کا بچہ وہی کچھ سیکھے گا جو وہ اپنے بڑوں کو کرتے دیکھے گا۔ کیونکہ بچوں کے لیے ان کے والدین ، اساتذہ اور ارد گرد کا ماحول ان کی عادات کو فطرت بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ بچوں نے وہ یکھنا ہے جو ان کے بڑے کر رہے ہیں اور کل کو انھوں نے بھی یہی کرنا ہے۔ نئی نسل کی بہتر نشو و نما کے لیے ضروری ہے کہ آج کی نسل اپنے رویے کو بہتر بنائے ۔اپنی ذمہ داریوں کو پہچانے اور ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی حتیٰ المقدور کوشش کرے ۔اگر ہر شخص اپنی ذمہ داری کو نبھائے گا تو معاشرہ ایک فلاحی معاشرہ کی تصویر پیش کرے گا۔

(عورت ہر روپ محبت (ماں

میرا یہ کالم ان تمام ماؤں جنھوں نے اپنی زندگی کے شب و روز آگ کے بھرے انگاروں پر چلتے ہوئے گزار دیتی ہیں ۔ان تمام ماوؤں کے نام جنھوں نے اپنی جوانی اپنی اولاد کے نام کیں اور جب اان کی اولاد جوان ہوئی تو انھی کو بار خیال کرنے لگتی ہے ۔ ن تمام ماؤوں کے نامجن کی کوکھ سے جنم دینے والے بیٹے.ڑھاپے میں انھیں بھول جاتے ہیں ۔ جن کے احسانات تو اس حد تک زیادہ ہیں کہ ان کا شمار کرنا ہی ممکن نہیں ۔ کیونکہ ماں ہی وہ ہستی ہے جو اللہ کے بعد اولاد کی تخلیق اور اس دنیا میں لانے کا سبب بنتی ہے، جو اپنا سب کچھ اولاد کے لیے قربان کر دیتی ہے اس کی تربیت ، تعلیم ، کھانا پینا ، پہننا اوڑھنا سبھی کی ذمہ داریاں اٹھاتی ہے ۔ اس کے باوجود اگر ان کی اولاد ان سے اچھا سلوک نہ کرے تو اسے بددعا نہیں دیتی اس کے ہاتھ اگر اٹھتے ہیں تو صرف اور صرف دعا کے لیے ۔ ماں ہی وہ واحد ہستی ہے جو اولاد کی بد تمیزی کے جواب میں بھی انھیں پیار اور محبت سے نوازتی ہے ۔بوڑھے ماں باپ بالخصوص ماں کی دعائیں کسی کی بھی دنیا و آخرت سنوار سکتی ہیں ۔

ماں کی دعا کی قبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ کی والدہ ماجدہ جب انتقال فرما گئی اور وہ کوہ طور سے واپس آ رہے

تھے تو ندا آئی۔

اے موسیٰ ! آہستہ چل اب تیرے پیچھے دعا کے لیے اٹھنے والے ہاتھ نہیں ہیں

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمارا معاشرہ جہاں بہت سی برائیوں کا شکار ہو رہا ہے۔ وہاں والدین کی عزت و احترام میں بھی خاطر خواہ کمی ہوئی۔ ابھی حال ہی میں میری نظر سے ایک نہایت ہی افسوس ناک واقعہ گزرا۔ لڑائی جھگڑے تو ایک طرف ایک بیٹے نے اپنی بوڑھی ماں کو گھر سے باہر نکال کر گلی میں گالیاں دیں اور مارا پیٹا۔ وہ ماں اس قدر بوڑھی ہو چکی ہے کہ اس کی بینائی نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ اس آخری عمر میں وہ کام کاج کرنے کے قابل بھی نہیں رہی۔ اس کا قصور یہ ہے کہ وہ اپنی بہو پر تنقید کرتی رہتی ہے۔ جس طرح ہر بوڑھے شخص کا المیہ یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ اس کو سنا جائے اور اس کی ہر بات مانی جائے۔ اسی طرح اس عورت کا بھی یہی المیہ ہے کہ اس کی اولاد اسے وقت دے، ان کی ہر بات کو مانے۔ بوڑھے لوگ عموماً جوانوں پر تنقید بھی زیادہ کرتے ہیں کیونکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ انھوں نے دیکھا یا جو انھوں نے تجربے کے بل پر سیکھا وہ نئی نسل میں منتقلکر دیا جائے اور انھیں ان غلطیوں سے بچایا جائے جو بے خبری میں ان سے سرزد ہوئی۔ اسی طرح وہ بھی اپنی بہو

پر تنقید کرتی اور شاید اسے گالیاں بھی دیتی ہوں گی۔ اس تنقید کا نقصان انھیں یہ ہوا کہ انھی کے اپنے بیٹے نے انھیں گھر سے باہر نکال کر محلے میں مارا پیٹا اور، ان سے بد تمیزی کی اور سرعام گالیاں دی۔ یہ وہ عورت ہے جس نے اپنی جوانی میں بچوں کو پالنے کے لیے بہت محنت کی اور اپنی پوری جوانی حسرتوں کے نام کرتے ہوئے اولاد کو پروان چڑھایااور جب وہ کڑیل جوان ہوگئے تو انھوں نے اسی ماں سے اپنی حسرتوں کا حساب مانگنا شروع کر دیا۔ انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ اس عورت نے انھیں پالنے پوسنے کے لیے نہ جانے کون کون سی مشکلات کا سامنا کیا ہوگا۔ اور جس حد تک ممکن ہوگا اس نے زمانے کے سرد و گرم سے بچانے کی کوشش کی ہو گی۔

راولپنڈی کے اس مکین کی اپنی ماں سے حد درجہ بد تمیزی ہمارے معاشرے میں مذہب سے دوری، احکامات الٰہیہ سے بے خبری اور والدین سے بد تمیزی کی صورت میں عذاب سے لاعلمی کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے۔ایک اسلامی معاشرے میں بسنے والے مسلمان بیٹے کے لیے اس طرح کی حرکت نہایت ہی شرم ناک اور افسوس ناک عمل ہے ۔ اس شرمناک عمل کا نہ تو کوئی معاشرہ اجازت دیتا ہے اور نہ ہی کوئی مذہب مبادا کہ مذہب اسلام جو تمام مذاہب میں حقوق العباد کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اسلام میں تو ماں کا یہ مقام ہے کہ جنت ماں کے قدموں تلے رکھ دی گئی ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے ہم نے آدمی کو اس کے ماں باپ کے بارے میں تاکید فرمائی ہے، اس کی ماں نے اسے پیٹ میں رکھا، کمزوری پر کمزوری جھیلتی ہوئی اور اس کا دودھ چھوٹنا دو برس میں ہے کہ یہ حق مانے میرا اور اپنے ماں باپ کا (سورت لقمان : آیت ۱۴ ۔)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول ﷺ کو یہ کہتے سنا۔ وہ شخص غرق ہوا۔ پوچھا گیا کون؟ رسول ﷺ نے فرمایا جس نے اپنے ماں باپ کو بڑھاپے میں پایا اور ان کی خدمت کرکے جنت حاصل نہ کرسکا۔ (صحیح مسلم 6189)

صحیح بخاری میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ عورت پر اس کے شوہر کا حق سب سے زیادہ ہے جبکہ مرد پر اس کی ماں کا۔

الغرض اسلام میں والدین کے ساتھ بدسلوکی یا جس طرح اس بیٹے نے اپنی ماں کو مارا پیٹا اس طرح کے کسی عمل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مذہب کے ساتھ اخلاقیات کی رو سے بھی یہ عمل نہایت افسوس ناک ہے کیونکہ ادب کا تقاضا ہے کہ جس عورت نے اچھی یا بری جیسی بھی آپ کی تربیت کی اپنی جوانی آپ کے لیے وقف کر دی ہے جب بوڑھی ہو جائے، آپ اس کا خیال نہیں بھی رکھ سکتے تو اس

کو یوں سر عام مارنا پیٹنا، یا گالیاں دینا کسی غیرت مند شخص کا شیوہ نہیں اور خاص الخاص اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ والدین کو بوڑھا ہونے پر مارا پیٹا جائے بلکہ اسلام کو یہاں تک کہتا ہے کہ والدین کے بڑھاپے میں ان کے آگے اف تک نہ کی جائے ۔بوڑھے ماں باپ کا خیال رکھنا ایک معاشرتی اور مذہبی ذمہ داری ہے ۔ ماں باپ خصوصا ماں کے خلاف ایسا رویہ اختیار کرنا جو بد تمیزی اور بداخلاقی کا مظہر ہو ں وہ میری نظر میں کسی گناہ کبیرہ سے کم نہیں ۔ اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بیٹے اپنی شادیوں کے بعد اگر ماں اور بیوی کے درمیان اختلافات ہونے لگیں تو وہ ان کے بیچ انصاف کرنے کی بجائے کسی ایک کے ساتھ بے انصافی کر جاتے ہیں ۔اس کے علاوہ،خوش اخلاقی، تمیز داری، اور تہذیب کے دائرے میں رہنا ایک ایسا قرض ہے جو آپ خود پر چڑھاتے ہیں ۔ اگر آج آپ اپنے والدین سے بہترین سلوک کریں گے تو کل کو آپ کے بچے آپ کے ساتھ یہی سلوک کریں گے ۔ کیونکہ بچے آپ سے اگر خوش اخلاقی اور تمیز داری یا بد تمیزی اور بد تہذیبی سیکھتے ہیں تو کل کو وہ عملا یہ بد تمیزی آپ کے ساتھ کریں گے ۔

مرد پر اللہ نے ایک بہت بڑی ذمہ داری عائد کی ہے کیونکہ اسے ماں اور بیوی دونوں ہی کے ساتھ اچھا برتاؤ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور بہترین مرد وہ ہے جو نہ صرف اپنی ذمہ داریوں کو سمجھے بلکہ ان کو احسن طریقے سے سر

انجام دینے کی کوشش بھی کرے۔ بہوؤں کو بھی اپنی ساس کو اپنی ماں کا درجہ دینا چاہیے تاکہ گھروں میں سکون رہے۔

بوڑھے والدین درحقیقت ایک ذمہ داری اور ذمہ داری کے ساتھ ساتھ اللہ کی بہت بڑی رحمت بھی ہیں۔ ذمہ داری اس طرح کہ آپ کو ان کی تنقید ان کا غصہ برداشت کرکے ان کی کفالت کرنا ہوتی ہے، ان کا نان نفقہ پورا کرنا ہوتا ہے، بیماری کی صورت میں ان کی ادویات کا خرچا اٹھانا ہوتا ہے جیسے انھوں نے بچپن میں آپ کی کفالت کی اور رحمت اس طرح کہ اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کو جس کے والدین بوڑھے ہوں انھیں ایک موقع دیتا ہے کہ وہ اپنی دنیا، (ماں باپ کی دعاؤں سے) اور اپنی آخرت اللہ کے حکم کی بجاآوری سے سوار سکتے ہیں۔ گویا جنت کمانے کے لئے والدین کی خدمت کو اپنا شعار بنایا جائے تو آخرت کے ساتھ ساتھ دنیا بھی سنواری جا سکتی ہے۔ الغرض ہر ایک کو اپنی اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے اپنے اعمال کو بہتر سے بہترین بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ توجہ طلب امر یہ ہے کہ والدین کو ذمہ داری نہیں بلکہ اللہ کی رحمت سمجھتے ہوئے ان کی خدمت اور تابعداری کی جائے۔

(عورت ہر روپ محبت (بیوی

عورت چاہے ماں ہو، بیٹی ہو، یا بیوی ہر ایک روپ میں سراپا محبت اور قربانی ہے۔ عورت چاہے جس روپ میں ہو وہ سراپاء قربانی، سراپاء محبت ہے۔ عورت جب بیوی بنتی ہے تو اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں اور اس درو دیوار کو جس میں وہ ایک عرصے سے رہ رہی ہوتی ہے اسے چھوڑ کر نئے گھر میں آتی ہے۔ عورت بیوی کے روپ میں بہت سی ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر اٹھائے ان کو احسن طریقے سے نبھانے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ وہ مرد کی عزت کی امین ہے۔ اس کی نسل کی تعلیم و تربیت کی ذمہ دار ہے۔ اگر عورت دین دار، باتہذیب ہو تو ایک نسل سنور سکتی ہے۔ اس کے برعکس اگر عورت از خود دین سے بے بہرہ ہو تو وہ نسلوں کی تربیت کس طرح سے کر سکتی ہے؟ یہاں ذکر ان بیویوں کا کرنا چاہوں گی جو اپنے شوہروں کے شانہ بشانہ کھڑی ہیں۔ ان کی مالی مشکلات کو کم کرنے کے لیے نوکری کرتی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ اپنا گھربار اور بچے سنبھالتی ہیں۔ اور اس تمام میں کہیں کوئی کوتاہی ہو جائے تو سارے کا سارا الذام عورت کے سر ڈال دیا جاتا ہے۔ تعلیم یافتہ عورتیں ملازمت اختیار کرتی ہیں جبکہ جن کے پاس تعلیم نہیں ہے وہ کپڑے سی کر، لوگوں کے گھروں میں کام کرکے اپنے شوہر کا مالی طور پر برابر کا ساتھ دیتی ہیں۔ یہ تو وہ خواتین

ہیں جن کے شوہر مالی لحاظ سے کمزور ہیں لیکن کوئی نہ کوئی کام کاج کرتے ہیں ،ان کے علاوہ وہ خواتین بھی ہیں جو کہ بیوہ ہیں یا جن کے شوہر کام کاج نہیں کرتے یا نشے کی لت کا شکار ہو کر اپنی زندگیاں برباد کر چکے ہیں ۔ ایسی خواتین گھر، باہر ہر جگہ کی ذمہ داریاں اکیلے اٹھاتی ہیں ۔ یہ ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے اپنی زندگیاں گزار دیتی ہیں ، زیادہ تر ان کی ان کوششوں کو سراہنے کی بجائے یہ کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے کہ تم نے کیا ہی کیا ہے ؟

حال ہی میں میری ملاقات ایک ایسی خاتون سے ہوئی جو کہ انتہائی کسمپسری کی حالت میں بھی بچوں کی خاطر اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہی ہے ۔اس کا شوہر نشے کا عادی ہو کر اپنی ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہو چکا ہے وہ تمام دن گھر سے باہر گزارتا اور رات کو گھر میں صرف اور صرف اس عورت سے پیسے لینے کی غرض سے نشے میں دھت آ کر سو جاتا ہے ۔یہ عورت سارا دن نوکری کرتی ، گھر جا کر کپڑے سیتی ، گھر کا کام کاج کرتی ، بچوں کے سکولوں اور کالجوں کے کام نبٹاتی اور یہاں تک کہ تنِ تنہا ان کے مسائل حل کرتی ہے ۔اس کا شوہر پیسے کی خاطر مار پیٹ کرتا ہے اور پیسے ہتھیا لیتا ہے ۔ غربت اور شوہر کے نشئی ہوتے ہوئے بھی وہ اسے نہیں چھوڑنا چاہتی کیونکہ وہ اس کے سر کی چھت ہیں ۔۔برائے نام ہی سہی وہ کسی حد تک محفوظ ہے ۔ یہ ہمارے معاشرے کے المیوں میں سے ایک بہت بڑا

المیہ ہے کہ یہاں جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ عورت اکیلی یا بے آسراء ہے تو ہر شخص اس سے ہمدردی جتا کر اس کی ذات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ اس کی مدد کی جائے اسے مزید پریشان کر کے اس کی مشکلات میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

یہ تو ان خواتین کا ذکر ہے جو کہ ان پڑھ ہیں ہمارے معاشرے میں پڑھی لکھی خواتین کے ساتھ بھی کچھ زیادہ اچھا رویہ نہیں رکھا جاتا۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ مرد اپنی انا کی تسکین یا غصہ میں اپنی بیویوں کو مارتے پیٹتے ہیں ۔ان پر شک کرتے ہیں ۔مار پیٹ کا رویہ تو اتنا عام ہے کہ بعض اوقات مرد خود کو برتر ثابت کرنے کے لیے اور مردانگی کے اظہار کے طور پر مار پیٹ کا سہارا لیتے ہیں اور اس حرکت کے لیے قرآن کی آیات کا سہارا لیتے ہیں ۔ہمارے اس حبس زدہ معاشرے میں تو یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ عورتیں اپنی پوری زندگی ایک ایسے شخص کے ساتھ گزار دیتی ہیں جو ان کو کبھی سکون کی زندگی فراہم نہیں کر پاتا۔ عورت کا یہ حق ہے کہ اسے سکون فراہم کیا جائے ۔ اس کے نان نفقے کا خیال رکھا جائے ۔ اکثر و بیشتر دیکھنے میں آیا ہے کہ عورتیں اپنے والدین ، بہن بھائیوں کے لیے قربانی دیتی ہیں اور معاشرے کی بندشوں میں جکڑی اپنی عزت بچانے کی تگ و دو میں ساری زندگی گزار دیتی

ہیں۔اس کی دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ ایسی عورتیں اپنی اولاد کی خاطر سب سہتی رہتی ہیں ۔اسلام عورت کے ساتھ اچھا رویہ اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفی ﷺ کی سیرتِ مبارکہ اور آپ ﷺ کی عائلی زندگی بیویوں کے ساتھ احسن سلوک کا منہ بولتا ثبوت اور تمام مسلمانوں کے لیئے مشعلِ راہ ہے۔ عورت کو اسلام اس حد تک مقدس حیثیت دیتا ہے کہ قرآن میں دو سورتیں (سورت النساء اور سورت نور) خالصتاً عورت کے حقوق اور ان کے بارے میں حدود و قیود کے بارے میں نازل فرمائی گئی ۔ان سورتوں کے علاوہ متعدد حدیثوں میں عورتوں کا خصوصا خیال کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ نبی پاک ﷺ کا ارشاد ہے۔میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ کسی شخص کو اس حالت میں دیکھوں کہ اس کی گردن کی رگیں پھولی ہوئی ہوں اور وہ اپنی بیوی کے سر پر کھڑا اسے مار رہا ہو۔(کنزل العمال : صفحہ 260 جلد 8 عبد بن حمید) ۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے نبی پاک ﷺ نے فرمایا۔ شوہر پر بیوی کے پانچ حقوق ہیں ایک یہ کہ گھر سے باہر کے کام کاج کر دے اور اسے گھر سے باہر نہ جانے دے کہ وہ، عورت ہے جسے بلا ضرورت گھر سے باہر نکلنا گناہ ہے۔ دوسرا یہ کہ نماز روزہ۔وغیرہ احکام کے متعلق بقدرِ ضرورت اسے سکھائے ، تیسرا یہ کہ اسے ہلال کھانا کھلائے کیونکہ حرام غذا سے پیدا ہونے والا گوشت دوزخ میں پگھلایا جائے گا، چوتھا یہ کہ اس پر کسی بھی طرح کا ظلم نہ ڈھائے کہ وہ

اس کے پاس اللہ کی امانت ہے، پانچواں یہ کہ وہ اگر اس پر زیادتی کر بھی بیٹھے تو محض
(اس کی ہمدردی میں اسے برداشت کر لے۔ (تنبیہ الغافلین 443

حضرت معاویہ بن حیدہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا کہ ہم پر بیویوں کے کیا حقوق ہیں۔آپ ﷺ نے فرمایا جب تم خود کھاؤ تو انھیں بھی کھلاؤ، خود پہنو تو انھیں بھی پہناؤ، ان کے چہرے پر مت مارو، انھیں برا بھلا نہ کہو اور اگر کوئی ناراضگی کی بات ہو جائے تو انھیں گھر سے مت نکالو (سنن ابی داؤد۔ 2144)

رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کے بارے میں یہ وصیت فرمائی کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی۔ پسلی میں بھی سب سے زیادہ ٹیڑھا حصہ اوپر کا ہوتا ہے۔اگر کوئی شخص اس کو بالکل سیدھی کرنے کی کوشش کرے گا تو انجام کار اسے توڑ کے رہے گا اور اگر اسے یونہی چھوڑ دے تو ہمیشہ ٹیڑھی ہی رہ جائے گی۔پس عورتوں کے بارے میں میری نصیحت مانو عورتوں سے اچھا سلوک کرو۔ عورت مقدس ہے اس کے تقدس کو پامال نہ کریں۔،

آپ کی بیوی بھی انسان ہے اسے انسان سمجھا جائے۔اگر اسے سبز رنگ پسند ہے اور آپ کو سبز رنگ پسند نہیں ہے تو اسے یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ اپنی پسند ناپسند کو اپنی زندگی میں نافذ کر سکے۔ایک اچھی اور پرسکون زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے کہ بیوی کو انسان سمجھتے ہوئے اس

کا خیال رکھا جائے۔ کیونکہ حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے

جب کوئی میاں بیوی ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ خوش ہوتے ہیں جبکہ شیطان غصہ کرتا ہے اور جب میاں بیوی ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے ہیں (تو اللہ تعالیٰ ناراضگی کا اظہار کرتا ہے اور شیطان خوش ہوتا ہے۔ (بخاری شریف

حاصلِ بحث یہ ہے کہ مرد پر اللہ نے ایک بہت بڑی ذمہ داری عائد کی ہے اسے اپنی بیوی اور ماں دونوں ہی کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا گیا۔ بیوی سے اچھا سلوک کرنے کا مطلب ہرگز ہرگز یہ نہیں ہے کہ شوہر صرف اور صرف بیوی کا ہو کر رہ جائے بلکہ اسے بیوی اور ماں کے درمیان انصاف سے کام لینا چاہیے۔ نہ تو ماں کی محبت میں بیوی سے بد سلوکی کرے اسے مارے پیٹے یا گھر سے نکالے اور نہ ہی بیوی کی محبت میں ماں باپ کے ساتھ بد تہذیبی کا رویہ اختیار کرے۔

نصابِ تعلیم : نئی نسل کی بنیاد

نصاب سے مراد وہ تمام مواد ہے جو کتابوں ، ورک بک کی صوررت میں کسی بھی سکول میں پڑھایا جاتا ہے۔یعنی وہ تمام علم جو کسی نہ کسی صورت ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل کیا جائے۔ پوری دنیا میں نصابِ تعلیم مخصوص ملک کی روایات ،مذہب ، معاشرت اور طرزِ بودوباش کے مطابق ترتیب دیا جاتا ہے اور اس کا خاص طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ نصاب کا کوئی بھی حصہ مذہب یا روایات کے منافی یا متصادم نہ ہو۔ایک معیاری نصابِ تعلیم نہ صرف کسی قوم کے ورثہ کو نسل در نسل منتقلی کا ذریعہ ہے بلکہ دوسرے لفظوں میں نصاب تعلیم قوم کی بنیاد ہے۔معیاری نصابِ تعلیم قوم کی بقاء کی بنیادی ضرورت ہے کیونکہایک معیاری نصاب کے ذریعے ہی ملکی روایات ،تاریخ اور مذہبی تعلیمات اگلی نسل تک پوری ذمہ داری کے ساتھ منتقل کی جاسکتی ہیں۔اس کے برعکس اگر نصابِ تعلیم معاشرتی روایات ، اور مذہب سے متصادم ہو تو طلبِ علموں کے ذہن ابہام کا شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ جب وہ اپنے علم کے مطابق عملی زندگی میں عمل پیرا ہوتے ہیں اور وہ موجودہ معاشرت سے متصادم ہونے کی وجہ سے انھیں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک میں نصاب جیسی بنیادی اکائی پر کوئی توجہ نہیں دی گئ

۔ اسے اہمیت دینا تو در کنار اس موضوع پر اس حد تک بات بھی نہیں کی گئی جس حد تک اس معاملہ کی اہمیت ہے ۔ہمارے ملک میں نہ تو نصاب وضع کرنے کے لیے کوئی ادارہ ہے اور نہ ہی کوئی ایسا قانون موجود ہے جو نصاب میں ہونے والی بے قاعدگیوں کو روکتے ، یا نصاب میں مذہب سے متصادم مواد کو شامل کرنے پر کوئی سزا متعین کر سکے ۔ یہی وجہ ہے کہ نصاب میں کوئی بھی کسی بھی قسم کا ردوبدل بلا روک ٹوک کر سکتا ہے ۔ چاہے وہ وزیر تعلیم ہو یا پرائیویٹ سکول کا مالک اس کے لیے نصاب میں تبدیلی یا کوئی بھی مواد شامل کرنے کے لیے نہ تو کسی ادارے کی اجازت کی ضرورت پڑھتی ہے اور نہ ہی وہ کسی کے سامنے جوابدہ ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ حال ہی میں ملک کے بعض پرائیویٹ سکولوں کے نصاب میں جنسی مواد شامل کیا گیا اور ملک میں ایک بڑے سکول میں ہم جنس پرستی جیسے قبیح فعل پر کانفرنس منعقد کروائی گئی ۔ اگر ملک میں ایسا کوئی قانون موجود ہوتا جس کے تحت اس طرح کے مذہب سے متصادم مواد یا کانفرنسوں کے انعقاد پر کوئی سزا متعین ہوتی تو سکول مالکان کو اس طرح کیمذہب دشمن حرکتوں سے باز رکھا جا سکتا تھا۔

ہمارے ملک میں بیک وقت کئی طرح کے نصابِ تعلیم رائج ہیں جن میں سے زیادہ تر سکولوں میں چار طرح کے نصاب پڑھائے جا رہے ہیں ۔ اس تمام اقسام کے نصابِ تعلیم میں زیادہ اہم نصاب مندرجہ ذیل ہیں ۔پہلا اور سب سے زیادہ سکولوں میں

رائج نصاب مغربی طرز کا ہے۔اس نصاب میں زیادہ تر حصہ انگریزی کتب پر مبنی ہے جس میں انگریزی ادب نمایاں ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اس طرز کے نصاب میں ایک مضمون اسلامیات، مطالعہ پاکستان اور ایک مضمون اردو کا رکھا گیا ہے۔ان مضامین میں بھی اسلامیات اور مطالعہ ٔ پاکستان انگریزی زبان میں پڑھایا جارہا ہے۔یہنصاب زیادہ تر پرائیویٹ سکولوں میں رائج ہے۔اور اس نصاب میں ہر سکول میں مختلف ناشران کی شائع کردہ کتب پڑھائی جارہی ہیں۔ان کتب کے پڑھائے جانے کا معیار ان کتب میں معیاری علمی مواد ہونے کی بجائے سکول مالکان کی پسند ناپسند کا عمل زیادہ ہے ۔ تقریبا ہر سکول کا نصاب دوسرے سکول کے نصاب سے یکسر مختلف ہے۔

دوسرا نصابِ تعلیم وہ ہے جو کہ سرکاری اور نیم سرکاری سکولوں میں رائج ہے اس کی بھی دو شاخیں ہیں ایک انگریزی جبکہ دوسرا اردو۔اردو میڈیم سکولوں میں تقریبا تمام کتب اردو جبکہ انگریزی میڈیم سکولوں میں بعض کتب اردو جبکہ بعض کتب انگریری میں پڑھائی جارہی ہیں۔تاہم سن 2008ء میں سرکاری سکولوں سے انگریزی اور اردو میڈیم کے نصاب کے فرق کو ختم کیا گیااور صوبائی سکولوں میں یکساں نصاب کی تعلیم دی جانے لگی۔ گونمنٹ (صوبوں کے زیرِ نگرانی کام کرنے والے) سکولوں میں پڑھایا جانے والا نصاب صوبائی ٹیکسٹ بک بورڈ شائع کرتا ہے۔ملک کے ہر صوبے کا اپنا ایک الگ تعلیمی بورڈ ہے جس کا اپنا الگ

نصاب ہے۔ جبکہ وفاق کے زیرِ نگرانی چلائے جانے والے سکولوں میں وفاقی ٹیکسٹ بک بورڈ کی کتب پڑھائی جا رہی ہیں۔ یہ نصاب عرصہ ء دراز سے بنا کسی ردوبدل یا وقت کے ساتھ ساتھکسی اضافہ یا کمی کے پڑھایا جا رہا ہے۔ وفاق کے زیرِ نگرانی کام کرنے والے سکولوں میں یکساں نصابِ تعلیم رائج ہے۔ بالکل اسی طرح فوج کے زیرِ نگرانی کام کرنے والے سکول پورے ملک میں کام کر رہے ہیں اور پورے ملک میں اے پی ایس سکولوں کا نصاب ایک ہے۔

تیسرا بڑا نصاب تعلیم کیمبرج سسٹم ہے۔ اس سسٹم کے تحت اے اولیول کے امتحانات کی تیاری کروائی جاتی ہے۔ اس طرزِ تعلیم میں تمام کتب غیر سرکاری اور غیر ملکی نصاب پر مبنی ہیں۔ اس سسٹم میں اسلامیات، اسلامی تاریخ، مطالعہ ء پاکستان کا مضمون بعض اداروں میں نہ ہونے کے برابراور بعض اداروں میں سرے سے ہے ہی نہیں۔

چوتھا نصابِ تعلیم وہ ہے جو کہ مکمل طور پر صرف اور صرف مذہبی تعلیم پر مبنی ہے۔ اس نصابِ تعلیم میں فقہ، حدیث م نحو و تجوید پڑھائی جاتی ہے۔ اس طرز کے نصاب میں دنیاوی تعلیم کا عمل دخل نہایت غیر مناسب حد تک کم ہے۔ یہ نصابِ تعلیم زیادہ تر مدرسہ جات میں رائج ہے۔ 2008ء میں پہلی بار وفاق المدارس کا قیام عمل میں لایا گیا اور تمام مدرسوں کو اس ادارے کے تحت اپنا

نصاب وضع کرنے کی ہدایات کی گئی۔ اس سے پہلے نہ تو ان مدرسوں میں دنیاوی کوئی مضمون پڑھایا جاتا تھا اور نہ ہی ان مدرسوں کی ڈگریوں کی کوئی حیثیت تھی۔ وفاق المدارس کے قیام کے بعد ملک میں وفاق اور صوبوں کی سطح پر مدرسوں کے نصاب میں بعض مضامین شاملکئے گئے۔ تاہم ابھی بھی بعض ایسے مدرسہ جات ملک میں موجود ہیں جو کہ وفاق المدارس سے الگ اپنا کام کر رہے ہیں۔

مذکورہ بالا تمام نصابِ تعلیم کے تحت تعلیم حاصل کرنے والے بچے چونکہ مختلف ماحول میں پلتے بڑتے ہیں۔ اس ماحول اور تعلیمی نصاب کا یہ تفاوت انھیں الگ الگ نوعیت ذہنیت اور شخصیت عطاء کرتا ہے۔ گویا ہم خود اپنی آنے والی نسلوں کو اپنے ہاتھوں سے کئی کئی فرقوں میں بانٹ رہے ہیں اور ان میں سے ہر فرقے کی سوچ دوسرے فرقے کی سوچ سے مختلف، ہر فرقے کا اندازِ بود و باش مختلف اور بعض اوقات متصادم ہو جاتا ہے۔۔ان تمام فرقوں کے پنپنے کی بنیادی وجہ یہی نصابِ تعلیم ہے اور جب تک پورے ملک میں یکساں نصاب تعلیم رائج نہیں ہوجاتا قومی اتحاد و اتفاق کی کوششیں کامیاب ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ بچوں کا ذہن اس قدر نازک ہوتا ہے کہ اس کو بچپن میں جو پڑھا دیا جاتا ہے وہ پوری زندگی کے لیے اس کی عادات، سوچ کا حصہ بن جاتا ہے۔ مغربی تعلیم حاصل کرنے والا طالبِ علم، مدرسے سے علم حاصل کرنے والے کو جاہل سمجھنے لگتا ہے جبکہ مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے والا طالب علم مغربی تعلیم حاصل کرنے والے کو

کافر گرداننے لگتا ہے ۔اس طرح ایک ہی ملک میں بسنے والے بچوں کے درمیان آپس میں چپقلش اور نفرت جنم لینے لگتی ہے جو کہ بعد ازاں معاشرے میں نفاق کا سبب بنتی ہے ۔

ہمارا معاشرہ جن حالات سے گزر رہا ہے انھیں سدھارنے کے لیے وقت کا تقاضاء ہے کہ ملک میں اتفاق واتحاد کے فروغ اور ایک مضبوط قوم کی تعمیر کی خاطر وفاق پورے ملک کے سکولوں (چاہے وہ گورنمنٹ ہو ، پرائیویٹ یا کوئی مدرسہ) میں رائج نصابِ تعلیم کی ذمہ داری لے ۔ نصاب تعلیم بنانے کے لیے پہلے سے موجود اداروں سے کام لیا جائے اور یہ ذمہ داری HEC کے سپرد کر دی جائے ۔ اسی ادارے کے تحت ملک کے چند بڑے بڑے علماء ، سائنسدانوں اور اساتذہ پر مشتمل ایک الگ کمیٹی بنائی جائے جو پورے ملک کے سکولوں ، مدرسوں کے لیے یکساں نصاب وضع کرے ۔ نصاب بنانے والے افراد کا چناؤ سیاسی وابستگیوں کی بجائے علم ، تجربے ، مذہب اور حب الوطنی کی بنیاد پر کیا جائے ۔تاکہ جو نصاب وضع ہو وہ ملکی روایات ،تاریخ ، مذہب ، معاشرت کا امیں ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرے کے ہر طبقہ کے لیے قابلِ قبول ہو ۔یہ کچھ ایسا مشکل کام نہیں ہے ۔ ہمارے ملک میں قابل افراد کی کمی نہیں ہے، اس ارضِ وطن میں علماء ، بہترین سائنس دان جن میں ڈاکٹر عطاء الرحمٰن ،ڈاکٹر ثمر مند مبارک ، ڈاکٹر عبدالقدیر خان، مولانا تقی عثمانی ، ڈاکٹر طارق جمیل ، علی معین نوازش ، جیسے افراد موجود

ہیں جو معیاری نصابِ تعلیم وضع کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتے ہیں۔

سب سکولوں کے نصاب میں HEC نصابِ تعلیم وضع کرنے کے ساتھ ساتھ یہی ردوبدل، یا کسی بھی مواد کے اضافے کے لیے ذمہ دار ہو کے ساتھ ساتھ اس نصاب کو HEC کے نفاذ کا ذمہ دار بھی ہو۔اس ذمہ داری کو احسن طریقے سے نبھانے کے لیے مضبوط کرنے اور اس ادارے کے اختیارات میں اضافہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

نصاب اور تعلیم کے معاملے میں قانون سازی بھی نہایت ضروری ہے۔تاکہ کوئی ایسا قانون ملک میں موجود ہو جس کے تحت نصابِ تعلیم میں موجود بے قاعدگیوں اور بد عنوانیوں پر سزا کا تعین کیا جا سکے۔تاکہ ایسا کوئی بھی مواد نصاب تعلیم میں شامل کرنے سے روکا جا سکے جو کہ ملکی روایات اور دینِ اسلام کے منافی یا متصادم ہو۔

ہم الفاظ کا بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں

پہلے پہل اظہار رائے کے لئے اشاروں اور پھر تصاویر کا سہارا لیا جاتا تھا۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تصاویر الفاظ میں ڈھلنے لگی ۔ مختلف آوازوں نے الفاظ کا روپ دھارا۔ اس طرح آہستہ آہستہ الفاظ اور جملے رائج ہونے لگے ۔اور مختلف زبانوں کا ظہور ہوا۔ہر علاقے کے رہنے والے لوگوں نے اپنے رنگ ، اپنے انداز میں اور اپنی سوچ کے مطابق الفاظ کو اچھوتا پیراہن دیا۔حضرت انسان جب سے اس دنیا میں آیا ہے تب سے وہ اپنے احساسات ، جذبات کا اظہار کر رہا ہے ۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ جو سوچتا ہے ، اس کا اظہار کرے ، اس کو سنا جائے ، اورجب اس سے بات کی جائے تو وہ سنے ۔اس طرح ہر علاقے کا اپنا ادب تخلیق پایا۔ کسی نے اظہار خیال کے لیے رباعی لکھی تو کسی نے غزل کہی۔ کہیں افسانہ لکھا گیا تو کہیں داستان کہی گئی۔ اس طرح ادب کی مختلف اصناف نے اظہاربیاں کومزید آسانی بخشی ۔انواع و اقسام کے ادب نے انسان کے تخیل کو بے پناہ وسعت دی ۔دوسری جانب گزر جانے والوں کے کارناموں کو تاریخ کی صورت محفوظکر لیا گیا۔ گویا صدیاں گزر جانے کے باوجود اقوام اور ان کے کارنامے زندہ و جاوید ہو گئے ۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ادب میں نئے سے نئے الفاظ کا اضافہ ہوا۔ زبانوں کی شکلیں بہتر سے بہترین ہوتی چلی گئی ۔ اور جس علاقے میں وہاں کے لوگوں نے اپنی زبان کی قدر

نہ کی وہاں دنیا سے ان زبانوں کا نام ونشان بھی مٹ گیا۔

یہی الفاظ جب کسی شاعر کی زبان سے ادا ہوتے ہیں تو نظمیں اور غزلیں وجود پاتی ہیں ۔ جب ادیب کی قلم سے ادا ہوتے ہیں تو افسانے ، ناول اور کتابیں بن جاتے ہیں ۔جب موسیقی کی صورت ادا ہوتے ہیں تو انسان کو جھومنے پر مجبور کرتے ہیں اور روح کی غذا کہلاتے ہیں۔جب عالم دین کی زبان سے ادا ہوتے ہیں تو دین کی بھلائی ، اجتہاد اور لوگوں کو سیدھی راہ پر لانے کا سبب بنتے ہیں ۔ عالم کے الفاظ روشنی کی مانند مشعل راہ ہوتے ہیں ۔اور اس روشنی میں عوام اپنی زندگی گزارنے کے اصول متعین کرتے ہیں ۔اس طرح عالم دین پر ذمہ داری بھی زیادہ عائد ہوتی ہے کیونکہ وہ تمام قوم کو راہ دکھا بھی سکتا ہے اور راہ سے بھٹکا بھی سکتا ہے ۔ عموما عوام علماء کی بات پر تحقیق نہیں کرتے بلکہ صرف تقلید کرتے ہیں ۔ الفاظ کی اہمیت ان ادا کرنے والے سے منسلک ہے ۔ یہ الفاظ ہی ہیں جو اذان کی صورت میں جب مؤذن کی زبان سے ادا ہوتے ہیں تو لوگوں کو نماز اور فلاح کی طرف بلاتے ہیں اور خدا کی پکار کہلاتے ہیں۔جب کوئی عام شخص کچھ کہتا ہے تو اس کے اثرات اسی کے حلقہ احباب تک محدود رہتا ہے جبکہ کسی بھی ملک کے سربراہ کا ادا کردہ ایک جملہ بھی ملک کی تقدیر کے فیصلے کر دیتا ہے۔الفاظ کے مرتب ہونے والے اثرات کا تعلق بولنے والے کے مقام پر ہے ۔۔ گویا جس قدر جس کا مقام و مرتبہ جتنا اہم ہوگا اسی قدر اس کے الفاظ کی اہمیت اور ذمہ داری زیادہ ہوتی ہے ۔۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ

الفاظ اللہ کے قریب لے کر گئے تو انسان کو مومن بنا دیا۔ اور اللہ سے دور لے کر گئے تو فرعون و نمرود بنا دیا۔

اگر ان کا استعمال درست انداز میں کیا جائے تو یہ عزت و توقیر میں اضافہ کا سبب بنتے ہیں ، سخت اور تلخ ہوں تو غرور کا شائبہ دیتے ہیں ۔ گالی کی صورت میں ادا ہوں تو گناہ کہلاتے ہیں اور اگر تیمارداری کی صورت ادا ہوں تو نیکی بن جاتے ہیں ۔ نرم گوئی سے کہے گئے الفاظ آپ کو کسی کے دل میں اعلیٰ مقام دے سکتے ہیں جبکہ ترش گوئی آپ کو اپنے مقام سے کہیں نیچے گرا سکتی ہے۔ یہ الفاظ ہی ہیں ہر رشتے کو ایک ان دیکھی زنجیر میں باندھے رکھتے ہیں، رشتوں کو مضبوطی سے جوڑے رکھتے ہیں اور یہی الفاظ دو انسانوں اور بسا اوقات تہذیبوں کے درمیان دوری کی ایک خلیج بنا دیتے ہیں۔ بظاہر الفاظ کی ادائیگی کا انداز ان کی اہمیت کی ذمہ دار ہوتا ہے ۔ جس انداز میں ادا کیا جائے گا اسی انداز میں محسوس کیا جائے گا۔ گویا یہ لفظ بظاہر اپنی کوئی زبان نہیں رکھتے ۔ انداز بیاں کے محتاج یہ الفاظ جب صفحہ قرطاس پر بکھرتے ہیں تو ان گنت کہانیوں کو جنم دیتے ہیں ، تاریخ کہلاتے ہیں یا ادب کے عظیم شاہکار ۔۔ کہیں پر چند الفاظ صدیوں کے فاصلے مٹا دیتے ہیں اور کہیں کچھ الفاظ فاصلے اتنے بڑھا دیتے ہیں کہ عمر سفر میں گزر جاتی ہے اور فاصلے طے نہیں ہو پاتے۔

اسی لیے کہا جاتا ہے پہلے تولو پھر بولو یعنی اچھی طرح سوچو پھر الفاظ ادا کرو کیونکہ یہ انسان کے اپنے جملے ہوتے ہیں جو لوگوں کے دلوں میں اس کے مقام کا تعین کرتے ہیں ۔ کسی انسان کا بے تکان بولنا یا کم بولنا اس کی شخصیت کا غماز ہے کہ وہ شخص کس حد تک اچھا سامع یا کس قدر اچھا مقرر ہے ۔ کیونکہ یہ الفاظ ہی ہیں جو انسان کی اندرونی کیفیت ، اس کے خیالات کے عکاس ہوتے ہیں ۔ انسان کی شخصیت کا اندازہ اس کے بولنے کے انداز سے کیا جاتا ہے ۔ جو جس قدر نرم اور حساس دل ہو گا وہ اسی قدر نرم خو بھی ہو گا کہا جاتا ہے کہ سوچ سمجھ کر بولنا چاہیے تو وہ اس لیے کہ آپ کے کہے گئے الفاظ سننے والے کے دل میں ثبت ہو جاتے ہیں ۔ سامع پر دور رس اثرات مرتب کرتے ہیں اور یہی الفاظ ان کے دل میں آپ کے مقام کا تعین کریں گے اور آپ کا اس سے تعلق مضبوط ، دیرپا یا کمزور ہو سکے گا ۔ ایک مشہور کہاوت ہے کہ تلوار کا گھاؤ بھر جاتا ہے الفاظ کا نہیں یہ الفاظ اگر تلخی سے بھرپور ہوں تو کسی کو خنجر کی مانند گھائل کر سکتے ہیں ۔ الفاظ کا خنجر جب دل کو گھائل کرتا ہے تو بنا آواز کے بہت گہرا زخم دیتا ہے ، اس زخم سے صدیوں خون رستا رہتا ہے ۔ اور ایسے زخم اپنے انمٹ اثرات چھوڑ جاتے ہیں ہر بار کسی موقعے پر یہ زخم دوبارہ ہرے ہو جاتے ہیں جب انسان ان کو یاد نہیں کرنا چاہتا ۔ اس کے برعکس یہ الفاظ ہی ہیں جو کسی کے دل میں محبت کے دیپ جلا کر اس کی آنکھوں کو سپنوں کے حوالے کر دیتے ہیں ۔

سائنس نے ثابت کیا ہے کہ آواز کی لہریں ہوا، پانی، اور تقریباً تمام اجسام سے با آسانی گزر سکتی ہیں۔ گو آواز کی یہ لہریں روشنی کی نسبت آہستہ سفر کرتی ہیں لیکن یہ لہریں کانوں سے ہوتی ہوئی دل میں اتر جاتی ہیں اور ہمیشہ دلوں پر اپنا عکس چھوڑ جاتی ہیں۔ گویا الفاظ ضائع نہیں ہوتے بلکہ یہ لہروں کی صورت کائنات میں محفوظ کر لیے جاتے ہیں گویا ہمارے الفاظ ہماری گواہی کے طور پر سنبھال لیے جاتے ہیں۔اور یہ الفاظ ہمارے اعمال بن جاتے ہیں۔بلکہ یوں کہیے ہم اپنے ہی الفاظ کا بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں اور ان کے لیئے ہمیں جوابدہ بھی ہونا ہے۔ حدیث نبوی ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ الفاظ کا استعمال اچھے طریقے سے کریں۔

۔کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے

جو بول زبانوں نکل گیا
او تیر کمانوں نکل گیا

(عورت :ہر روپ محبت (بہن

بہن ایک ایسا رشتہ ہے جو کسی بیک وقت دوست ، مونس و غم خوار ہوتی ہے۔یہ وہ رشتہ ہے جو ہر مشکل وقت میں آپ کا کا ساتھ دیتی ہے اور کبھی آپ کو اکیلا نہیں چھوڑتی۔ عورت کا سب سے خوبصورت روپ بہن کا ہے جو اپنے بھائی کی خاطر اپنی جان بھی قربان کر دیتی ہے اس کے لیے اپنا حق تک چھوڑ دیتی ہے لیکن جہاں تک غیرت کی بات آئی ہے وہاں انھیں جان سے مار دینے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ وہاں یہ بھی نہیں دیکھا جاتا کہ آیا اس کی غلطی ہے بھی یا نہیں۔ وہ ہر حال میں گنہگار ٹھہرتی ہے۔

بچپن سے لے کر جوانی تک اور جوانی سے بڑھاپے تک بہن بھائیوں کے لیے اپنا حق قربان کرتی ہیں۔بھائی ان سے بڑا ہو یا چھوٹا اس کے فیصلے چاہے درست ہوں یا غلط وہ مانتی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بہن کو ساری زندگی بھائی کی خاطر اپنی جائز خواہشات بھی پورا کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی اور عموما اسے اپنی خواہشات بھائیوں پر قربان کر دینے پر مجبور کر دیا جاتا ہے اور وہ اس میں کسی قسم کی خلش محسوس نہیں کرتی اس بات کا ایک ادنی کا مظاہرہ میری نظر سے گزرا جہاں ایک گھر میں موجود بہنوں کو تو آلو گوشت کے سالن میں سے آلو دیئے

جاتے ہیں جبکہ بھائیوں کو گوشت کی بہترین بوٹی۔ یہ اس دستر خوان کا منظر ہے جس پر میں مہمان کی حیثیت سے مدعو تھی۔ یہ گھرانہ نہ صرف ایک تعلیم یافتہ گھرانہ ہے بلکہ ایک ایسا گھرانہ ہے جو معاشرے میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ایسے گھرانے میں برابری کا سلوک ہونے کی بجائے بہنوں کو کہا جارہا تھا کہ وہ بھائیوں کے لیے اپنا حق چھوڑ دیں اور یہ وہ بچے ہیں جن کی عمروں کی حد نو سے پانچ کے درمیان ہے۔ اس طرح بہنوں کے ذہن میں عملی طور پر بچپن سے یہ بات ڈال دی جاتی ہے کہ انھیں بھائی کی خاطر اپنا جائز حق بھی چھوڑ دینا چاہیے۔یہ سوچ بعد میں عمر کے ساتھ ساتھ پختہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ ذرا سوچیئے! پڑھے لکھے اور معاشرے میں اہم مقام رکھنے والے گھرانے کی یہ حالت ہے تو پھر ان گھرانوں کے کیا حالات ہوں گے جن میں زیادہ تر افراد ان پڑھ ہیں اور ان گھرانوں کے مالی حالات بھی بہتر نہیں، وہاں بچیوں کی زندگیاں کیسے گزرتی ہوں گی۔ ہمارے پورے معاشرے میں کم و بیش ایسے ہی رویے عام ہیں۔ بچپن سے جوانی تک بہنیں اپنے بھائیوں کے حق میں اپنے حق سے دستبردار ہوتی چلی آتی ہیں۔ شہری آبادی کی نسبت دور دراز، غیر تعلیم یافتہ علاقوں میں حالات زیادہ خراب ہیں جہاں آج اکیسویں صدی میں بھی اندرونِ سندھ اور اندرونِ پنجاب میں یہ رواج آج تک چلا آرہا ہے کہ بہنوں کو اپنے بارے میں فیصلہ کرنے پر جان سے

مار دیا جاتا ہے۔ج اکیسویں صدی کے باسی ہوتے ہوئے بھی بہنوں کو کسی بھیڑ یا بکری سے زیادہ حیثیت نہیں دی جاتی جہاں جائداد کے بٹوارے کو روکنے کے لیے بہنوں کا نکاح قرآن سے کروادیا جاتا ہے اور وڈیروں کی یہ بہنیں ساری زندگی تنہائی، بے کسی اور ایک ہی چاردیواری میں سسکتے گزار دیتی ہیں۔ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔اگر کوئی لڑکی ان روایات کو توڑے یا ان روایات کے خلاف جانے کی کوشش کرے تو اکثر و بیشتر اسےجان سے مار دیا جاتا ہے۔انسانی حقوق اور عورتوں کے حقوق کی تنظیمیں اس قبیح رسم پر خاموش تماشائی بنی نظر آتی ہیں۔ دیہی علاقوں میں ابھی تک عورتوں اور بہنوں کے حقوق کے بارے میں شعور اجاگر نہیں گیا۔

اس کے برعکس اسلام ہر رشتے کو ایک مقدس مقام عطاء کرتا ہے۔ خصوصا عورتوں کے معاملے میں اسلام کے احکامات نہایت واضح ہیں۔اسلام میں بہن کا اس قدر احترام ہے کہ جس کی مثال کسی اور مذہب میں نہیں ملتی۔ بہنوں کے احترام کا عملی نمونہ حضرت نبی پاک ﷺ کی سیرتِ مبارکہ سے ملتا ہے جب حضرت خدیجہؓ کی بہن حضرت ہالہؓ آپ ﷺ کے ہاں تشریف لاتی ہیں تو آقائے دوجہاں ان کے احترام میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان کے لیے اپنی چادر تک بچھا دیتے ہیں۔یہ احترام ہے ایک بہن کا کہ ایک بہن کے احترام میں وجہ وجودِ کائنات چادر بچھا دیں۔ نبی اکرم ﷺ کا یہ عمل کسی بھی مذہب میں بہن کے احترام کا نہ صرف منہ بولتا

ثبوت ہے بلکہ پوری انسانیت کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ صرف یہی نہیں بعض احادیث میں بہن کی اور قرابت داروں کی حیثیت کا بیان کچھ یوں ہوتا ہے

حضرت ابو ہریرہؓ رماتے ہیں کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ اللہ روزِ قیامت فرمائے گا۔ وہ کدھر ہیں جو ایک دوسرے کو میری خاطر محبت کرتے ہیں آج جس دن کوئی سایہ نہیں ان پر میری رحمت کا سائیہ ہو گا۔ (مسلم) ۔ گویا رشتہ داروں سے محبت کرنا بھی ایک نیکی ہے اور اگر اس نیکی کو پھیلایا جائے تو بہت سے مسائل از خود حل ہو جائیں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ کہ حضرت سید مالک بن ربیعہ سعدیؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے تھے کہ قبیلہ بنو سلمہ کا ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ ﷺ ! کیا کوئی ایسی ہے کو میں اپنے ماں باپ کی وفات کے بعد ان ساتھ کروں ؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ان کے لیے دعا کرنا، ان کے واسطے استغفار کرنا، ان کے بعد ان کے وعدوں کو پورا کرنا اور ان کے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرنا کہ یہ صلہ رحمی ان کے رشتہ داروں کی وجہ سے ہے۔ (ابو داؤد)

کہا جاتا ہے کہ جب تم اپنی بہن کے گھر جاؤ تو اپنی بساط کے مطابق کچھ لے

جاؤ کیونکہ تمہاری بہن کا تم پر حق اسے والدین کی وراثت سے ملا ہے اور انتہائی بدنصیب ہے وہ شخص جس کی بہن اس سے ناراض ہو اور اس کی یا اس کی بہن کی موت واقع ہو جائے ۔ اللہ کا شکر ادا کرؤ کہ اس نے تمھیں یہ پاکیزہ رشتہ عطاء کیا اور تمھیں تمھارے دکھوں کا سہارا عطاء کیا ۔ ایک دوسرے کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ اسلام کی تعلیمات یہ ہیں کہ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان سے تین دن سے زیادہ ناراض نہ رہے اور نہ بول چال بند رکھے ۔ بہن کا رشتہ ایسا جس کو جوڑے رکھنے اور مضبوط رکھنے کے لیے
ضروری ہے کہ درگزر کی راہ اپنائی جائے ۔ اور ناراضیگیوں کو بہت زیادہ طول نہ دیا جائے ۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ بہن ، اور قرابت داروں سے اس حد تک بدگمان نہ ہو کہ تم یا وہ موت کی راہ دیکھ لیں اور دوسرے کو ساری زندگی اس ناراضگی پر افسوس یا کسک رہے ۔ صلہ رحمی ہر رشتے کی مضبوطی اور خوبصورتی کی ضامن ہے ۔

اسلام ایک احسن معاشرہ کی تعمیر کا خواہش مند مذہب ہے ۔ اسلام وہ واحد جو ہر رشتے کے حقوق کی وضاحت کرتا ہے اور معاشرے کی اکائی کا ضامن ہے ۔ اگر اسلام کی جزیات پر عمل کیا جائے تو کوئی بھی معاشرہ ایک فلاحی معاشرہ بن سکتا ہے ۔ اسلام میں ہر ایک رشتے کو ایک مخصوص اہمیت حاصل ہے ۔ بہن کے معاملے میں اسلام چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ پیار محبت کا سلوک کیا جائے ۔ اس کی تعلیم و تربیت میں والدین کا ہاتھ بٹایا جائے ۔ اور اگر باپ حیات نہ رہے

تو بھائی کو باپ بن کر اس کی کفالت کرنا چاہیے۔شادی کے بعد بھی اس کی خبر گیری کی جائے اور اگر اسے کوئی مسئلہ درپیش ہو تو اس مسئلے کو احسن طریقے سے حل کیا جائے۔ ایک اچھے دوست کی طرح اس کا دکھ درد بانٹا جائے۔اس کے حقوق کو ہرگز ہرگز صلب نہ کیا جائے اور اگر وہ اپنے حقوق سے خود دست بردار بھی ہو جائے تو ان کو ان کا جائز حق ادا کریں۔اگر ہر شخص دوسرے کا حق ادا کرتا رہے تو معاشرہ فلاحی معاشرہ بن سکتا ہے۔

(عورت ہر روپ محبت (بیٹی

بیٹی ، ایک نہایت معصوم ، قابلِ محبت ، قابلِ احترام رشتہ ہے۔ ایک ایسا رشتہ جو مرتے دم تک ماں باپ کا خیال رکھتی ہے، شادی سے پہلے اور شادی کے بعد بھی بیٹیاں حتیٰ المکان اپنے ماں باپ کو راضی رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ زندگی کے آغاز سے لے کر انجام تک یہ ننھی پریاں ماں باپ ، بہن ، بھائیوں کا خیال رکھتی ہے۔

ہمارے معاشرے کا ایک عجیب المیہ ہے کہ بیٹی کی پیدائش نہ تو کسی کے لیے خوشی کا سبب بنتی ہے اور نہ ہی اس کو خوش بختی کا باعث سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ جنب بیٹا پیدا ہوتا ہے تو ماں باپ خوشیاں مناتے ہیں ، ان کی پیدائش پر مٹھایاں بانٹی جاتی ہیں لیکن جب بیٹی پیدا ہوتی ہے تو لوگوں کے چہرے اداس ہو جاتے ہیں۔

خوشی منانا تو درکنار اکثر و بیشتر لوگ بیٹی کی پیدائش پر ایک دوسرے سے افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ بیٹی پیدا ہونے کی ذمہ داری ماں پر ڈالی جاتی ہے اور ایسی عورتوں کو منحوس خیال کیا جاتا ہے جن کے ہاں بیٹی پیدا ہو۔ عورتوں کو بیٹی کی پیدائش پر لعن طعن کا شکار ہونا پڑھتا ہے۔ بات یہاں تک محدود نہیں بعض جگہ تو عورتوں کو دھمکیاں دی جاتی ہیں کہ بیٹی پیدا ہوئی تو اس صورت میں یا تو ان کا شوہر دوسری شادی

کرلے گا یا پھر انھیں طلاق دے دی جائے گی۔ایسے موقعوں پر سسرال والے عورت کا ساتھ دینے کی بجائے اس پر عرصہ حیات تنگ کر دیتے ہیں۔
معاشرے میں ایک عام خیال یہ ہے کہ بیٹیاں صرف اور صرف ذمہ داری ہیں۔ جنھیں پال پوس کے جوان کریں اور پھر ان کی شادیوں کا خرچ اٹھانا پڑتا ہے، وہ ماں باپ کا سہارا نہیں بن سکتی۔ہمارے ملک میں بعض علاقے ایسے بھی ہیں جہاں بیٹیوں کو ان کے شرعی حقوق سے بھی محروم رکھا جاتا ہے۔ یہ کہہ کر کہ ان کی شادی کا خرچ ان کی موروثی جائیداد کے حصہ کے برابر ہے۔ان کا شرعی حصہ بھی ضبط کر لیا جاتا ہے۔
ہمارے معاشرے کے مرد تو مرد عورتیں خود بھی نہیں چاہتی کہ بیٹی کی ماں بنیں۔اس کا بنیادی سبب معاشرے میں عورتوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیاں اور بیٹیوں کی بنیادی حقوق سے محرومیے۔قرونِ اولیٰ میں بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔زندہ دفن تو آج بھی کیا جاتا ہے صرف انداز مختلف ہے۔ پہلے زمین میں دفنایا جاتا تھا اب رسم و رواج کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔آج بھی ہمارے ملک میں ستی، ونی اور قرآن سے شادی جیسی قبیح رسومات رائج ہیں۔ معصوم بچیوں کو مظالم کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔اکثر و بیشتر میڈیا میں ایسی خبریں سننے کو ملتی ہیں جو روح کو دہلا دینے والی ہوتی ہیں۔ عالمی حقوق کی تنظیمیں ہوں یا ادارے ایسی رپورٹس آئے دن پیش کرتے رہتے ہیں جو کہ انتہائی شرمناک ہیں۔ اسلام نے

بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے، ان کے ساتھ برا سلوک کرنے سے روکا۔ اسلام نے کسی بھی عالمی حقوق کی تنظیم سے بڑھ کر عورتوں کے حقوق وضع کیے ہیں۔ اس کی مثال حدیث کی کتابوں میں کچھ یوں بیان کی گئ جس کا مفہوم ہے

نبی پاک ﷺ کے ایک صحابی نبی پاک ﷺ کے پاس تشریف لائے اور بتایا کہ جب وہ اپنی بیٹی کو دفن کر رہے تھے تو ان کی بیٹی ان کی داڑھی سے کھیلتی جاتی تھی۔ جس پر نبی پاک ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تمھیں اس بچی پر پیار یا رحم نہیں آیا؟ انھوں نے کہا کہ بھوک کے ڈر سے اسے دفن کر دیا۔ نبی پاک ﷺ نے یہ سنا تو آب دیدہ ہو گئے۔ اور ان سے منہ پھیر لیا

آج کا دور تبدیل ہو چکا ہے۔ اب بیٹیاں بھی ماں باپ کا اتنا ہی سہارا بن سکتی ہیں جتنا کہ بیٹے۔ بلکہ یوں کہنا بے جا نہ ہو کہ بعض معاملات میں بیٹیاں، بیٹوں کی نسبت ماں باپ کا زیادہ خیال رکھتی ہیں۔ آج کل تو بیٹیاں ہر میدان میں بیٹوں سے آگے نظر آتی ہیں۔ چاہے وہ سیاست ہو، تعلیم ہو یا کوئی بھی شعبہ بیٹیاں، بیٹوں کے شانہ بشانہ کھڑی نظر آتی ہیں۔ تحریک پاکستان کو ہی لیلیجئے جب قوم کی بیٹیوں نے مردوں کے شانہ بشانہ کام کیا۔ تحریک پاکستان میں بیٹیوں کے کردار کے بغیر یہ تحریک کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ تحریک پاکستان میں نمایاں کردار ادا کرنے والی خواتین میں محترمہ فاطمہ جناح کا کردار قابلِ ذکر ہے جنھوں نے قائدِ اعظم کے شانہ

بشانہ کام کیا اور اس تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں قائدِاعظم کی مدد کی۔ آج بھی پاکستان کی بیٹیاں کسی سے کم نہیں۔ تعلیم کے میدان میں ارفع کریم، ملالہ یوسف زئی جیسی بیٹیوں نے ملک کا نام عالمی سطح پر روشن کیا ہے جبکہ سیاست میں بھی محترمہ بینظیر بھٹو، نے عالمی سطح پر نام کمایا۔ یہی نہیں بلکہ ہر شعبہ میں بیٹیاں کسی سے کم نہیں اور عالمی سطح پر ملک کا نام روشن کر رہی ہیں۔ ہر ایک شعبے میں بیٹیاں، بیٹوں کے، شانہ بشانہ کام کر رہی ہیں۔

اسلام میں بیٹیوں کو رحمت جبکہ بیٹوں کو نعمت قرار دیا گیا ہے۔قرآنِ پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے

آسمان اور زمین کی بادشاہت اللہ ہی کے لیے ہے۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جسے چاہتا ہے بیٹیاں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے یا جسے چاہتا ہے بیٹیاں اور بیٹے ملے جلے (عطا فرماتا ہے) اور جسے چاہتا ہے بانجھ بنا دیتا ہے۔یقیناً وہ جاننے والا ہے، ہر چیز پر مکمل قدرت رکھنے والا ہے (سورۃ شوریٰ 42، آیت 49-50)۔الغرض بیٹی اور بیٹا دونوں ہی اللہ کی دین ہیں اور دونوں ہی کے حقوق ،ادا کرنا ماں باپ پر لازم ہے۔

حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے ان بیٹیوں کے

کسی معاملہ کی ذمہ داری لی اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو یہ بیٹیاں اس کے لیے یہ (دوزخ کی آگ سے بچاؤ کا سامان بن جائیں گی ۔ (بخاری

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا۔ جس کی تین بیٹیاں ہوں وہ ان پر صبر کرے جو کچھ میسر ہو اس میں سے انھیں کھلائے ، پلائے اور پہنائے قیامت کے دن وہ اس کے لیے جہنم سے رکاوٹ بن جائیں گی ۔ (سنن ابن ماجہ 3669

(ابواب الادب

بیٹیاں بلا شبہ اللہ کی بیت.بڑی رحمت ہیں اور جنت حاصل کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہیں۔ نبی پاک ﷺ کی ایک حدیث کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ جب بیٹا پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنے ساتھ ایک نور جبکہ بیٹی اپنے ساتھ دو نور لے کر پیدا ہوتی ہے ۔جس نے اپنی بیٹیوں سے محبت کی ، انھیں پالنے اور ان کی شادیاں کروانے میں مشکلات کا سامنا کیا اس نے خود پر جنت ہلال کر لی ۔

شکسپئر نے کہا تھا کہ بیٹیوں کا باپ ایک خاندان کا سربراہ ہوتا ہے جبکہ بیٹوں کا باپ اپنے لیے غیروں کا ایک ہجوم اکٹھا کرتا ہے ۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ بیٹیوں اور بیٹوں دونوں کو.برابری کی سطح پر رکھا

جائے۔ دونوں ہی کی تربیت میں خصوصی توجہ دی جائے بلکہ بیٹی کی تربیت میں زیادہ احتیاط اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس نے اپنی اگلی نسل کو سنوارنا ہے اور جو تربیت اس کی کی جائے گی اس نے ویسی ہی تربیت بچوں کی کرنی ہے۔

عالم اسلام : حالتِ جنگ میں

آج کل پوری دنیا میں جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں وہاں وہاں وہ مصائب و آلام کا شکار ہیں۔ مسلمان ممالک جو امن و آشتی کا گہوارہ تھے آج ان میں کوئی ذی روح دہشت گردی اور انتہا پسندی سے محفوظ نہیں ان ممالک میں امن و امان کی حالت ابتر ہو چکی ہے۔پہلے طالبان نے افغانستان کو اپنا نشانہ بنایا، پھر پاکستان میں خود کش دھماکے کروائے گئے۔اور اب داعش کا وجود مشرقِ وسطیٰ کے ان ممالک میں جو معاشی لحاظ سے کچھ بہتر ہیں، میں دہشت کی علامت بن چکا ہے۔ داعش نے اپنی کاروائیوں سے مشرقِ وسطیٰ میں بہت حد تک اپنا کنٹرول مستحکم کر لیا ہے۔ پاکستان ہے تو اس میں طویل عرصے سے دہشت گردی اور انتہا پسندی کا دور جاری ہے۔پورے ملک میں دہشت گردوں نے بم دھماکوں، خود کش حملوں اور دہشت گردی کی کاروائیوں نے امن و امان تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ چاہے وہ پشاور، وانا ہو، سوات ہو ، راولپنڈی ہو، یا روشینیوں کا شہر کراچی یہاں تک کہ دار لحکومت کا جڑواں شہر راولپنڈی تک ان حملوں سے محفوظ نہیں۔الغرض پورا ملک ہی دہشت گردی کی اس وبا کا شکار ہو چکا ہے۔ خود کش حملوں کی ذمہ داری اکثر و بیشتر تحریک طالبان پاکستان، یا تحریک طالبان نے قبول کی۔ بھتہ خوری، دہشت گردی، ٹارگٹ کلنگ عام ہے۔ یہاں کے عوام کے دن رات اس فکر میں

گزرتے ہیں کہ جانے کب یہ دن ان کی زندگی کا آخری دن ہو ؟۔ رینجرز نے کراچی میں آپریشن کرکے یہاں امن وامان کو بحال کرنے کی کوشش کی۔ ملک سے دہشت گردی کو ختم کرنے کے لیے فوج نے کئی آپریشن شروع کیے۔ جن میں آپریشن راہِ راست اور آپریشن ضربِ عصب قابلِ ذکر ہیں۔ اس آپریشن کے ذریعے پہلے سوات بونیر کو دہشت گردوں سے پاک کیا اور اب فوج وانا اور شمالی وزیرستان میں ان قوتوں سے نبرد آزماء ہے۔ اس جنگ میں ہم نے چالیس ہزار کے قریب فوجیوں، اور نہ جانے کتنے ہی بے گناہ افراد جن میں بچے بوڑھے، جوان، عورتیں سبھی شامل ہیں کو کھو دیا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ شیعہ علماء کو شہید کر دیا گیا اور اس کے بعد سنی علماء کو۔ جس کا مقصد اسلام کے ان دو گرہوں کے درمیان پھوٹ ڈلوانے کی کوشش تھی۔ صد شکر کہ ان کاروائیوں کے باوجود ان دونوں گرہوں کے درمیان تصادم نہ ہوا۔ دونوں فرقوں کی جانب سے عقلمندی کا مظاہرہ کیا گیا۔ ملک فرقہ پرستی کی جنگ سے محفوظ رہا اور کئی قیمتی جانیں بچ گئیں۔ دہشت گردی کی اس جنگ میں ان گنت گھرانوں کے چراغ گل ہوئے، ان گنت ماؤں کے لختِ جگر خون میں نہلائے گئے، ان گنت بہنوں نے بیوگی کی چاریں اوڑھی۔ ان حالات نے جہاں پاکستان کے مکینوں کی زندگیوں میں آنسو بھر دیئے وہاں اس دہشت گردی کی وجہ سے ملکی معیشت پر اتنے برے اثرات مرتب ہوئے ہیں کہ ملکی معیشت دیوالیہ کے قریب پہنچ گئی۔

اگر مشرق وسطیٰ پر نظر دوڑائیں تو یمن میں سعودی عرب کی جانب سے حوثی باغیوں کے خلاف کاروائی کا آغاز کیا گیا۔ سعودی عرب کے مطابق حوثی باغیوں (داعش) نے اپنی مسلحہ کاروائیوں سے کئی علاقوں میں اپنی پوزیشن نہایت مضبوط کر لی تھی ۔ سعودی عرب کی مسلحہ کاروائیوں کی وجہ سے ایک جنگ شروع ہو گئی اس جنگ میں ایران، یمن اور سعودی عرب شامل ہو گئے ۔ اس جنگ کے اثرات یہ ہوئے کہ یمن میں موجود نہ جانے کتنے ہی بے گناہ مسلمان گھرانے تباہ ہو گئے ۔ ملکی معیشت کو بے حد نقصان پہنچا۔ اس جنگ کے نتیجے میں داعش نے سعودی عرب میں دہشت گردی کی کاروائیوں کا آغاز کر دیا ہے۔ سعودی عرب تمام مسلمانوں کے لیے قابلِ احترام سرزمین ہے۔ سعودی عرب ایسا ملک ہے جس میں اس قسم کی کوئی کاروائی پہلے نہیں کی گئی ۔ دہشت گردی کی یہ کاروائی اس وقت کی گئی جب سعودی عرب نے ہمسایہ ملک یمن میں حوثی باغیوں کے خلاف فوجی کاروائی شروع کی جب عراق اور شام میں داعش نے مزید علاقوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ داعش (دولتِ اسلامیہ، عرب میں کام کرنے والی مسلحہ جماعت) نے ماضی میں سعودی عرب میں مقیم شیعہ گروہ کو نشانہ بنانے کی دھمکیاں دے چکی تھی۔ان کاروائیوں کا پہلا حدف سعودی عرب کے مشرقی صوبہ ق طیف کی ایک شیعہ مسجد تھی ۔جس میں نمازِ جمعہ کے دوران ایک شیعہ مسجد میں بم دھماکہ کیا گیا جس میں قریبا ۲۰ کے قریب لوگ شہید ہو گئے اور ان گنت زخمی ہو گئے جنھیں قریبی ہسپتالوں میں منتقل کر دیا گیا۔ واضع رہے کہ جس علاقے ق طیف میں یہ کاروائی کی گئی ہے وہ

تیل کی دولت سے مالا مال ہے۔ ایسا ہی ایک اور خود کش حملہ ریاض میں کیا گیا۔ داعش نے ان حملوں کی ذمہ داری قبول کی۔ شیعہ مسجد پر جمعہ کی نماز کے دوران خود کش حملے کا مقصد سعودی عرب کے عوام میں پھوٹ ڈالنے اور شعیہ سنی فسادات برپا کروانے کی ایک مظموم سازش ہے۔

آیئے ذرا غور کیجیے ! یہ تحریکِ طالبان، تحریک طالبان پاکستان اور داعش ہیں کیا؟ یہ وہ مسلحہ گروپ ہیں جو کہ مسلمان ریاستوں، جس میں افغانستان، پاکستان، عراق، ایران، شام، اور اب سعودی عرب میں اپنی کاروائیاں کر رہے ہیں۔ زیادہ تر خود کش حملوں میں یہی گروہ ملوث ہوتے ہیں اور بعد میں حملے کی ذمہ داری بھی قبول کر لیتے ہیں۔ اسلام دشمن قوتیں ان گرہوں کی مالی امداد، اسلحہ کی سپلائی کر رہی ہیں۔ اگرچہ یہ گروہ خود کو مسلمان کہتے اور مسلمانوں کا سا حلیہ اپناتے ہیں ور مسلمان تنظیموں ہی کے طور پر اپنے آپ کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں تاہم ان کا ٹارگٹ بھی مسلمان ہی ہیں بجائے اس کے کہ یہ اسلام کی ترویج کے لیے کام کریں یہ مسلمانوں ہی کے جان کے، دشمن بنے ہوئے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ مرنے والے بھی مسلمان اور مارنے والے بھی خدا کے نام لیوا۔ دونوں جانب خون تو مسلمان کا ہے۔ نقصان اسلام کا ہے۔ اپنے مقاصد میں ان گروہوں کے لیڈروں کا کہنا ہے کہ وہ یہ تمام کاروائیاں ان ممالک میں نظامِ اسلامی نافذ کرنے کے لیے کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اپنے

ہی بھائیوں کو، نماز ادا کرتے ہوئے، سکولوں کو تباہ کرکے، بازاروں میں کاروبار کو تباہ کرکے اسلامی نظام کس طرح سے لایا جاسکتا ہے ؟ درحقیقت یہ وہ گروہ ہیں جن کا مقصد اسلام کو فائدہ پہنچانا نہیں بلکہ ان گرہوں کی وجہ سے اسلام کی نہ صرف ساکھ کو نقصان پہنچا ہے بلکہ ان گنت بے گناہ مسلمان اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں ۔اس قسم کی کاروائیوں سے فائدہ اسلام دشمن عناصر اٹھاتے ہیں ۔ایک مسلمان ملک کا معاشی نقصان کرکے اس ملک کی معیشت کو تباہ کرکے اسلامی نظام کا نفاذ ممکن ہی نہیں ۔

حال ہی میں ایک انٹرویو میں بھارت کے وزیر دفاع نے کہا کہ اب تحریک طالبان پاکستان سے وہ کام نہیں لیں گے بلکہ مشرقِ وسطیٰ میں موجود دہشت گردوں سے کام لیں گے ۔اس کے اس بیان سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ بھارت کی ایجنسیاں، اور خود بھارتی حکومت تحریک طالبان پاکستان کو مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف استعمال کرتے رہے ہیں اور اب جبکہ افواجِ پاکستان نے اپنی ان تھک کوششوں سے پاکستان تحریک طالبان پاکستان کا زور توڑ دیا ہے اس لیے اب وہ بھارت کے لیے اہم نہیں رہے ۔اب اسلام دشمن عناصر کی توجہ کا مرکز داعش ہے ۔اسلام دشمن قوتیں پوری دنیا میں موجود مسلمان ملکوں کو کمزور کرنے کے لیے ان تحریکوں کا سہارا لے رہی ہیں ۔ جہاں بھی مسلمانوں میں کوئی کمزوری نظر آتی ہے وہاں یہ اس کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دہشت گرد گرہوں کو استعمال کرتے

ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے اندر کی کمزوریوں کو دور کریں۔ تاکہ کوئی اسلام دشمن قوت مسلمانوں کے بیچ رخنہ نہ ڈال سکے۔ اپنے تمام اختلافات کو بھلا کر ہمیں ایک پلیٹ فارم پر آنا چاہیے۔ صرف اتحاد ہی وہ واحد قوت ہے جو اسلام کو دشمنوں سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔

پردہ: عورت کی ضرورت

ایک حکایت ہے کہ ایک بزرگ کے پاس ایک لڑکی آئی اور کہنے لگی کہ ان نوجوانوں کو سمجھایئے کہ جب لڑکیاں گزرتی ہیں تو یہ نظریں نیچی رکھا کریں۔ شیخ نے فرمایا: بتایئے! اگر آپ ہاتھ میں بغیر ڈھانپے گوشت لے جائیں اور کتے بھونکیں تو آپ کیا کریں گی؟ اس نے کہا: میں کتوں کو بھگا دوں گی۔ شیخ نے کہا: پھر بھی نہ بھاگیں تو؟ اس نے کہا: میں آخری کوشش لگا دوں گی۔ شیخ نے کہا: اس طرح تو تم بڑی مشکل میں پڑھ جاؤ گی اس کا آسان حل یہ ہے کہ اس گوشت کو ڈھانپ کر باہر نکلو۔ پھر یہ کتے نہیں بھونکیں گے۔

بالکل اسی طرح جب ایک عورت بے پردہ، نیم برہنہ ہو کر گھر سے باہر نکلے گی تو نا محرم مردوں کی نگاہوں سے نہیں بچ سکتی۔ نا محرم مردوں کی نظروں اور ان کی ہوس سے بچنے کے لیے عورت کو خود کو ڈھانپنا ہوگا۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: حیا سے ہمیشہ بھلائی پیدا ہوتی ہے (صحیح بخاری حدیث: 2117) ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا ایمان کی کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں اور حیاء بھی ایمان ہی کی ایک

(شاخ ہے۔(صحیح مسلم : جلد اول : حدیث نمبر 155

حضرت علیؓ کا ارشاد ہے۔ بے پردہ عورت اللہ کے نزدیک کوئی عزت نہیں رکھتی۔

حضرت فاطمہؓ خاتونِ جنت فرماتی ہیں۔ عورت کی بے پردگی مرد کی بے حیائی کا ثبوت ہے۔ اس ضمن میں حضرت امام حسنؓ فرماتے ہیں۔ مرد کی عزت کا اندازہ اس کی عورت کے لباس اور پردے سے لگایا جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا جہنم میں جانے والی دو قسمیں ایسی ہیں جو ابھی تک میں نے نہیں دیکھی۔ ان میں سے ایک وہ لوگ جن کے پاس بیل کی دموں کی طرح کوڑے ہوں گے جن میں سے وہ لوگوں کو (یعنی رعایا) ماریں گے۔ دوسری قسم ان عورتوں کی جو کپڑے پہننے کے باوجود ننگی ہوتی ہیں، مردوں کو بہکانے والیاں، خود بھکنے والیاں ان کے سر بختی اور اونٹوں کی کوہان کی طرح اونچے اونچے جوڑے لگانے کی وجہ سے) ایک طرف جھکے ہوں گے۔ ایسی عورتیں) جنت میں نہ جائیں گی۔ نہ جنت کی خوشبو سونگھ سکیں گی، حالانکہ جنت کی خوشبو طویل (مسافت سے آتی ہے۔ (مسلم

اب آیئے! ذرا اپنے معاشرے کی جانب ایک اسلامی ملک جو اسلام کی ترویج کے لیے حاصل کیا گیا۔ یہ ارضِ وطن وہ تھی جہاں دین اسلام کے مطابق مسلمانوں کو زندگی گزارنا تھی۔ جہاں اسلامی رسوم و رواج عام ہونا تھی۔ وہاں آج اسلامی

اور معاشرتی اقدار رو بہ زوال ہیں ۔اسلام کا نام و نشان تک اس معاشرے سے عنقا ہوتا جا رہا ہے۔ مغربیت ہمارے معاشرے میں ایسے رچ بس گئی ہے جیسے جسم میں خون۔ مغربیت اور ماڈرن ازم کا پہلا شکار ہماری خواتین ہیں ۔ کیونکہ خاتون نے ایک نسل کو پروان چڑھانا ہوتا ہے اس لیے ایک مذموم سازش کے تحت معاشرے کی خواتین کو حدف بنایا گیا اور انھیں ماڈرن ازم کے نام پر دین سے دوری کا سبق دیا گیا۔ اس تمام کاروائی میں میڈیا نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے خصوصا پرائیویٹ چینلز نے۔ گورنمنٹ اور پرائیویٹ دونوں چینلز میڈیا کی آزادی کے نام پر اپنی ریٹنگ بڑھانے کے لیے اسلام دشمن مواد کی تشہیر کر رہے ہیں ۔اکثر و بیشتر ڈراموں میں پڑھی لکھی لڑکیاں بنا آستین کے اور بنا دوپٹہ کے دیکھائی جاتی ہیں ۔مارننگ شوز میں اینکرز یہاں تک کہ بعض چینلز میں خبریں تک پڑھنے والی خواتین مغربی لباس میں ملبوس نظر آتی ہیں ۔اس کے علاوہ فیشن شوز میں ریمپ پر واک کرتی ہوئی ماڈل خواتین چاہے وہ لباس کی نمائش کر رہی ہوں یا زیورات کی نیم برہنہ ہی نظر آئیں گی۔ بالخصوص زیورات نمائش میں برہنگی ایک نمایاں حیثیت اختیار کر چکی ہے۔اس طرح کے لباس کی ترویج کی جا رہی ہے جو کہ مغربی معاشرے میں بھی قابلِ استعمال نہ ہوں ۔ اس طرح کے شوز نوجوانوں میں ایک ذہنی ہیجان پیدا کرتے ہیں اور معاشرے میں بد عملی کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔

میڈیا درحقیقت ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے ذریعے نہ صرف کوئی بھی سوچ معاشرے میں وسیع پیمانے پر پھیلائی جا سکتی ہے بلکہ یہ تقریباہر ایک کی دسترس میں بھی ہے۔ اس کے ذریعے بڑی آسانی کے ساتھ وسیع پیمانے پر لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ملک میں بجائے اس کے کہ میڈیا کا استعمال مثبت طریقے سے کیا جائے اس کا منفی استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہمارا میڈیا آزادی کے نام پر اپنی ہی ملکی اور مذہبی اقدار پر زرک لگانے کی کوشش کر رہا ہے اور یہ کسی حد تک کامیاب بھی ہو چکا ہے۔

خواتین ماڈرن ازم کی زد میں آکر اپنے جسم کو برہنگی کی حد تک بے لباسی کو ترجیح دینے لگی ہیں۔ دوپٹہ دقیانوسیت کی نشانی بن کر رہ چکا ہے۔ بے لباسی اور کم لباسی کو تہذیب کا معیار قرار دیا جاتا ہے۔ معاشرے میں ایک عام خیال رائج پاتا جا رہا ہے کہ جو خواتین اپنے جسم کو ڈھانپتی ہیں وہ روایات کی غلام، دقیانوسی سوچ کی حامل ہیں۔ میری ایک فیشن ایبل خاتون سے اس معاملے پر بات ہوئی ان کا کہنا یہ تھا کہ شرم آنکھوں اور دل میں ہونی چاہیے لباس کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ میرے لیے یہ ایک حیران کن بات تھی کہ آپ کا لباس جیسا بھی ہے لوگ آپ کو جس بھی طرح کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں شرم آپ کے دل میں ہونا چاہیے۔ یہ خاتون ہمارے معاشرے میں موجود اس طبقہ کی نمائندہ ہے جو بین الاقوامی سطح پر ہمارے معاشرے کی نمائندگی کرتی ہیں۔

المیہ یہ ہے کہ تعلیم کو بے پردگی کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے یعنی کوئی لڑکی اگر تعلیم یافتہ ہے تولازماًاسے فیشن کی دلدادہ ہونا چاہیے۔ تعلیم کا معیار فیشن ہی کو قرار دیا جاتا ہے۔ کوئی ایسی خاتون جو تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ مذہب اور پردے کا لحاظ رکھتی ہو ایسی لڑکی کے تعلیم یافتہ ہونے میں لوگ یقین ہی نہیں کرتے۔ اگر کسی خاتون کو کسی ادارے میں اچھی پوسٹ چاہیے تو اسے خود کو فیشن ایبل بنانا ہوگا۔آپ کو کوئی باپردہ خاتون کسی اہم عہدے پر بہت کم فائز نظر آئے گی۔اہم عہدہ حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے اسے لباس میں تبدیلی لانا پڑے گی۔

ابتدائے انسانیت میں انسان کے پاس لباس کا کوئی نہیں تھا۔ اس وقت انسان غیر تہذیب یافتہ تھا۔لباس کے بارے میں بے فکر تھا۔آج انسان تہذیب یافتہ ہو کر اگر بے لباسی اور برہنگی کو تہذیب کا معیار قرار دینے لگے تو آج کے انسان اور قدیم انسان کی سوچ میں کیا فرق رہ جائے گا؟ توجہ طلب امر یہ ہے کہ کیا انسانی سوچ کا ارتقاء اسے واپس بد تہذیبی کی جانب دھکیل رہا ہے؟ ہماری نئی اور مغربی تہذیب کی دلدادہ نسل کو سوچ اور معاشرے میں بہتری لانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ماہِ رمضان

ماہِ رمضان کی آمد آمد ہے۔ یہ مہینہ مسلمانوں کے لیے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ مبارک مہینہ اپنے ساتھ بے شمار فیوض و برکات لے کر آتا ہے۔ رمضان کے آغاز کے ساتھ ہی گلیوں بازاروں میں رونق بڑھ جاتی ہے۔ مسجدوں میں عبادات کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس ماہِ مبارک مہینے کو رحمتوں کا مہینہ بھی کہا جاتا ہے۔ دراصل یہ ایک ایسا مہینہ ہے جو کہ تقویٰ اور پرہیزگاری کی جانب بڑھنے کے لیے ایک پریکٹس کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ماہِ مبارک میں روزہ رکھنے والا شخص ان غریبوں کی بھوک اور پیاس کا اندازہ کر پاتا ہے جنھیں کھانے کو کچھ میسر نہیں۔ جسمانی برکات کے ساتھ ساتھ اس ماہِ مبارک کو جہنم سے نجات کا مہینہ بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن اور حدیث میں رمضان کے ان گنت فضائل بیان ہوئے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے
اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ(البقرہ : ۱۸۳)
ایک اور جگہ کچھ یوں ارشاد ہوتا ہے
رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا ہے جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور جس میں رہنمائی کرنے کرنے والی اور (حق اور باطل میں)امتیاز کرنے والی

واضح نشانیاں ہیں۔ پس تم میں سے جو کوئی اس مہینے کو پالے تو وہ اس کے روزے رکھے (البقرہ : ۱۸۵)

حدیث مبارکہ میں کچھ اس طرح بیان ہوا۔

جو شخص روزہ رکھ کر جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ کھانا پینا چھوڑ دے۔ (بخاری)

جب کوئی روزہ رکھے تو کوئی بے ہودہ بات نہ کرے نہ ہی لغویات کرے۔ اگر کوئی اس سے جھگڑا کرے تو وہ کہہ دے میں روزے سے ہوں۔ (بخاری) گویا روزہ دار کے لیے جائز نہیں کہ وہ روزہ رکھ کر بھی ان کاموں کو نہ چھوڑے جن کو اپنانے کی مذہب اجازت نہیں دیتا۔ روزہ دار اگر گالی گلوچ، ذخیرہ اندوزی، اور دیگر برائیاں نہ چھوڑے تو روزہ رکھنے کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ روزہ از خود بھوکا پیاسا رہنے کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ایسی احسن تربیت ہے جس کو اگر مکمل روح کے ساتھ اپنایا جائے تو کئی قسم کی برائیوں کا خاتمہ ممکن ہے۔ روزہ نہ صرف معاشرتی برائیوں کے خلاف ایک جنگ ہے بلکہ یہ کئی طرح کی بیماریوں روحانی اور جسمانی سے بچاؤ کا ایک ذریعہ ہے۔ رمضان کا احترام یہ ہے کہ روزہ رکھ کر دین پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی جائے، اور جو عادات رمضان میں اپنائی جائیں انھیں اگلا پورا سال اپنی زندگیوں پر لاگو کیا جائے۔ ہمارے ہاں رمضان میں تو مساجد میں رونق دیدنی ہوتی ہے لیکن رمضان کے گزر

جانے کے بعد مساجد میں نمازیوں کی تعداد میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔

ہمارے ہاں روزہ تو بڑے اہتمام سے رکھا جاتا ہے تاہم اکثر و بیشتر دیکھنے میں آیا ہے کہ روزہ رکھنے کے باوجود ہمارے یہاں نہ تو ذخیرہ اندوزی چھوڑی جاتی ہے، اور لوگ بازاروں، دفاتر اور گھروں میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ غریبوں اور ناداروں کا احساس نہیں کیا جاتا اور نہ ہی اپنے نفس کا تذکیہ کیا جاتا ہے۔

ہر سال ماہِ رمضان برکتیں اور رحمتیں اپنے ساتھ لاتا ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے معاشرے میں موجود برائیوں میں کوئی خاطر خواہ کمی نہیں ہوتی اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہمارے ہاں روزہ تو رکھا جاتا ہے لیکن اس کی روح کو سمجھنے یا روزے کی فرضیت کے مقاصد کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی ۔بنیادی طور پر ہمارے ہاں روزے کو ایک فرض کے طور پر رکھا جاتا ہے۔ حالانکہ روزہ کی حیثیت ایک ایسی جسمانی عبادت کی سی ہے جو کہ انفرادی حیثیت سے لے کر اجتماعی طور پر پورے معاشرے کی اصلاح کا سبب بن سکتا ہے۔

مغربی ممالک میں دیکھا گیا ہے کہ جب ان کے ہاں کرسمس یا کوئی اور مذہبی تہوار آتا ہے تو یہ ممالک میں مذہبی تہواروں کے موقع پر حکومت اور تاجر حضرات کی جانب سے خصوصی اقدامات کیے جاتے ہیں۔ امریکہ، جرمنی، برطانیہ

اور خاص طور پر یورپی ممالک میں یہ رواج عام ہے کہ ان ممالک میں کرسمس کے دنوں میں کھانے پینے کی اشیاء کے نرخ کم کر دیئے جاتے ہیں۔ ہیں تاکہ وہ لوگ جن کی قوتِ خرید کم ہے یا وہ جو غریب ہیں انھیں ان اشیاء کی خریداری میں آسانی ہو۔

لیکن ہمارے وطنِ عزیز میں ان ممالک کے برعکس ہوتا ہے۔ ہم فیشن پرستی اور زبان کے معاملے میں تو ان ممالک کی پیروی کرنے کو قابلِ فخر سمجھتے ہیں لیکن غریبوں اور ناداروں کے احساس کی جہاں بات آتی ہے وہاں ہم مذہب اسلام پر تو کیا، ان مغربی ممالک کے نقشِ قدم پر چلنا پسند نہیں کرتے۔ ہمارے ملک میں ماہِ رمضان جہاں اپنے ساتھ بے شمار رحمتیں اور برکتیں لے کر آتا ہے وہاں مہنگائی کا ایک طوفان بھی اپنے ساتھ لاتا ہے۔ رمضان کا آغاز ہونے سے پہلے ہی بجٹ کی آمد نے لوگوں کی قوتِ خرید پر نہایت برے اثرات مرتب کیے ہیں۔ رمضان ایک ایسا مہینہ ہے جس میں تقریباً ہر شخص کی کوشش ہوتی ہے کہ افطار پر کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا اہتمام کیا جائے ایسے میں فروٹ، دہی، چنا، ٹماٹر وغیرہ کی مانگ میں اضافہ ہو جاتا ہے، اس مانگ میں اضافے کو دیکھتے ہوئے دکان دار ان اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ خصوصاً جب عید کے دن قریب ہوتے ہیں تو کپڑوں اور جوتوں کے نرخوں میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

کھانے پینے کی اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ کو روکنے کے لیے حکومت نے کوئی

اقدامات نہیں کیے اور نہ ہی ان اشیاء کی قیمتوں کے تعین کے لیے کوئی اقدام کیا گیا۔تاجر حضرات اپنی مرضی سے قیمتوں میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے غریب طبقہ اس مبارک ماہ میں بھی کھانے پینے کی چیزوں تک سے محروم رہتا ہے۔ اگرچہ حکومت ماہ رمضان میں ہر سال کھانے پینے کی اشیاء پر ایک مخصوص سبسڈی دیتی ہے۔ یوٹیلٹی سٹورز میں موجود دالوں، وغیرہ کی قیمتوں میں کمی کی جاتی ہے تاہم عام دکاندار ان سٹورز سے بھاری تعداد میں اشیاء صرف کم داموں خرید لیتے ہیں اور انھیں ذخیرہ کر کے بعد میں مارکیٹ میں مہنگے داموں فروخت کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے یوٹیلٹی سٹورز پر موجود ان اشیاء کی قلت ہو جاتی ہے۔ عام صارف اس سبسڈی سے بھی کوئی فائدہ حاصل کرنے سے قاصر رہتا ہے۔اسے بااہر حال یہ اشیاء عام دکانوں سے مہنگے داموں خریدنا پڑھتی ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ اس طرح کے اقدامات کو روکنے کے لیے خصوصی اقدامات کرے۔ اس سلسلے میں علاقے کے ڈی سی او کو خصوصی ہدایات دی جائیں۔تاکہ حکومت کی جانب سے دی گئی سبسڈی کا فائدہ اس سفید پوش شخص کو بھی پہنچے جس کا یہ حق ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ اس ماہِ مبارک میں تاجر حضرات اور مخیّر حضرات کو چاہیے کہ ان غریبوں کی خصوصی امداد کی جائے۔ صدقات، عطیات اور زکوٰۃ ان حق داروں کو دی جائے جو کہ سفید پوش ہیں اور غیرت مند ہونے کی وجہ سے کسی کے

آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ اس کے علاوہ خصوصی طور پر دکانداروں کو چاہیے کہ کھانے پینے کی اشیاء کی قیمتوں اور ان سے ملنے والے منافع کو ایک مناسب حد پر رکھا جائے تاکہ سفید پوش افراد بھی رمضان کے مہینے میں آسانی سے اشیاء صرف خرید سکیں۔

نجوم پرستی

ہمارے معاشرے میں جہاں بہت سی نئی روایات اور بدعات آن بسی ہیں وہاں تیزی سے ترویج پاتی ہوئی ایک رسم توہم پرستی یا نجوم پرستی، پانسے پھینکنا (cards) بھی ہے ۔قرآن و سنت کی تعلیمات کی وجہ سے مسلمانوں نے سورج، چاند اور ستاروں کی پوجا سے لاتعلقی کو اختیار کیا اور ان کو اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور نشانی کے طور پر قبول کیا لیکن اب حالت کہ ہے ستاروں کے حوالے سے انسانی زندگی پر پڑنیوالے اثرات کے بارے میں کئی طرح کے عقائد مسلمانوں میں نشوونما پاتے جارہے ہیں۔ مسلمان بھی بارہ بروج پر یقین رکھتے ہیں اور ستاروں کی روشنی میں اپنے ماہ و سال اور آئندہ آنے والے ہفتوں اور ایام کا جائزہ لیتے ہیں۔ صبح کا آغاز ہوتے ہی تمام ٹی وی چینلز پر چلنے والے مارننگ شوز میں چاہے مرد ہو یا عورت ایک نہ ایک شخص ایسا شامل ہوتا ہے جو یہ بتاتا ہے کہ آپ کے دن کا حال کیسا گزرے گا؟۔ ستارے کیا کہتے ہیں۔آپ کو کیا کرنا چاہیے ؟ اور کیا نہیں کرنا چاہیے ؟ صرف مارننگ شوز نہیں بہت سے پروگرام بالخصوص اس موضوع کے لیے مختص کیے جا چکے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض چینلز کے مذاحیہ پروگراموں میں بھی ستاروں کی چال اور مستقبل کا حال بتانے والوں کو بہت زیادہ اہمیت دی جانے لگی ہے۔دفاتر، گھروں میں صبح کا آغاز اخبارت میں موجود ستاروں کے حال بتانے

والے صفحہ سے ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ کاروبار اور سفر کے حوالے سے ستاروں کے اثرات پر غور و خوض کرتے ہیں اور اس حوالے سے بہت سے رسائل، جرائد اور اخبارات میں مستقل مضامین بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کو مختلف طرح کی جنتریاں بازاروں میں عام ملیں گی۔ جن میں ماہانہ اور پورے سال کے بارے میں پیشن گوئیاں ملتی ہیں۔ ابلکہ یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ بعض افراد اکوئی بھی کام کرنے یا سفر کرنے سے پہلے مستقبل کا حال بتانے والوں سے رابطہ کرتے ہیں۔ معاشرے میں ستاروں کی چالیں اور مستقبل کا حال بتانے والے دن بدن نہ صرف ایک اہم حیثیت اور مقام حاصل کرتے جا رہے ہیں بلکہ ہر گزرتے دن کے ساتھ ان افراد کی حیثیت اہم ہوتی جا رہی ہے۔ اب تو بعض بڑے شہروں میں مستقبل کا حال بتانے والوں کے دفاتر بھی کھل چکے ہیں۔ ان نجی دفاتر میں مستقبل کا حال بتانے والے لوگوں سے منہ مانگی قیمت وصول کرتے ہیں اگرچہ علم نجوم اور دست شناسی ایک قدیم علم ہیں۔ لیکن ایک علم کو ایمان کی حیثیت دے دینا انتہائی افسوس ناک عمل ہے۔

اللہ نے آسمان کو ستاروں، چاند اور سورج سے سجایا۔ رات کو سفر کرنے والوں کے لیے ستاروں کو سمت معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا۔ چاند اور ستاروں کو بنانے کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ انسانوں کو اندھیری رات کے خوف سے نجات دلائی جائے اور آسمان کو خوبصورتی عطاء کی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ اجسامِ فلکی کو غور و

فکر کا ایک ذریعہ بنایا گیا کہ انسان ان اجسامِ فلکی کو دیکھ کر اللہ کی بڑائی کا اعتراف کرے اور غور کرے کہ وہ ذات کس قدر با اختیار اور بلند مرتبہ ہے جس نے اس قدر خوبصورتی کے ساتھ چاند ستاروں کو نہ صرف تخلیق کیا بلکہ وہ نہ تو ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور نہ ہی گرتے ہیں ۔بلکہ ایک حسابِ مقرر سے اپنے اپنے دائرے میں سفر کر رہے ہیں ۔ یہ اجسامِ فلکی اللہ کی بڑائی تسلیم کرنے کی بھی وجہ ہیں ۔ قرآن پاک سورت نور میں اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا

وہی بڑی برکت و عظمت والا ہے جس نے آسمانی کائنات میں کہکشاؤں کی شکل میں سماوی کروں کی وسیع منزلیں بنائی اور اس میں سورج کو تپش دینے والا چراغ بنایا اور چاند کو چمکنے والااور وہی ذات ہے جس نے دن اور رات کو ایک دوسرے کے پیچھے گردش کرنے والا بنایا اس کے لیے جو غور وخوض کرنا چاہے یا شکر گزاری کا ارادہ کرے (ان تخلیقی قدرتوں میں نصیحت و ہدایت ہے) ۔آیت ٢٦

اس آیت مبارکہ سے ثابت ہوا کہ اجسامِ فلکی کی تخلیق کا مقصد ہدایت ، نصیحت ، غور و خوض اور اس بات کا شکرکے ربِ کائنات نے انسان کے دل کو بہلانے کے لیے کس قدر اہتمام فرمایا۔اور یہ سب تخلیق اس انسان کے لیے ہے کہ وہ خدا کا شکر ادا کرتا رہے کہ اس نے آسمان کو بے رونق نہیں بنایا۔ اس کے علاوہ

سائنس نے انسان کو ستاروں کی حقیقت بھی بتا دی کہ یہ دھکتے ہوئے سورج ہی ہیں جو زمین سے بہت زیادہ فاصلہ ہونے کی وجہ سے ستارے دکھتے ہیں ۔ان ستاروں کو انسان کے لیے مسخر کر دیا گیا کہ وہ ان پر تحقیق کرے۔ سائنسی بنیادوں پر دیکھا جائے تو ان ستاروں سے مستقبل کا حال معلوم کیا ہی نہیں جا سکتا تاہم علم نجوم اور علم اعداد از خود علوم ہیں جو قدیم زمانے سے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان علوم کا غلط استعمال کیا جانے لگا یہاں تک کہ انسان ان علوم کی بنیاد پر کفر کی حدود تک جا پہنچا۔ ستاروں کی چالوں پر اس حد تک اعتبار کیا جانے لگا کہ نہ صرف اللہ پر توکل کا خاتمہ ہوا بلکہ تقدیر پر سے ایمان بھی گیا۔

للہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے جس طرح ستارہ پرستی کی نفی کی ہے اسی طرح ان انسانی زندگی اور قدرتی معاملات پر اثرات کو قبول نہیں کیا۔ ایک حدیث مبارکہ ﷺ میں کچھ اس طرح ارشاد ہوتا ہے

سیدنا زید بن خالد جہنیؓ فرماتے ہیں کہ رسول ﷺ نے ایک دن صبح کی نماز حدیبیہ میں پڑھائی اور رات کو بارش ہوئی تھی ۔جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو تمہارے پروردگار نے کیا فرمایا ہے ؟ ہم نے کہا اللہ اور اس کے رسول ﷺ خوب جانتے ہیں ۔آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرے بندوں میں سے بعضوں کی صبح تو ایمان پر ہوئی اور بعضوں کی کفر

پر۔ تو جس نے یہ کہا کہ بارش اللہ کی رحمت سے ہوئی تو وہ ستاروں کے بارش برسانے کا منکر ہوا اور مجھ پر ایمان لایا اور جس نے کہا کہ بارش ستاروں کی گردش کی وجہ سے ہوئی ہے تو اس نے میرے ساتھ کفر کیا اور ستاروں پر ایمان لایا۔

بالکل اسی طرح کا ایک واقع کتابوں میں کچھ یوں مذکور ہے کہ بعض لوگوں نے دیکھا کہ چند ستارے آسمان پر جب دیکھائی دیتے ہیں تو بارش ہوتی ہے۔ ایسے ہی چند اصحاب کرامؓ نے نبی پاک ﷺ سے فرمایا کہ یا رسول اللہ ہم دیکھتے ہیں کہ فلاں ستارے جب آسمان پر نمودار ہوتے ہیں تو بارش ہوتی ہے۔ نبی پاک ﷺ نے اس بات پر قدرے غصہ فرمایا اور فرمایا جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ۔ افسوس ! میری امت کی حالت اب یہ ہے کہ وہ اللہ پر توکل کرنے کی بجائے ستاروں پر اعتقاد کرنے لگے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے اس فرمان کے بعد لوگوں کو شرمندگی کا احساس ہوا اور انھوں نے توبہ استغفار کی۔ اس واقع سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام ستارہ پرستی کی اجازت نہیں دیتا۔ نجوم کی چالوں پر اعتبار کرنے کی بجائے اللہ پر توکل کا حکم دیتا ہے۔

مذکور واقعہ اور حدیث اس حقیقت کو واضع کرتی ہے کہ صرف ایک بارش کی نسبت اللہ کی ذات کو چھوڑ کر ستاروں سے کی جائے تو انسان اللہ کی ذات کا منکر ہو جاتا ہے۔

توجہ طلب امر یہ ہے کہ جو شخص اپنے آنے والے ماہ و سال اور آئندہ کے سفر، کاروبار شادی بیاہ اور دیگر معاملات کو ستاروں کی روشنی میں دیکھتا ہے تو اس کی کیفیت کیا ہو گی، ؟ اسلام لانے کے بعد ہم سب کے لیے اجرامِ سماویہ کی پوجا کو چھوڑنا اور ان کو صرف اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور نشانی سمجھنا ضروری ہے۔

کراچی اموات: ذمہ دار کون؟

جون کے مہینہ کے آغاز کے ساتھ ہی گرمی میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس سال گرمی پہلے سے کچھ زیادہ پڑ رہی ہے۔ پورے ملک میں گرمی کی وجہ سے لوگ نڈھال ہیں۔ اس گرمی کے ساتھ ساتھ بجلی کی طویل لوڈ شیڈنگ نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ اس مہینہ کے آغاز کے ساتھ ہی ماہِ رمضان کا آغاز ہوا۔ روزہ کی حالت میں پیاس اور گرمی کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے، ایسے حالات میں لوڈ شیڈنگ ایک عذاب کی صورت میں مسلط نظر آتی ہے۔ہمیشہ کی طرح رمضان کے آغاز میں اعلان کیا گیا کہ رمضان میں بجلی کی لوڈ شیڈنگ نہیں کی جائے گی تاہم یہ بیان بھی سیاسی ثابت ہوا اور بجلی کی لوڈشیڈنگ میں کمی نہ ہو سکی۔ اس سال کا موسم گرما کراچی اور اس کے گردونواح کے لیے موت کا پیام لے کر آیا ہے۔جون کا مہینہ ہمیشہ سے گرمی کی شدت لے کے آتا ہے تاہم اس سال پڑنے والی گرمی نے پچھلے تمام سالوں کے ریکارڈ توڑ دیئے اور گرمی کی وجہ سے ہونے والی اموات گزشتہ کسی بھی سال سے کہیں زیادہ ہیں۔

صوبہ سندھ پچھلے چند سالوں سے قدرتی آفات کی زد میں ہے۔اس صوبے میں موت کے سائے گہرے سے گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ پہلے تھر کا وہ علاقہ جہاں مور رقص کیا کرتے تھے موت کا مسکن بن کر رہ گیا۔ ان گنت افراد کی جانیں بھوک اور

پیاس کے ہاتھوں گئی۔اور اب موت کا یہ آفریت تھر سے نکل کر کراچی کی جانب سفر کر چکا ہے جہاں اس نے کئی جانوں کو اپنا نشانہ بنایا۔ کراچی اور اس کے گردو نواح میں شدید گرمی اور بجلی کی لوڈشیڈنگ کی وجہ سے ایک ہزار سے زائد افراد اپنی جان کی بازی ہار چکے ہیں۔ ہسپتالوں کی ایمرجنسی وارڈز مریضوں سے بھر چکے ہیں۔ مردہ خانوں میں جگہ کم پڑنے لگی ہے۔ گرمی سے سسکتے اور جانوں سے جاتے لوگوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ قبرستانوں میں قبروں تک کی جگہ میں کمی کے باعث لاشوں کو مشترکہ قبروں میں دفن کیا جا رہا ہے۔ صرف یہی نہیں قبر اور تدفین کی قیمتوں میں بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک قبر کا ریٹ پچیس ہزار تک جا پہنچا ہے۔

سیاسی نمائندوں کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ ایک جانب موت کے منہ جاتے عوام ہیں تو دوسری جانب افطار پارٹیوں میں مشغول وہ قومی نمائندے جو انھی عوام کی ووٹ لے کر اقتدار کی کرسیوں پر براجمان ہیں۔ اگر ان پارٹیوں میں خرچ ہونے والی رقوم کا چندفی صد حصہ بھی ان بے کس عوام کے لیے خرچ کیا جائے تو حالات پر قابو پانا کچھ اتنا مشکل بھی نہیں۔ لیکن ایوانِ اقتدار کے اے سی فٹیڈ کمروں میں بیٹھے ان نمائندوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ موت کا آفریت کس طرح گرمی اور لوڈشیڈنگ سے نڈھال عوام کو گھیرے ہوئے ہے۔ ان بے بس اور مجبور لوگوں کے لیے عملی اقدامات کرنے کو کوئی تیار نہیں۔ نہ تو تھر

کے لیے کوئی عملی اقدامات کئے گئے اور نہ ہی اب کراچی کے لیے۔ وفاقی حکومتی نمائندے صوبائی حکومتی نمائندوں کو، حکمران سیاسی جماعت کے ارکان سابق حکومت کو اپوزیشن حکومت کو، اور حکومت کے اے ایس سی کو موردِ الزام ٹھہراتے نظر آتے ہیں۔ کوتاہی کس جگہ ہوئی اور اس کا اصل ذمہ دار کون ہے؟ان اموات کی ذمہ داری کس کے سر آتی ہے؟

کے ایس سی، صوبائی حکومت اور وفاقی حکومت یہ تمام ادارے اس تباہ کن گرمی میں جان سے جاتے لوگوں کی اموات کے ذمہ دار ہیں۔ رمضان کے بابرکت مہینے میں بجلی کی لوڈشیڈنگ میں کمی اور پانی کی مناسب فراہمی ممکن بنانا ضروری ہے۔ بجلی کی لوڈ شیڈنگ کی ذمہ داری بنیادی طور پر کے ایس سی کے سر آتی ہے۔ حکومت چاہے وہ صوبائی ہو یا وفاقی پورے صوبے یا پورے ملککے عوام کی جان و مال کی ذمہ دار ہے۔ حالیہ حکومتی سیاسی جماعت کے مینڈیٹ میں بجلی کے بحران کا خاتمہ ایک بنیادی حیثیت رکھتا تھا۔ مسلم لیگ نے الیکشن میں بیسیوں بار یہ وعدہ کیا تھا کہ اس بحران سے جلد از جلد نبٹا جائے گا تاہم حکومت میں آنے کے تین سال گزر جانے کے باوجود بجلی کا بحران جون کا توں نہ صرف موجود ہے بلکہ اس میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ مسلم لیگ ن کے وعدوں کے ناقص ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ سینٹ کا اجلاس ہو یا قومی اسمبلی کا حکومتی ارکانِ اسمبلی اور اپوزیشن میں زبانی کلامی جنگ کا اندازہ اس بات سے لگا یا جا

سکتا ہے کہ وفاقی وزیر برائے پانی و بجلی پر جب کراچی میں ہونے والی بدترین لوڈشیڈنگ کا الزام لگایا جاتا ہے تو جواب میں وہ بجائے اس کے کہ کوئی ہنگامی کارکردگی کا مظاہرہ کریں وہ تنقید کرنے والوں پر برستے نظر آتے ہیں۔

وفاقی حکومت کی کوتاہیاں اپنی جگہ اب جائزہ لیجیے ! صوبائی حکومت کی کارکردگی کا۔ سندھ کی حکمران جماعت پیپلز پارٹی جو ایک طویل عرصے سے نہ صرف حکومت میں ہے بلکہ کراچی اور اس کے گرد و نواح میں ایم کیوایم اور پیپلز پارٹی کا ایک واضع مینڈیٹ موجود ہے۔ پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والے سیاسی نمائندے، اور پارٹی کی عالی قیادت اس مشکل وقت میں بجائے اس کے عوام کا ساتھ دیتے ، پانی کی فراہمی یا بجلی کی لوڈشیڈنگ پر قابو پانے کے لیے سخت اقدامات کرتے ، ملک چھوڑ کر جا چکے ہیں اور بلاول بھٹو زرداری ، آصف علی زرادی اور کئی وزراء بھی بیرونِ ملک روانہ ہو چکے ہیں۔ جبکہ متحدہ قومی مومینٹ بھی تنقید برائے تنقید میں مصروفِ عمل ہے۔

سیاسی جماعتوں کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ گرمی سے متاثرہ افراد جو کہ ہسپتالوں میں زیرِ علاج ہیں ان کی خبر گیری کو کوئی وزیر اول تو آتا ہی نہیں اگر آتا ہے تو سیکیورٹی کے نام پر ہسپتالوں میں مریضوں اور ان کے

لواحقین کے لیے ہسپتالوں کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔وزراء یا سیاسی جماعتوں کے کارکنوں کا ہسپتال میں نہ آنا، مریضوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دینا جہاں ایک المیہ ہے وہاں ان کا آنا، وی آئی پی مومینٹ اور سیکیورٹی کے نام پر ہسپتالوں میں سخت پابندیوں کا لگ جانا ایک الگ وبالِ جان ہے۔اتنے زیادہ جانی نقصان کے بعد وزیراعظم نے کراچی کا دورہ کیا۔ وفاقی وزیر برائے بجلی و پانی نے لوڈشیڈنگ کی بجائے گرمی کو موردِ الزام ٹھہرایا۔لفاظی کی جنگ میں ہر ایک پارٹی دوسری پارٹی سے سبقت لے جانے کی کوشش میں ہے لیکن جہاں عملی اقدامات کی بات آتی ہے وہاں کوئی پارٹی نظر نہیں آتی۔

اس مشکل وقت میں اگر کوئی ادارہ کام کرتا نظر آتا ہے تو وہ صرف فوج اور رینجرز ہیں ۔پاک فوج نے کراچی میں کئی بحالی کیمپ لگائے ہیں جن میں پینے کے صاف پانی کا وافر انتظام موجود ہے۔اس کے علاوہ پاک فوج کے ڈاکٹر ہر لمحہ ان کیمپوں میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اور اس کوشش میں ہیں کہ کسی طرح گرمی سے ہونے والی اموات میں کمی لائی جاسکے۔

مذکورہ حالات کو اگر سامنے رکھا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کراچی کے مکینوں کو موت کے اس شکنجے سے باہر نکالنے کے لیے کسی کانفرنس، کسی ٹی وی شو کی نسبت عملی اقدامات کی اشد ضرورت ہے۔ وفاق اور دوسرے صوبوں کو اس

آفت زدہ شہر کے لیے امداد کے طور پر پینے کا صاف پانی، پنکھوں کی فراہمی کو یقینی بنانا چاہیے۔ حکومتِ سندھ کو ہر ایک صوبائی کارکن کی ایک دن کی تنخواہ کاٹ کر اس کو عوام پر خرچ کرنی چاہیے۔ نہ صرف حکومت بلکہ رمضان کے اس بابرکت مہینے میں مخیّر حضرات کو بھی اس کارِ خیر میں حصہ لینا چاہیے۔

ماہِ رمضان

ماہِ رمضان کی آمد آمد ہے۔ یہ مہینہ مسلمانوں کے لیے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ مبارک مہینہ اپنے ساتھ بے شمار فیوض و برکات لے کر آتا ہے۔ رمضان کے آغاز کے ساتھ ہی گلیوں بازاروں میں رونق بڑھ جاتی ہے۔ مسجدوں میں عبادات کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس ماہِ مبارک مہینے کو رحمتوں کا مہینہ بھی کہا جاتا ہے۔ دراصل یہ ایک ایسا مہینہ ہے جو کہ تقویٰ اور پرہیزگاری کی جانب بڑھنے کے لیے ایک پریکٹس کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ماہِ مبارک میں روزہ رکھنے والا شخص ان غریبوں کی بھوک اور پیاس کا اندازہ کر پاتا ہے جنھیں کھانے کو کچھ میسر نہیں۔ جسمانی برکات کے ساتھ ساتھ اس ماہِ مبارک کو جہنم سے نجات کا مہینہ بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن اور حدیث میں رمضان کے ان گنت فضائل بیان ہوئے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ (البقرہ: ۱۸۳)

ایک اور جگہ کچھ یوں ارشاد ہوتا ہے

رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا ہے جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور جس میں رہنمائی کرنے کرنے والی اور (حق اور باطل میں) امتیاز کرنے والی

واضح نشانیاں ہیں۔ پس تم میں سے جو کوئی اس مہینے کو پالے تو وہ اس کے روزے رکھے (البقرہ : ۱۸۵)

حدیث مبارکہ میں کچھ اس طرح بیان ہوا۔

جو شخص روزہ رکھ کر جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ تعالی کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ کھانا پینا چھوڑ دے۔ (بخاری)

جب کوئی روزہ رکھے تو کوئی بے ہودہ بات نہ کرے نہ ہی لغویات کرے۔ اگر کوئی اس سے جھگڑا کرے تو وہ کہہ دے میں روزے سے ہوں۔ (بخاری) گویا روزہ دار کے لیے جائز نہیں کہ وہ روزہ رکھ کر بھی ان کاموں کو نہ چھوڑے جن کو اپنانے کی مذہب اجازت نہیں دیتا۔ روزہ دار اگر گالی گلوچ ، ذخیرہ اندوزی ، اور دیگر برائیاں نہ چھوڑے تو روزہ رکھنے کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ روزہ از خود بھوکا پیاسا رہنے کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ایسی احسن تربیت ہے جس کو اگر مکمل روح کے ساتھ اپنایا جائے تو کئی قسم کی برائیوں کا خاتمہ ممکن ہے۔ روزہ نہ صرف معاشرتی برائیوں کے خلاف ایک جنگ ہے بلکہ یہ کئی طرح کی بیماریوں روحانی اور جسمانی سے بچاؤ کا ایک ذریعہ ہے۔ رمضان کا احترام یہ ہے کہ روزہ رکھ کر دین پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی جائے ، اور جو عادات رمضان میں اپنائی جائیں انھیں اگلا پورا سال اپنی زندگیوں پر لاگو کیا جائے۔ ہمارے ہاں رمضان میں تو مساجد میں رونق دیدنی ہوتی ہے لیکن رمضان کے گزر

جانے کے بعد مساجد میں نمازیوں کی تعداد میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔

ہمارے ہاں روزہ تو بڑے اہتمام سے رکھا جاتا ہے تاہم اکثر و بیشتر دیکھنے میں آیا ہے کہ روزہ رکھنے کے باوجود ہمارے یہاں نہ تو ذخیرہ اندوزی چھوڑی جاتی ہے، اور لوگ بازاروں، دفاتر اور گھروں میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ غریبوں اور ناداروں کا احساس نہیں کیا جاتا اور نہ ہی اپنے نفس کا تذکیہ کیا جاتا ہے۔

ہر سال ماہِ رمضان برکتیں اور رحمتیں اپنے ساتھ لاتا ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے معاشرے میں موجود برائیوں میں کوئی خاطر خواہ کمی نہیں ہوتی اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہمارے ہاں روزہ تو رکھا جاتا ہے لیکن اس کی روح کو سمجھنے یا روزے کی فرضیت کے مقاصد کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔بنیادی طور پر ہمارے ہاں روزے کو ایک فرض کے طور پر رکھا جاتا ہے۔ حالانکہ روزہ کی حیثیت ایک ایسی جسمانی عبادت کی سی ہے جو کہ انفرادی حیثیت سے لے کر اجتماعی طور پر پورے معاشرے کی اصلاح کا سبب بن سکتا ہے۔

مغربی ممالک میں دیکھا گیا ہے کہ جب ان کے ہاں کرسمس یا کوئی اور مذہبی تہوار آتا ہے تو یہ ممالک میں مذہبی تہواروں کے موقع پر حکومت اور تاجر

حضرات کی جانب سے خصوصی اقدامات کیے جاتے ہیں۔ امریکہ، جرمنی، برطانیہ اور خاص طور پر یورپی ممالک میں یہ رواج عام ہے کہ ان ممالک میں کرسمس کے دنوں میں کھانے پینے کی اشیاء کے نرخ کم کر دیئے جاتے ہیں۔ ہیں تاکہ وہ لوگ جن کی قوتِ خرید کم ہے یا وہ جو غریب ہیں انھیں ان اشیاء کی خریداری میں آسانی ہو۔
لیکن ہمارے وطنِ عزیز میں ان ممالک کے برعکس ہوتا ہے۔ ہم فیشن پرستی اور زبان کے معاملے میں تو ان ممالک کی پیروی کرنے کو قابلِ فخر سمجھتے ہیں لیکن غریبوں اور ناداروں کے احساس کی جہاں بات آتی ہے وہاں ہم مذہب اسلام پر تو کیا، ان مغربی ممالک کے نقشِ قدم پر چلنا پسند نہیں کرتے۔ ہمارے ملک میں ماہِ رمضان جہاں اپنے ساتھ بے شمار رحمتیں اور برکتیں لے کر آتا ہے وہاں مہنگائی کا ایک طوفان بھی اپنے ساتھ لاتا ہے۔ رمضان کا آغاز ہونے سے پہلے ہی بجٹ کی آمد نے لوگوں کی قوتِ خرید پر نہایت برے اثرات مرتب کیے ہیں۔ رمضان ایک ایسا مہینہ ہے جس میں تقریباً ہر شخص کی کوشش ہوتی ہے کہ افطار پر کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا اہتمام کیا جائے ایسے میں فروٹ، دہی، چنا، ٹماٹر وغیرہ کی مانگ میں اضافہ ہو جاتا ہے، اس مانگ میں اضافے کو دیکھتے ہوئے دکان دار ان اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ خصوصاً جب عید کے دن قریب ہوتے ہیں تو کپڑوں اور جوتوں کے نرخوں میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

کھانے پینے کی اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ کو روکنے کے لیے حکومت نے کوئی اقدامات نہیں کیے اور نہ ہی ان اشیاء کی قیمتوں کے تعین کے لیے کوئی اقدام کیا گیا۔تاجر حضرات اپنی مرضی سے قیمتوں میں اضافہ کر دیتے ہیں۔جس کی وجہ سے غریب طبقہ اس مبارک ماہ میں بھی کھانے پینے کی چیزوں تک سے محروم رہتا ہے۔اگرچہ حکومت ماہ رمضان میں ہر سال کھانے پینے کی اشیاء پر ایک مخصوص سبسڈی دیتی ہے۔یوٹیلٹی سٹورز میں موجود دالوں ، وغیرہ کی قیمتوں میں کمی کی جاتی ہے تاہم عام دکاندار ان سٹورز سے بھاری تعداد میں اشیاء صرف کم داموں خرید لیتے ہیں اور انھیں زخیرہ کر کے بعد میں مارکیٹ میں مہنگے داموں فروخت کرتے ہیں۔جس کی وجہ سے یوٹیلٹی سٹورز پر موجود ان اشیاء کی قلت ہو جاتی ہے۔عام صارف اس سبسڈی سے بھی کوئی فائدہ حاصل کرنے سے قاصر رہتا ہے۔اسے باہر حال یہ اشیاء عام دکانوں سے مہنگے داموں خریدنا پڑھتی ہیں۔حکومت کو چاہیے کہ اس طرح کے اقدامات کو روکنے کے لیے خصوصی اقدامات کرے۔اس سلسلے میں علاقے کے ڈی سی او کو خصوصی ہدایات دی جائیں۔تاکہ حکومت کی جانب سے دی گئی سبسڈی کا فائدہ اس سفید پوش شخص کو بھی پہنچے جس کا یہ حق ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ اس ماہِ مبارک میں تاجر حضرات اور مخیّر حضرات کو چاہیے کہ ان غیریبوں کی خصوصی امداد کی جائے۔صدقات ، عطیات اور زکوۃ ان حق

داروں کو دی جائے جو کہ سفید پوش ہیں اور غیرت مند ہونے کی وجہ سے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے ۔اس کے علاوہ خصوصی طور پر دکانداروں کو چاہیے کہ کھانے پینے کی اشیاء کی قیمتوں اور ان سے ملنے والے منافع کو ایک مناسب حد پر رکھا جائے تاکہ سفید پوش افراد بھی رمضان کے مہینے میں آسانی سے اشیاء صرف خرید سکیں۔

سیلاب: قدرتی آفت یا غفلت

پچھلے چند سالوں میں تقریباً ہر سال مون سون کے موسم میں ارضِ وطن سیلاب کی زد میں رہتی ہے۔ہر سال کی طرح اس سال بھی سیلاب نے ارضِ وطن کے کئی اضلاع میں نہ صرف تباہی پھیلائی ، ان گنت مکانات ، مویشی اور افصلیں سیلابی ریلوں کی زد میں آ کر تباہی کا شکار ہو گئیں۔کم و بیش پانچ لاکھ سے زائد انسانی جانیں بھی ان پانیوں کی نذر ہو گئیں۔ہر سال مون سون کے موسم میں دریائے چناب اور دریائے سندھ میں پانی کی سطح اس حد تک بلند ہو جاتی ہے کہ آس پاس کے دیہات زیرِ آب آ جاتے ہیں۔اس سیلاب کی بنیادی وجہ گرمی کے موسم میں شمالی علاقہ جات میں موجود گلیشیئروں کی برف کا پانی میں تبدیل ہونا ، مون سون میں بارشوں میں اضافہ شامل ہیں۔ گرمی کی شدت سے گلیشیئر کا پگلنا، مون سون کی بارشیں اور دریاؤں اور ندی نالوں میں پانی کی مقدار میں اضافہ نہ صرف ایک قدرتی عمل ہے، دریاؤں میں پانی کی مقدار میں اضافہ کے بارے میں محکمہ موسمیات نے چند ماہ پہلے سے پیشن گوئی کر دی تھی تاہم اس پیشن گوئی کو مد نظر رکھتے ہوئے سیلاب سے بچاؤ کے کوئی اقدامات نہیں کئے گئے۔جب مون سون کے آغاز کے ساتھ ہی بھارت اپنے ڈیموں کا پانی چھوڑ دیتا ہے جس کی وجہ سے بھی سیلابی صورت حال بن جاتی ہے۔

اگر زمینی حقائق کا جائزہ لیا جائے تو اس سیلاب کی بڑی وجہ دریائے سندھ میں پانی کی مقدار میں بے پناہ اضافہ ہے۔ دریائے سندھ پاکستان کا سب سے بڑا دریا ہے۔ یہ دریا تبت کی پہاڑیوں سے ایک نالے کی صورت میں نہایت تنگ چوڑائی لیے جموں کشمیر سے ہوتا ہوا پاکستان میں داخل ہوتا ہے۔ دریا کے آغاز میں پانی کا بہاؤ بہت زیادہ نہیں ۔صوبہ پنجاب میں دریائے سندھ میں دریائے راوی، چناب، جہلم، بیاس اور ستلج شامل ہو جاتے ہیں۔ اٹک کے قریب دریائے کابل اس میں شامل ہوتا ہے۔ اس طرح جیسے جیسے یہ دریا میدانی علاقوں کی جانب بڑھتا ہے اس میں دوسرے ندی نالے شامل ہو کر اس میں پانی کی مقدار، اس کی چوڑائی میں اضافہ بنتے جاتے ہیں۔ جوں جوں دریا میدانی علاقوں کی جانب بڑھتا ہے توں توں پانی کے بہاؤ میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، پانی کے بہاؤ میں اضافہ کی وجہ سے دریا اپنے ساتھ مٹی لے کر آتا ہے جو دریا کی گہرائی میں کمی کرتی چلی جاتی ہے۔ ایسے میدانی علاقوں میں جو کہ قدرے نشیبی ہیں وہاں دریائے سندھ کی چوڑائی کم، پانی کے بہاؤ میں اضافہ ہو جاتا ہے اور یہ اضافی پانی دریا پر پہلے سے موجود بند اور پشتے توڑ کر آبادیوں میں داخل ہو کت تباہی کا سبب بنتا ہے۔ اس طرح یہ دریا پاکستان میں موجود پانی کے ذخائر میں نہ صرف سب سے بڑا ذخیرہ ہے بلکہ پورے ملک کو سیراب کرنے کا باعث بھی ہے۔ پورے ملک کو سیراب کرتے ہوئے مٹھن کوٹ اور پنج ند سے ہوتے ہوئے ٹھٹھا کے شرق میں ڈلٹا بناتے ہوئے بحیرہء عرب میں شامل ہو جاتا

ہے۔پاکستان کا سب سے بڑا دریا ہونے کی وجہ سے دریائے سندھ تقریبا تین صوبوں سے گزرتا ہے،اس لیے اس دریا میں جب بھی پانی کا بہاؤ ایک خاص سطح سے بلند ہوتا ہے یا سیلابی صورت حال پیدا ہوتی ہے تو تقریبا پورا ملک ہی متاثر ہوتا ہے۔اس سال صوبہ سندھ اور صوبہ پنجاب میں سیلاب سے متاثر ہونے والوں کی تعداد پچھلے سالوں کی نسبت زیادہ ہے۔۔ہم ہر سال کئی کیوسک پانی بحیرۂ عرب میں ضائع کر دیتے ہیں۔ پاکستان میں پانی کی اس اضافی مقدار کو ذخیرہ کرنے کے لیے ہمارے ملک میں صرف دو بڑے ڈیم (منگلا اور تربیلا) ہیں۔ تیسرا بڑا ڈیم (کالا باغ ڈیم ہے) جس کی تعمیر کئی برس سے بحث و مباحثہ کی نظر ہوتی چلی آ رہی ہے۔سال ہا سال سے یہ ڈیم بنانے کی سمریاں بنائی جاتی ہیں اس معاملے پر بحث و مباحثہ کیا جاتا ہے، پیسہ خرچ کیا جاتا ہے لیکن باوجود ان سب کے اس ڈیم کی تعمیر سیاسی مباحثوں کی نظر ہوتی چلی آئی ہے۔اگر پانی کی اضافی مقدار کو ذخیرہ کرنے کے لیے کالا باغ ڈیم یا چند چھوٹے چھوٹے ڈیم بنا دئے جائیں تو ملک میں جاری بجلی کے بحران پر نہ صرف قابو پایا جا سکتا ہے بلکہ پاکستان دوسرے ملکوں کو بجلی درآمد کرنے کے بھی قابل ہو سکتا ہے۔اس سلسلے میں صوبائی حکومتوں کو چھوٹے ڈیموں کی تعمیر کا کام سونپا جانا چاہیے۔

دریاؤں کے پانی میں اضافہ اور بارشیں ایک قدرتی عمل سہی لیکن ہر سال مون سون میں سیلاب کی بڑی وجہ ہر گزرتے دن کے ساتھ ہماری غفلت بھی ہے۔ پاکستان کی آزادی کے بعد سے لے کر آج تک اس معاملے پر کسی قسم کی خصوصی توجہ نہیں دی گئی ۔نہ تو دریاؤں ، ندی نالوں کی بھل صفائی کروائی گئی ، نہ ان کی کھدائی کروائی گئی ، نہ ڈیم بنایئے گئے اور نہ ہی ان پر نئے بند باندھے گئے۔ سوائے دو بڑے ڈیموں کے کوئی نیا بڑا ڈیم بنانا تو درکنار کوئی چھوٹا ڈیم بھی نہیں بنایا گیا۔ ہمارے برعکس آزادی کے چند برس بعد ہی پڑوسی ملک میں کئی ڈیم بنائے گئے یہاں تک کہ سندھ طاس معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پاکستان کے حق پر ڈاکہ ڈال کر اس دریا پر بھی ڈیم بنایا گیا جو کہ پاکستان کا حصہ تھا۔

اگرچہ معاشی مجبوریوں کی وجہ سے ملک میں بڑے ڈیم بنانا مشکل امر ہے تاہم ان نشیبی علاقوں میں کئی چھوٹے چھوٹے ڈیم اور بند بنائے جا سکتے ہیں۔ جو جو علاقے نشیب میں واقع ہیں وہاں قدرتی طور پر پانی ذخیرہ کرنے کے لیے تالاب بنائے جا سکتے ہیں۔ مون سون کا موسم شروع ہونے سے پہلے مٹی ہی سے نئے بند اور پشتے بنائے جانے چاہیں، پہلے سے موجود بندوں اور پشتوں کو مضبوط کیا جائے تاکہ سیلاب کی تباہ کاریوں کو اگر مکمل طور پر نہ روکا جاسکے تب بھی کم از کم ان میں کمی لائی جائے۔ اس سیلاب کو روکنے کے لیے سیلاب سے

متاثرہ علاقوں کے مکینوں ہی کی مدد سے دریاؤں کی کھدائی کروا کر ان کی گہرائی میں اضافہ کروایا جا سکتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال چین کی ہے۔

چین میں موجود دریائے سینک کیانگ طغیانی اور سیلاب کی وجہ ہر سال ملک میں تباہی پھیلاتا تھا۔ دریائے سینک کیانگ، ہمارے ملک میں موجود دریائے سندھ کی طرح چین کا سب سے بڑا دریا ہے۔ جب وہاں کے عوام اور حکمرانوں کو اس تباہی سے بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی مالی وسائل کی کمی وہاں بھی ڈیم بنانے کی راہ میں حائل ہوئی تو انھوں نے ان نشیبی علاقوں میں بسنے والے سیلاب زدگان ہی کی مدد سے اس دریا کی کئی کئی فٹ تک کھدائی کروائی اور دریا کو اس حد تک گہرا کیا گیا کہ چاہے پانی کی مقدار میں کتنا ہی اضافہ ہی کیوں نہ ہو جائیسیلابی صوتحال پیدا نہیں ہوئی اور تباہ کاری بھی نہیں ہوتی۔ اسی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے دریائے سندھ کی چوڑائی اور گہرائی دونوں میں اضافہ کیا جا سکتا ہے اور اس کے لیے کسیبہت بڑی مالی رقوم بھی درکار نہیں۔

سیلاب زدگان کو ہی دریائے سندھ کی گہرائی کا کام سونپا جا سکتا ہے۔ چونکہ سیلاب کی وجہ سے ان علاقوں میں بے روزگاری بھی بڑھ جاتی ہے اس لیے انھی سیلاب زدگان کو مطلوبہ اوازر فراہم کر کے کم داموں یہ کروایا جا سکتا ہے۔ سیلاب زدگان چونکہ خود بھی اس سیلاب سے بار بار نقصان اٹھانے کے متحمل نہیں

ہو سکتے اس لیے انھیں یہ کام کرنے میں کوئی آر بھی محسوس نہیں ہو گی۔ اس تمام کام میں ان امدادی رقوم سے کہیں کم رقم استعمال ہو گی جو کہ سیلاب کے بعد سیلاب زدگان کی بحالی کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اور سیلاب کی تباہ کاریوں پر خرچ ہونے والی رقوم کسی فلاہی منصوبے یا کسی ترقیاتی منصوبے پر خرچ کی جا سکیں گی۔ اس طرح دریا کی گہرائی اور چوڑائی میں اضافہ اگلے کئی برس کے لیے سیلاب کو روک سکے گا۔

یومِ آزادی

14اگست کی آمد کے ساتھ ہی ارضِ وطن کے طول و عرض میں جھنڈیاں اور ملکی پرچم ہر جانب لہراتے نظر آتے ہیں۔ 14 اگست ہر سال یوم آزادی کے طور پر منایا جاتا ہے۔اس دن سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری کم و بیش تمام اداروں میں تقریبات منعقد کی جاتی ہیں۔ ان تقریبات میں بہت سا پیسہ بھی خرچ کیا جاتا ہے۔ مساجد، گرجا گھروں اور عبادت گاہوں میں ملکی سلامتی اور ملک میں امن و امان کے لیے خصوصی دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ اس عزم کا عیادہ کیا جاتا ہے کہ ملکی سلامتی اور بقاء کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا جائے گا۔ یومِ آزادی پر یہ دعائیں ہر سال اسی کروفر سے مانگی جاتی ہیں۔

لیکن ٹھہریے ! کیا تقریبات منعقد کر لینا، جھنڈیاں لہرا دینا، دعائیں مانگ لینا کافی ہے ؟ نہیں۔۔۔ارضِ وطن کی بقاء، سلامتی، عزت و حرمت کے لیے یوم آزادی شان و شوکت سے منا لینا کافی نہیں ہے۔اس کے لیے عملی طور پر بے لوث خدمت کے لیے ہر ایک چھوٹے بڑے، عوام سے لے کر حکمرانوں تک ہر ایک کو اپنے فرائض سے آگاہی، اور ان فرائض کو ادا کرنے کے لیے جذبہ کی ضرورت ہے۔حب الوطنی کا یہ جذبہ صرف اور صرف یومِ آزادی تک ہی محدود رہتا ہے یہاں تک کہ چودہ اگست گزر جانے کے بعد یہی جھنڈیاں جو یومِ آزادی کے لیے سجائی جاتی

ہیں کسی عام کاغذ یا کوڑے کرکٹ کی طرح نالیوں اور سڑکوں کی زینت بن جاتی ہیں۔ لوگ ان جھنڈیوں کو اپنے پاؤں تلے روند کر گزرتے جاتے ہیں۔ کوئی بھی احتراماً ان جھنڈیوں کو اٹھانے کی زحمت نہیں کرتا اور اگر کوئی اٹھا کر سنبھالے تو ارد گرد والے اسے حیرت سے دیکھتے ہیں اور بعض اوقات اس کا مذاق اڑاتے، طنز کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ واضع رہے کہ جب تک ہم خود اپنے پرچم کی عزت اور احترام نہیں کریں کوئی دوسرا کیسے اس پرچم کا احترام کرپائے گا؟ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس مقدس پرچم کی عزت واحترام کیا جائے تو ہمیں خود کو اور اپنے بچوں کو اس کا احترام سِکھانا ہوگا۔ انھیں یہ بتانا ہوگا کہ یہ ایک کاغذ کا ٹکڑا نہیں جیسے یومِ آزادی پر اپنے گھر اور گلیوں میں لگایا جائے اور پھر بھول جائیں چاہے یہ پھٹے یا پاؤں تلے روندا جائے۔ جنھوں نے اس پرچم کو سربلند کرنا ہے انھیں اس پرچم کے تقدس کا ادراک ہونا ضروری ہے۔ جو خود اس کی حرمت کو پامال کرتے ہوں وہ کیسے کسی دوسرے کو اس کی بے حرمتی سے روک پائیں گے۔ اگر کسی غیر ملک میں ہمارے پرچم کو زمین پر پھینک کر اس پر پاؤں مارے جائیں یا اس کی بے حرمتی کی جائے تو وہ ہمارے لیے نہایت ہی افسوس، غم و غصہ کی بات ہوگی لیکن جب ہم اور ہمارے بچے خود یہ کام کریں، بے حرمتی کریں گے تو ہم کسی کو روکنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔

ہمارے ہر طبقے کو اس وطن، اس پرچم کی عزت واحترام کا خیال رکھنا ہوگا۔

چاہے وہ کوئی بھی ہو، حکمران ہو یا عوام ،بڑا ہو یا چھوٹا، اس وطن کی عزت کے سبھی محافظ ہیں۔ سبھی اپنی اپنی جگہ اس وطن کے سفیر ہیں۔ ہمارا ہر عمل صرف ہمارا نہیں اس ملک کا بھی عمل ہے وہ ایک پاکستانی کا عمل ہے۔ خصوصا میڈیا پر ایک کڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ صرف اس معاشرے میں موجود برائیوں کی تشہیر کرنے کے ساتھ ساتھ اس ملک میں موجود نعمتوں کو بھی اس دنیا کی نظروں کے سامنے لایا جائے۔ یہ مقدس زمین جس کو حاصل کرنے کے لیے نہ جانے کتنی جانیں قربان ہوئیں، کتنی عزتیں پامال ہوئیں صرف ایک زمین کا ٹکڑا نہیں ہے بلکہ ہماری نسلوں کی بقاء کی ایک وجہ بھی ہے۔ ہماری آنے والی بیٹیاں اسی وطن کی بدولت عزت کی زندگی گزار سکیں گی اور یہ تبھی ممکن ہے جب آج کی نسل ہاتھ پر ہاتھ رکھے منتظرِ فردا نہ رہے بلکہ عملا کام کرے، جدوجہد کرے۔

ایسا نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں کوئی کمی ہے۔ ہمارا ملک ہر طرح کے خزانوں، قدرتی وسائل، انسانی وسائل سے مالا مال ہے۔ آیئے! ایک نظر اس ملک کی اچھائیوں کی جانب ڈالتے ہیں۔ قدرتی طور پر ہمارا ملک ایک بہترین جغرافیائی حیثیت رکھتا ہے چاہے وہ حیثیت دفاعی ہو، اقتصادی ہو یا سیاسی۔ اگر جغرافیائی لحاظ سے دیکھا جائے تو ہمارا ملک مسلم ممالک اور غیر مسلم دونوں ممالک کے لیے ایک گیٹ وے کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کی ایک جانب مسلم ممالک کا

بلاک ہے تو دوسری جانب غیر مسلم ممالک کا۔ پاکستان کے قریب ہی دنیا ایک بہت بڑی اقتصادی قوت (چین) واقع ہے جو کی مالی اعتبار ہے دنیا میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے ۔ شمال مشرق میں روس سے آزادی حاصل کرنے والے اسلامی ممالک واقع ہیں ۔ اس طرح ہمارا ملک ان تمام ممالک کو جوڑنے اور ان کے درمیان ایک تجارتی شاہراہ کی حیثیت سے کثیر زرِ مبادلہ حاصل کر سکتا ہے ۔ اس کے علاوہ پاکستان کے پاس گرم پانی کی بندرگاہیں ہیں جو کہ اسے دوسرے ممالک میں ممتاز کرتی ہیں ۔ لیکن آج تک ان بندرگاہوں سے اس طرح سے فائدہ حاصل نہیں کیا گیا جس طرح سے کیا جانا چاہیے ۔ گوادر کی بندرگاہ ابھی تک فعال نہیں کی جا سکی ۔ صرف یہی نہیں یہ سرزمین اپنے اندر بیش بہا خزانے چھپائے ہوئے ہے ۔ تمام صوبوں کی زمین ہی ایک سے ایک بڑھ کر اہمیت کی حامل ہے ۔ اگر بلوچستان کو دیکھا جائے تو یہ وہ علاقہ ہے جو اپنے اندر سونا، قیمتی دھاتیں محفوظ رکھے ہوئے ہے، سرحد اور شمالی علاقہ جات سے دنیا کا بہترین قیمتی پتھر حاصل کیا جاتا ہے، پنجاب پورے ملک کو گندم فراہم کرتا ہے، اور یہ صوبہ زراعت کے میدان میں اپنی مثال نہیں رکھتا، صوبہ سندھ ہے تو اس کی زمین میں کوئلے (دنیا کے تیسرے بڑے) ذخائر دفن ہیں جو کئی سو برس تک توانائی کے متبادل ذرائع کے طور پر استعمال کیے جا سکتے ہیں ۔ شرط یہ ہے کہ ان ذخائر کو استعمال میں لایا جائے ۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ملک پاکستان میں جس کو بھی حکمرانی ملی چاہے وہ فوجی آمر ہو یا جمہوریت، جس کو حکومت ملی اس نے اپنے بنک لاکر روپے پیسے سے بھرے، عوام کا پیسہ اپنے محلوں کی تزین وآرائش میں استعمال کیا، اپنے بچوں کو باہر ممالک میں اعلیٰ سے اعلیٰ سہولیات فراہم کی۔ ملکی خزانے کو جی بھر کے لوٹا۔ ملکی مفاد کے نام پر وہ فیصلے کیے جن کی وجہ سے اقوامِ عالم میں قوم کا سر جھکا۔ ہمارے حکمرانوں نے کبھی بھی اس ملک کی جغرافیائی حیثیت کا استعمال نہیں کیا۔ سفارتی طور پر اگر اس ملک کو صرف چند ایک ممالک کے لیے تجارتی شاہراہ بنا دیا جاتا تو ملکی معیشت اس سے کہیں اچھی حالت میں ہوتی جس میں آج ہے۔ اس کی مثال یوں لیں کہ اگر گوادر کی بندرگاہ کو فعال کر دیا جائے تو اس علاقے کے رہنے والوں کے لیے رزق کے کتنے ذرائع پیدا ہو سکتے ہیں۔ کتنے ہی کاروبار از خود جنم لے سکتے ہیں۔ کسی نے بھی ان قدرتی ذرائع کو احسن طریقے سے استعمال میں نہیں لایا۔ زمین میں صدیوں سے دفن خزانے آج بھی دفن ہیں۔ ان دفن خزانوں کو ملکی سطح پر کبھی تلاش کرنے یا نکالنے کی زحمت ہی نہیں کی گئی۔ بلکہ غیر ملکی کمپنیاں ان خزانوں کی تلاش اور ان سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔ لیکن ہمارے اپنے ملک کی حکومتوں کا اس جانب کوئی خیال نہیں گیا۔

قدرتی طور پر ہر لحاظ سے بہترین حیثیت رکھنے والی یہ زمین ہم سے تقاضا کرتی

ہے کہ ہم اس کی جغرافیائی حیثیت، قدرتی خزانوں، بندرگاہوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ملک پاکستان کو معاشی طور پر مضبوط ترین ممالک کی صف میں لا کھڑا کریں۔

دوسروں کی ٹوہ سے بچیں

ٹوہ لینا، ایک ایسا عمل ہیں جس کے ذریعے انسان اس کوشش میں رہتا ہے کہ وہ دوسرے کی ذات میں چھپی خامیوں کو تلاش کرے، پھر ان خامیوں کی تشہیر کی جائے، اس کی عزت کو نیلام کیا جائے یا ان خامیوں پر اس کا مذاق اڑایا جائے۔اس طرح کسی بھی ایک شخص کی ذات کو مذاق کا نشانہ بنا کر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس طرح ہنسا جا سکتا ہے حالانکہ اس طرح ایک شخص آزار میں مبتلا ہو کر بے سکون ہو جاتا ہے۔مذاق مذاق میں کی گئی باتیں دوسروں کی زندگیوں میں زہر گھول دیتی ہیں۔ اسلام اس طرح کی عیب جوئی، جاسوسی اور گمان سے روکتا ہے۔ قرآنِ پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔بہت گمان سے بچو۔بے شک بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی جاسوسی نہ کرؤاور تم میں سے کوئی ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے (الحجرات:12)

گویا کسی کی جاسوسی کرنے، ٹوہ لینے اور غیبت کرنے سے منع فرما دیا گیا

نبی پاک ﷺ کا اسوۃ حسنہ ہمارے لیے جہاں بہت سی مثالیں اپنے اندر سموئے ہوئے ہے وہاں الفاظ کے بہترین چناؤ اور اپنی زبان سے دوسروں کو محفوظ رکھنے کے لیے واضع مثالیں رکھتا ہے۔

ایک بار نبی پاک ﷺ نے اپنی زبانِ مبارک کو پکڑ کر حضرت معاذؓ کو نصیحت فرمائی۔

زبان کو قابو میں رکھو۔۔

حضرت معاذؓ نے عرض کیا: یا نبی ﷺ ۔ ہم جو کچھ بولتے ہیں تو کیا اس پر ہماری گرفت ہو گی؟

آپ ﷺ نے فرمایا: اے معاذؓ! اللہ تمھارا بھلا کرے۔ جہنم میں لوگ زبان کے غلط استعمال کی وجہ سے ہی اوندھے منہ گریں گے۔۔ سنن ترمذی: 2616

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے۔

ان احادیث سے ثابت ہے کہ معاشرے میں بہت سی برائیاں ایسی ہیں جو زبان کے غلط استعمال کی وجہ سے جنم لیتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اسلام زبان کے بہتر استعمال کا حکم دیتا ہے اور ان برائیوں کو پیدا ہونے سے پہلے ہی روک دینا چاہتا ہے جو زبان کے غلط استعمال سے پیدا ہوں۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ کسی کی جاسوسی کرکے اس کے عیب کو بیان کرنا کسی کو کس حد تک نقصان پہنچا سکتا ہے؟ تو اس کی مثالیں ہمارے معاشرے میں بھری پڑی ہیں۔جب کسی کے عیب بیان کیے جاتے ہیں لوگ اس پر شک کرنے لگتے ہیں۔اس طرح کسی بھی شخص کا کردار کسی دوسرے کے چند بولوں کی وجہ سے داغدار ہو جاتا ہے۔

آج کل ہمارے معاشرے میں یہ رویہ عام ہوتا جا رہا ہے کہ لوگ اپنے کام سے کام رکھنے کی بجائے لوگ زیادہ تر دوسروں کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔چاہے وہ ہمارے دفاتر ہوں ، گھر، گلی محلہ ، میڈیا ہو ، سیاست کا میدان ہو یا ایوانِ پارلیمنٹ ہر جگہ یہ رویہ عام ہوتا جا رہا ہے۔ہمارے معاشرے کا عام طبقہ تو ایک طرف قومی اسمبلی میں بیٹھے ہوئے ارکان بھی ایک دوسرے کی ذاتیات پر بیان بازی کرتے نظر آتے ہیں۔بجائے اس کے لوگ اپنی ذات کو سنوارنے یا اپنے آپ میں موجود خامیوں کو دور کریں لوگوں کی توجہ اس بات پر رہتی ہے کہ کوئی دوسرا کیا کر رہا ہے ؟کیا بول رہا ہے ؟ کس کو کیا کرنا چاہیے ؟ کس کو کیا نہیں کرنا چاہیے ؟اور کس کو اپنے حق میں کس طرح سے استعمال کیا جانا چاہیے۔ دوسروں کی ٹوہ لینا، یہ جاننے کی کوشش کہ دوسرے کیا کر رہے ہیں لوگ اس میں بے تحاشہ دلچسپی لیتے ہیں۔اس کی سب سے نمایاں مثال معاشرتی رابطے کی ویب سائٹ فیس بک ہے جس کے مالک مارک زبر برگ کا کہنا ہے کہ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ معاشرے میں عام لوگوں کا رویہ یہ ہے کہ وہ خود سے زیادہ دوسروں کے حالات میں دلچسپی رکھتے ہیں۔اسی فلسفے کے تحت یہ ویب سائٹ بنائی گئی اور آج یہ ویب سائٹ دنیا کی مشہور ترین ویب سائٹ ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دوسروں کی ٹوہ کیوں لی جاتی ہے ؟؟اس کی دو بنیادی وجوہات ہیں۔ایک تو یہ کہ جو لوگ معاشرے میں اپنی محنت یا اپنی خوش

اخلاقی کے باعث کوئی بہتر مقام حاصل کرلے تو اسے کسی طرح (چاہے اس کی ذاتیات میں دخل دے کر یا اس کی ذاتی خامیوں کو تلاش کرکے انھیں زبانِ زدِ عام کرکے اسے) بدنامی کا شکار کر دیا جائے۔ اس طرح اس کی عزت و توقیر میں از خود کمی آ جائے گی۔ اس نے جو مقام حاصل کیا ہے اس مقام سے اس کو گرا دیا جائے۔ یہ ان لوگو ں کا وطیرہ ہے جو خود اتنی محنت نہیں کر سکتے یا خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنا ان کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنے حسد کی وجہ سے دوسروں کی عزت میں کمی کرنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ اس کے لیے چاہیے انھیں تہمت لگانا پڑے یا پھر دوسرے شخص کی کوئی کمزوری پکڑ کر اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح کا رویہ زیادہ تر سیاست اور میڈیا میں دیکھنے میں آتا ہے جہاں لوگوں کے کام کی بجائے سیاسی کارکنان اور دوسرے لوگوں کی ذاتیات پر تنقید کرکے انھیں عوام کی نظروں میں گرا دیا جاتا ہے۔ یہ شہرت حاصل کرنے کا ایک بدترین ذریعہ بھی ہے۔

ٹوہ لینے کی دوسری بڑی وجہ لوگوں کے اپنے اندر کوئی کمی، کوتاہی ہوتی ہے یا وہ کسی احساسِ جرم میں مبتلا ہے جس کی بنیاد پر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہی کوتاہی دوسرا شخص بھی کر رہا ہوگا۔ وہ اپنا غلط رویہ، اپنا احساسِ جرم دوسروں کی ذات میں ڈھونڈنے لگتے ہیں۔

دوسروں کی ذات پر زیادہ سے زیادہ بات کی جاتی ہے۔ حالانکہ اگر اپنے کام سے کام رکھا جائے اور دوسروں کا احترام

کیا جائے تو معاشرے میں بہت سی برائیاں جنم ہی نہ لیں۔ کیونکہ باہر حال ایک انسان کی ترقی دوسرے انسان کی تنزلی سے مشروط نہیں ہے بلکہ کسی کو نقصان پہنچائے بغیر بھی ترقی کے زینے طے کیے جا سکتے ہیں۔

یہاں میں ایک واقعہ کا ذکر کرتی چلوں۔ ایک سکول میں استاد نے تختہ ء سیاہ پر ایک متوازی لکیر کھینچی اور پوچھا کہ اس لکیر کو دوسری لکیر سے کس طرح سے چھوٹا کیا جا سکتا ہے ؟

طالبہ میں سے کئی ایک نے کہا کہ اس لکیر کو ایک جانب سے مٹا دیا جائے تو یہ لکیر چھوٹی کی جا سکتی ہے۔ کسی نے کہا کہ اس لیکر کو درمیان سے مٹا دیا جائے تو یہ دو میں تقسیم ہو کر خود بخود چھوٹی ہو جائے گی۔

استاد نے طلبہ سے کہا: لکیر کو کہیں سے بھی مٹائے بغیر کس طرح سے چھوٹا کیا جا سکتا ہے ؟۔

تمام طلبہ میں سے ایک ہونہار طالب علم اپنی کرسی سے کھڑا ہوا اور استاد سے چاک دینے کی درخواست کی۔ استاد نے چاک اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور خود تختہ سیاہ سے ایک جانب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ وہ طالب علم چاک ہاتھ میں لیے تختہ سیاہ تک پہنچا۔اس نے پہلے سے کھینچی گئی لکیر کے بالکل متوازی اس لکیر

سے کہیں بڑے سائز کی لکیر کھینچ دی۔ اور کہنے لگا: سر اگر پہلے سے کھنچی گئی لکیر سے بڑی لکیر کھینچ دی جائے تو پہلی لکیر از خود چھوٹی ہو جائے۔ اس واقع نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ اپنی حیثیت بنانے یا اپنی عزت میں اضافہ کی خاطر ضروری نہیں کہ دوسروں کی عزت میں کمی کرنے کی کوشش کی جائے بلکہ ان سے زیادہ محنت کرکے یا دوسرے شخص سے زیادہ اخلاقیات کا مظاہرہ کرکے از خود عزت اور توقیر میں اضافہ ممکن ہے۔ الغرض معاشرے میں موجود اگر شخص دوسروں پر تنقید اور تحقیق کی بجائے خود اپنے آپ کو سنوارنے لگے تو تمام معاشرہ سنور جائے۔

خودکشی یا معاشرتی قتل

ہمارے ملک میں آئے روز نت نئی خبریں سننے کو ملتی ہیں جو کہ معاشرے کے عمومی رویے میں تبدیلی، معاشرتی اقدار میں تنزلی، ٹوٹتے بکھرتے خاندانی نظام کی غماز ہیں ۔چند دن پہلے میری نظر سے اسی طرح کی ایک چونکا دینے والی خبر گزری۔یہ خبر نہ صرف پریشان کن تھی بلکہ انتہائی افسوس ناک بھی تھی۔ معاشرتی رابطے کی ویب سائٹ اور تقریبا تمام میڈیا نے اس خبر کو ایک واضح جگہ دی گئی۔یہ خبر کراچی کے دو بچوں کے متعلق تھی جنھوں نے محبت کی خاطر خودکشی کی۔۔کراچی، سولجر بازار پٹیل باڑہ کے سرکاری سکول کے یہ طالب علم جن کے نام بالترتیب نوروزاور صباء تھے۔یہ بچے جن کی عمریں پندرہ اور سولہ برس تھیاور دونوں ہی میٹرک کے طالب علم تھے ۔انھوں نے منگل مؤرخہ یکم ستمبر کو اپنے ہی سکول میں خودکشی کرلی، نوروز نے فاطمہ بشیر عرف صباء کو گولی مار کراسی پستول سے اپنی جان بھی لے لی۔خودکشی سے قبل دونوں نے اپنے اپنے والدین کے لیے خطوط بھی چھوڑے جن میں لکھا گیا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے اور والدین کے بغیر بھی نہیں رہنا چاہتے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے والدین ان کی شادی کے لیے راضی نہیں ہوں گے اس لیے وہ اپنی مرضی سے خودکشی کر رہے ہیں اور کسی کو اس اقدام کا الزام نہ دیا جائے۔جمشید ٹاؤن کے

سپریٹنڈنٹ پولیس کے مطابق پولیس کو لڑکے کے سکول بیگ سے مزید کچھ خطوط ملے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے ہیں اور انھوں نے خودکشی اچانک نہیں کی بلکہ کئی روز کی باقاعدہ پلاننگ کے بعد یہ قدم اٹھایا۔

اتنی کم عمری میں اس حد تک بڑا قدم اٹھالینا اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں بچے اب عمر سے پہلے بڑے ہونے لگے ہیں۔ ہماری اگلی نسل میں نفسیاتی مسائل بڑھنے لگے ہیں۔ان نفسیاتی مسائل میں اضافے کی پہلی بنیادی وجہ ہمارا میڈیا ہے۔ تقریباً ہر پروگرام، ہر ڈرامہ یہاں تک کہ کارٹون تک محبت، بالخصوص مرد اور عورت کی محبت کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں خصوصاً فلمیں۔ کیبل پر ہر قسم کا پروگرام چاہے وہ کسی بھی ملک کا ہو، ہماری اقدار سے متصادم ہو، اس میں کسی بھی قسم کے لباس کی تشہیر ہو یا کسی بھی خیال کی، وہ آن آئیر کر دیا جاتا ہے۔ بعض پروگرام حقیقت سے کہیں دور ہوتے ہیں۔ کیبل کی موجودگی نے ہر ایک کو کوئی بھی مواد دیکھنے میں کھلی آزادی دے دی ہے۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ والدین کی عدم موجودگی میں بچے ایسے پروگرام دیکھتے ہیں اور ان پروگراموں میں دیکھائے جانے والے کردار ان کے معصوم ذہنوں میں ثبت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بچے محبت کو اپنی زندگی کے اور کئی مقاصد سے زیادہ اہمیت دینے لگتے ہیں۔ وہ ان مصنوعی کرداروں کو اپنی

اصل زندگی میں بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ جب یہ مصنوعی کردار انھیں تلخ زندگی میں نہیں ملتے تو وہ مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اس مایوسی میں وہ بعض اوقات ایسے فیصلے اور عمل کر گزرتے ہیں جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ اکثر و بیشتر ایسے فیصلے والدین کے لیے پوری عمر کا پچھتاوہ بن جاتے ہیں۔

اس رویے کو اپنائے جانے کی دوسری بڑی وجہ والدین کی جانب سے بچوں کی تربیت کی جانب سے لاپرواہی اہم ہیں۔ والدین چاہے وہ والد ہو یا والدہ دونوں کی تربیت بچوں کے لیے لازمی حیثیت کی حامل ہے۔ والدہ بچوں کی چاہے کتنی ہی اچھی تربیت کیوں نہ کر لے والد اس فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ بچوں کو زیادہ وقت اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ بچوں کو اس حد تک اعتماد دیں کہ وہ اپنا ہر مسئلہ، اپنی ہر سوچ والدین سے شیئر کر سکیں۔ اپنے ہر مسئلے میں والدین کی رائے لے سکیں اور والدین کی رائے کو اہمیت بھی دیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب والدین کے پاس بچوں کے لیے وقت ہو اور وہ بچوں کی سطح پر جا کر بات کریں۔ والدین کو اپنے بچوں کے احساسات اور جذبات کا احترام کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ بہرحال اگر وہ غلط فیصلہ کرنا بھی چاہ رہے ہوں تو والدین کو انھیں پیار سے سمجھانا چاہیے۔ اگر وہ نہ سمجھیں تو انھیں یہ غلط فیصلہ کرنے دیں اور بعد میں اس فیصلے کو درست کر لیں۔ کیونکہ والدین اپنی دانست میں

اپنے بچوں کی بھلائی چاہتے ہیں لیکن اس کوشش میں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنے بچوں کے جذبات کو ٹھیس بھی پہنچا سکتے ہیں۔ان کی سختی یا بچوں کا خیال نہ رکھنا بچوں میں جذباتی توڑ پھوڑ کا سبب بنتا ہے اس طرح بچے یا تو نفسیاتی طور پر کمزور ہو جاتے ہیں یا پھر انتہائی اقدام اٹھانے پر مجبور۔ والدین کو بچوں کی محبت کے ساتھ ساتھ ان کی خوشی، ان کے جذبات کا احترام بھی کرنا چاہیے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب والدین اپنے بچوں پر اعتبار کریں اور انھیں جس حد تک ممکن ہو وقت دیں ۔عموما دیکھا گیا ہے کہ بچوں پر والدین شک کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بچے چور راستے ڈھونڈتے ہیں اور بہت سے کام چوری چھپے کرنے لگے ہیں۔والدین کو علم ہی نہیں ہوپاتا کہ ان کے بچے کس ڈگر پر چل نکلے ہیں اور کس حد تک آگے جا چکے ہیں۔ میڈیا پر دیکھائے جانے والے پروگراموں نے بچوں کے ذہنوں میں یہ بات بھی ڈال دی ہے کہ والدین کا زمانہ بیت چکا ہے اور اب وہ نئے زمانے کی سوج بوجھ نہیں رکھتے اس سوچ کو بھی غلط ثابت کرنا ضروری ہے اور وہ اس طرح ممکن ہے کہ والدین بچوں کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہیں اپنے علم میں اضافہ کریں تاکہ وہ خود کو زمانے کے مطابق ثابت کریں۔

اس رویے کی تیسری بڑی وجہ سوشل میڈیا کا بے جا استعمال ہے۔ سوشل میڈیا نے جہاں ہمارے رشتوں میں دوریاں پیدا کی ہیں وہاں والدین اس حد تک مصروف ہو

چکے ہیں کہ ان کے پاس بچوں کے لیے وقت ہی نہیں ہے۔ ہر ایک شخص اپنے سے کہیں دور شخص کے لیے تو پریشان ہے مگر وہ اپنے ہی گھر میں بسنے والے افراد کی حالت سے نا واقف ہے۔ یہ وجہ بھی والدین اور اولاد کی دوری کا سبب ہے۔

اس کے علاوہ بچوں میں پنپنے والے باغیانہ خیالات کی ایک بہت بڑی وجہ والدین کا حد سے زیادہ لاڈ پیار یا حد سے زیادہ سختی بھی ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں بچے بگڑتے ہیں۔ حد سے زیادہ لاڈ پیار بچوں کو بد تمیزی کی حد تک ضدی بنا دیتا ہے اور وہ اس بے جا لاڈ پیار کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی ہر بات چاہے وہ درست ہو یا نہیں منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ان کی بات نہ مانی جائے تو وہ ہر طرح کا حربہ استعمال کرتے ہیں۔ اس کے برعکس بچوں پر بے جا سختی انھیں والدین سے بد ظن کرتی ہے، یہ سختی والدین اور بچوں کے درمیان ایک حد فاصل قائم کر دیتی ہے اور بچے والدین سے اپنے مسائل اور اپنی خواہشیں چھپانے لگتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنے فیصلے خود کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ چاہے وہ غلط ہوں یا درست۔

بچے ہمارا مستقبل ہیں۔ ملک و قوم کی بقاء کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کی ذہنی نشو و نما پر توجہ دی جائے۔ بچوں کی بہترین نشو و نماء کے لیے اہمیت اس امر

کی ہے کہ والدین اعتدال کا راستہ اپنائیں۔نہ تو زیادہ سختی کریں اور نہ ہی بے جا نرمی برتیں۔ بچوں پر سختی بھی کریں لیکن ایک حد تک کہ وہ آپ سے بدظن نہ ہوں، ان کے دل میں آپ کی بات ماننے کا جذبہ ضرور ہو لیکن آپ کا خوف نہ ہو اور اگر لاڈ پیار بھی کریں تو ایک حد میں رہ کر کہ بچے بگڑیں نہیں۔ اپنے بچوں سے دوستی کریں تاکہ وہ اپنے مسائل، اپنے خیالات وقتاً فوقتاً والدین کو بتاتے رہیں۔ والدین کو بھی چاہیے کہ اولاد کے معاملات میں دلچسپی لیں۔ان سے ان کے مشاغل اور تعلیم کے بارے میں آگاہی حاصل کرتے رہیں تاکہ انھیں محسوس ہو کہ وہ کسی موڑ پر بھی اکیلے نہیں ہیں۔ ان کے والدین ان کے ساتھ ہیں۔

اہلِ علم کے حق پر ڈاکہ

پچھلے دنوں ملک کی سپر ماڈل ایان علی جنھوں نے کہ ایک سمگلر کی حیثیت سے بھی شہرت پائی نے کراچی یونیورسٹی میں فنانس پر لیکچر دیا ایان علی کو اس لیکچر کے لیے کراچی یونیورسٹی کے پبلک ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ نے مدعو کیا۔ اس لیکچر کو سننے والوں نے بعد میں ایان علی کے ساتھ تصاویر بنوائی۔ بات یہاں تک محدود نہیں ایان علی کو یونیورسٹی کی جانب سے ایک اعزازی souvenir بھی دیا گیا۔ یونیورسٹی انتظامیہ کے مطابق ایان علی کو دو طالب علموں نے نجی طور پر مدعو کیا تھا لیکن انتظامیہ کی اجازت کے بغیر اس نے لیکچر کیونکر دیا یہ سوال باہر حال توجہ طلب ہے۔ انتظامیہ کا اس طرح کا بیان بعید القیاس ہے۔ واضح رہے کہ ایان علی کو سیکورٹی فورسز نے کراچی ایر پورٹ پر مارچ 14,2015 کو پانچ لاکھ ڈالر سمگل کرنے کی کوشش میں قید کیا تھا۔ ان پر باقاعدہ مقدمہ چلایا گیا اور چند ماہ کی قید کے بعد جولائی 14,2015 کو ہائی کورٹ نے ضمانت پر رہا کیا گیا۔ اس تمام عرصہ کے دوران وہ متنازعہ خبروں کی زینت بنی رہیں۔ یہاں تک کہ ان کے تعلقات سابق صدر آصف علی زرداری کے ساتھ بھی ثابت کیے گئے۔ اسی یونیورسٹی کے طلباء و طالبات جن کا تعلق اسلامی جمیتِ طلبہ نے ماڈل ایان علی کے کراچی یونیورسٹی میں بطور مہمان بلائے جانے پر احتجاجا ایک گدھے کو

پھولوں کے ہار پہنا کر یونیورسٹی لے آئے اور اس پر لکھا تھا کہ اگر ایان علی آ سکتی ہے تو میرا بھی حق ہے کہ مجھے بھی بطور مہمان بلایا جائے۔ یونیورسٹی کے طلباء و طالبات نے اس گدھے کے ساتھ سیلفیز بھی بنوائی کیونکہ ماڈل آیان علی کے ساتھ بھی طلباء نے سیلفیز بنوائی تھی۔ان باغیرت طلباء و طالبات نے انتظامیہ کو متنبہ کیا تھا کہ اگر آیان علی کو بلائے جانے کا نوٹس نہ لیا گیا تو بھرپور احتجاج کیا جائے گا۔ یہاں یہ بات توجہ طلب ہے کہ اگر یونیورسٹی کو لیکچر ہی دلوانا تھا تو پاکستان میں ان گنت باکردار اور قابلِ تقلید اہلِ علم موجود ہیں۔ جن میں سرِفہرست ڈاکٹر عطاء الرحمٰن (کئی کتابوں کے مصنف اور سائنس میں ایک اتھارٹی)، نائلہ عالم، یاسمین درانی (جنھیں وائٹ ہاؤس کی جانب سے ہوپ ایوارڈ دیا گیا)، پروفیسر عاصم خواجہ (جنھیں ہارورڈ یونیورسٹی نے اعزازِ لیکچر کے لیے مدعو کیا) نوید آئی سید (جنھوں نے انسانی دماغ کے خلیوں کو سیلکون چپ کے ساتھ جوڑا)، علی معین نوازش (جنھیں کئی ایوارڈ دیے گئے)، ان سب کے علاوہ بھی کئی ایسے لوگ موجود ہیں جو استاد کے مقام پر کھڑا ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ان بے انتہا اچھے اور اعلیٰ پائے کے اساتذہ کو چھوڑ کر ایک ایسی عورت جس کو کرپشن کے الزام میں قید کیا گیا ہو جس پر مختلف قسم کے الزامات لگائے گئے ہوں دوسرے لفظوں میں ایک بدکردار خاتون کو استاد کے مقام پر لا کھڑا کیا گیا، اس سے ایک یونیورسٹی میں لیکچر دلوایا گیا۔ اس عمل سے اس عورت کا مقام، اس کا

کردار بلند نہیں ہوا بلکہ استاد کے مقام اور اس کے کردار کی بے حرمتی کی گئی۔ ان سب فناس اینالسٹس، ان تمام اساتذہ کی نہ صرف بے حرمتی اور بے عزتی کی گئی جو اس شعبے میں عالمی شہرت یافتہ ہیں بلکہ ان سب کی موجودگی میں آیان علی جیسی بدنامِ زمانہ ماڈل کو لیکچر کے لیے بلانا علم کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ بلکہ یہ عمل اس بات کی نشان دہی بھی کرتا ہے کہ اس ملک میں کسی کو بھی اس کی اہمیت یا حیثیت جانچے بنا کسی بھی مقام پر کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ اس اقدام پر کراچی یونیورسٹی پر اساتذہ کی ہتکِ عزت کا دعویٰ کرنا چاہیے اور یونیورسٹی کو ان تمام اساتذہ سے معافی مانگی چاہیے جو کہ ہمارے ملک کا سرمایہ ہیں۔ اور جنھیں یونیورسٹی کے اس اقدام کی وجہ سے یقیناً بہت افسوس ہوا ہوگا۔ یونیورسٹیز، اعلیٰ تعلیمی اداروں، حکومت کو اساتذہ کی اس قسم کی بے توقیری اول تو کرنا نہیں چاہیے دوئم اگر کوئی ادارہ اس کا مرتکب ہو جائے تو اس کے خلاف سخت کاروائی کی جانی چاہیے تاکہ معاشرے میں استاد کی عزت باقی رہے۔ کیونکہ اگر اسی طرح اہلِ علم کی بے حرمتی ہوتی رہی تو ان قریب ہم پر وہ وقت آئے گا جب اہلِ علم، ہمارے وہ اساتذہ جو مختلف شعبوں میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں وہ بددل ہو کر اس ملک سے چلے جائیں گے۔ دوسری قومیں ان کے علم سے تو فائدہ اٹھائیں گی لیکن ہماری قوم جہالت کے اندھیروں میں ڈوبی رہے گی۔ ہماری نسلیں ایسی جہالت میں ڈوبی رہیں گی جہاں ڈگریاں تو ضرور ہوں گی لیکن علم، کردار اور عمل نہیں

ہوگا۔ جہاں ڈگریوں کی بیناد پر نوکریاں تو ضرور حاصل کی جاسکیں گی لیکن علم کی بنیاد پر معاشرے میں بھلائی نہیں پھیلائی جاسکے گی۔

اس قوم کی حالت کا اندازہ لگایئے جہاں ایک مجرم، ایک ماڈل علم پر لیکچر دے گی۔ یہ ہماری قوم، ہماری موجودہ نسل کی ذہنی پس ماندگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ ایان علی کو یونیورسٹی انتظامیہ کی اجازت کے بغیر مدعو کیا گیا تو بھی یونورسٹی انتظامیہ کو انھیں لیکچر دینے سے روک دینا چاہیے تھا اور مدعو کرنے والوں کے خلاف سخت کاروائی کرنی چاہیے تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا یونیورسٹی انتظامیہ نے اسے لیکچر مکمل کرنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ طلباء و طالبات نے اس کے ساتھ سیلفیز بنوائی۔ آیان علی نے یونیورسٹی میں بلا کسی روک ٹوک کے وقت گزارا۔ یہ یونیورسٹی انتظامیہ کی لاپرواہی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ واضح رہے کہ یونیورسٹیاں، تعلیمی ادارے صرف عمارتیں نہیں بلکہ یہ ایسی جگہیں ہیں جہاں ہماری اگلی نسل کی ذہنی نشوونما اور ان کے اخلاق و اطوار کی تعمیر ہوتی ہے۔ ان اداروں میں لیکچر دینا اور استاد کی جگہ پر (چاہے وہ کوئی بھی ڈیپارٹمنٹ ہو) ان لوگوں کو کھڑا ہونا چاہیے جو اخلاقی اعتبار سے قابلِ تقلید ہوں جن پر کسی قسم کی بدنامی کا کوئی داغ نہ ہو۔ ایک ایسی عورت جو خود کرپشن، منی لانڈرنگ میں ملوث رہی ہو وہ طالب علموں کو کیا سکھائے گی اور ایسے طالب علم جو اس لیکچر میں

موجود تھے وہ اس سے کیا سیکھ رہے ہوں گے ؟وہ ایان علی سے علم حاصل تو کرنے سے رہے۔

علم کا شعبہ نہایت ہی نازک شعبہ ہے اور استاد کا مقام ایک عظمت کا حامل ہے۔یہ شعبہ اس قسم کے مذاق اور بے حرمتی کا حامل نہیں ہو سکتا۔استاد کا مقام ایک ایسا مقام ہے جس پر نہ صرف ہر ایک فائز نہیں ہو سکتا بلکہ اس مقام پر کھڑا ہونے والے کا اپنا ایک تقدس ہے۔ تعلیم دینا پیغمبروں کا شیوہ ہے اس شعبے کو اختیار کرنے والے چاہے وہ اعزازی ہوں یا پھر مستقل وہ چنیدہ لوگ ہونے چاہیے جن کا نہ صرف کردار پاک و صاف بلکہ وہ اس مقام کے اہل بھی ہوں۔نہ کہ ایسے لوگ جو خود جرائم میں ملوث ہوں۔جیل کی ہوا کھا چکے ہوں، اور ان کی کرپشن کے قصے زبانِ زدِ عام ہوں۔

جہاں رحمٰن ملک اور آصف زرداری کو اعزازی ڈگریاں دی جائیں گی وہاں اہلِ علم کی قدر کیا ہو گی ؟۔وہاں علم حاصل کرنے کے لیے کون کوشش کرئے گا ؟وہاں استاد کی عزت ہوسکے گی ؟کیا یہ لیکچر اس ملک میں موجود اہلِ علم کے لیے ایک تازیانہ نہیں ؟کیا اس ملک میں وہ لوگ جو علم کے میدان میں پوری دنیا میں ملک کی نمائندگی کے ساتھ ساتھ ملک کے باعثِ فخر ہیں وہ اور یہ ایک کرپشن میں ملوث ماڈل.برابر ہو سکتے ہیں ؟نہیں۔لیکن اس طرح کے لیکچر یہ

ثابت کرنے کی کوشش ضرور ہے کہ اہلِ علم کی ہمارے معاشرے میں کوئی قدر نہیں
۔جو چاہے استاد کے مقام پر جا کھڑا ہو۔ ہمارے معاشرے کی تنزلی کی بنیادی وجہ ہی یہی
ہے کہ ہم اہلِ علم کو وہ مقام نہیں دے پائے جو ان کا حق ہے۔ ہمارے ملک میں چاہے
وہ اعزازی ڈگری ہو یا اعزازی لیکچر، اچھے برے، قابل نا قابل ۔ کردار بد کردار کا فرق
نہیں رکھا جاتا۔

یہ امر مسلم ہے کہ ہم اس وقت تک ایک فلاحی معاشرے کی تعمیر نہیں کر سکتے جب تک
کہ ہمارے اساتذہ با کردار لوگ نہ ہوں، جب تک کہ ہم یہ تقسیم نہ کر لیں کہ جو بھی
کسی تعلیمی ادارے میں لیکچر کی غرض سے جائے گا وہ اس کا اہل ہوگا اس کا کردار اس
ادارے میں تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے قابلِ فخر نہ ہوگا۔جب تک ہم استاد کی
وہ عزت نہیں کریں گے جس کا وہ حق دار ہے تب تک ہمارے معاشرے میں کسی قسم کی
کوئی بہتری نہیں آئے گی۔

فلسفہء حجِ بیت اللہ اور عید الضحیٰ

حجِ بیت اللہ اور عید الضحیٰ حضرت ابراہیمؑ، ان کی زوجہ محترمہ حضرتِ ہاجرہؓ اور ان کے بیٹے حضرتِ اسماعیلؑ کی عظیم سنت مبارکہ کی تائید و تجدید ہے۔ حضرت ابراہیمؑ جلیل القدر پیغمبر اور خلیل اللہ لقب رکھنے والے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے اللہ کے حکم کی پاسداری کی عظیم مثال قائم کی۔ درحقیقت حضرت ابراہیم دینِ اسلام کے داعی ہی جس کی تکمیل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ فرماتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی تمام زندگی اللہ کی واحدیت کا پرچار کرتے ہوئے گزری اور اسی ثابت قدمی کی بنا پر حضرت ابراہیمؑ کو خلیل اللہ کا لقب عطاء ہوا۔ حضرت ابراہیم کا ہر عمل حقیق اسلام کا اعلیٰ نمونہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ نے ان کی زندگی کے تمام اعمال ابد لآباد تک صفحہ گیتی میں محفوظ کر دیئے اور ان کی داستان کو بقائے دوام حاصل ہوئی۔

حضرت ابراہیم نے پیدائش کے بعد سے ہی اپنے خاندان کو بت تراشتے ہوئے دیکھا۔ بت تراشی میں مشہور اس خاندان کے یہ سپوت جب ہوش سنبھالتے ہیں تو تلاشِ حق میں سرگرداں ہو جاتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ وہ پہلے بت شکن ہیں جو اپنے ہی خاندان کے بنائے ہوئے بتوں کو توڑتے ہیں اور اپنے خاندان سے فرماتے ہیں کہ

جن بت کی تم پوجا کرتے ہو مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں گویا اوائلِ عمر سے ہی حضرت ابراہیمؑ حق پرست تھے۔ جب اللہ انھیں حضرت اسماعیلؑ سے نوازتا ہے اور حکم خداوندی کے تحت یہ خلیل اس شیر خوار اور اس کی والدہ کو مکہ کی بے آب وگیاہ وادی میں چھوڑ جاتے ہیں۔ جب شیر خوار پیاس سے بے تاب ہوتے ہیں تو ماں کی انسان یا پانی کی تلاش میں پہلے صفاء کی پہاڑی پر پہنچتی ہیں جب شیر خوار کا خیال آتا ہے تو دوڑتی ہوئی واپس آتی ہیں جب پانی کا خیال آتا ہے تو مروہ کی پہاڑی پر چڑتی ہیں۔ اس طرح یہ بہادر اور عظیم ماں سات چکر لگاتی ہیں، یہاں تک کہ اللہ ایک فرشتے کو حکم فرماتا ہے کہ جس جگہ یہ شیر خوار ایڑیاں رگڑ رہا ہے اس جگہ پانی کا ایک چشمہ ظاہر کیا جائے۔ بعض کتب کے مطابق فرشتہ اپنے پر سے زمین کھودتا ہے اور آب زم زم کا چشمہ ظاہر ہو جاتا ہے جو حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ اور آج تک ہر اس شخص کو سیراب کرتا آرہا ہے جو اس شہر میں آئے۔ اللہ کو اس سرزمین میں ایک ایسا شہر آباد کرنا مقصود تھا جو حق پرستوں، اسلام کے پیروکاروں کا مرکز اور امتِ مسلمہ کو جوڑنے والا ہو۔ پانی کی موجودگی قافلوں کو اس جانب متوجہ کرتی ہے، ایک قبیلہ یہاں آکر آباد ہوتا ہے۔ اسکے بعد سے آج تک یہ شہر امن کا شہر کہلا رہا ہے۔ اس عظیم ماں کی سنت کی پیروی میں آج جو مسلمان حج کا قصد کرتا ہے وہ ان دو پہاڑوں کے بیچ اسی طرح سات چکر لگاتا ہے۔ جسے ارکانِ حج میں سعی کا نام دیا گیا ہے۔ ایک ہی سمت میں دوڑنے والوں کی زبانوں سے الھم لبیک کی

صدائیں بلند ہوتی ہیں، کہ اے اللہ ہم تیرے حضور حاضر ہیں۔ تیرے حکم کے پابند، لباسِ دنیا ترک کیے ہوئے، یکسو، اتحاد کے پیکر چاہے ان کا تعلق کسی بھی قومیت کسی بھی ملک سے ہو، تیری ہر مرضی کو پورا کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ اور مستعد۔ یہ وہ سبق ہے جو یہ سنت تمام امت کو دیتی ہے کہ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ اہمیت اللہ کے حکم کی پاسداری اور بنا کسی حیل و حجت کے اس کے احکام کی بجا آوری ہی دین اور دنیا میں انسان کی کامیابی کی ضامن ہے۔ جو محبتِ خداوندی کی جانب پہلا قدم ہے۔

جب حضرت اسماعیلؑ نوجوانی کی حد کو پہنچتے ہیں تو اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے کہ اپنے عزیز از جان بیٹے کی قربانی فرمایئے۔ یہ وہ اولاد ہے جسے باپ نے حکم خداوندی کی بجا آوری میں اس بے آب وگیاہ وادی میں چھوڑا تھا۔جب جوانی کو پہنچی تو قربانی کا حکم آ گیا ۔حضرت ابراہیمؑ اللہ کا یہ حکم بھی بجا لاتے ہیں اور اس حکم کی بجا آوری میں آپؑ کے اہلِ خانہ آپؑ کا مکمل ساتھ دیتے ہیں۔ حضرت خلیلؑ اپنی زوجہ سے ذکر فرماتے ہیں وہ بنا کسی حیل وحجت کے نہ صرف اجازت دیتی ہیں بلکہ فرماتی ہیں کہ اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لیجئیے گا مبادہ بیٹے کی محبت اللہ کے حکم پر غالب آ جائے۔جب بیٹے کے علم میں یہ آتا ہے کہ ان کے باپ انھیں قربانی کی غرض سے لیئے جاتے ہیں تو یہ عظیم بیٹے فرماتے ہیں کہ اے والد محترم اللہ کا حکم ماننے میں کوئی تردد نہ فرمائے۔ بعض جگہ

منقول ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ حضرت اسماعیلؑ کو ذبح عظیم کے لیے لے جاتے ہیں اور شیطان اپنے ہر حربے سے ناکام ہو کر ان کے پیچھے چلنے لگتا ہے تو حضرت ابراہیمؑ اس کو روکنے کے لیے کنکریاں مارتے ہیں۔ تاکہ وہ انھیں اللہ کے حکم کی بجاآوری سے نہ روک پائے۔ (آج حج کے مناسک میں شیطان کو کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ وہ اسی سنت کی تجدید ہیں کہ شیطان مسلمانوں کو اللہ کے حکم کی بجاآوری سے نہ روک پائے) ۔ حضرت ابراہیمؑ وفا کے پیکر، اپنے بیٹے کو لیٹا کر قربانی کا قصد کرتے ہیں۔ اللہ کی قدرت چھری چلتی ہے مگر گردن نہیں کٹتی۔ خلیل اللہ کوشش کرتے ہیں، ان کے صاحب زادے حکم خدا کی تکمیل کے منتظر ہیں۔قربانی کرنے والے بھی پیغمبر خدا اور قربان ہونے والے بھی پیغمبرِ خدا، سبحان اللہ۔اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کی یہ قربانی قبول فرماتا ہے اور حضرت اسماعیلؑ کی جگہ جنت سے ایک مینڈھا بھیجا جاتا ہے۔ جس کو بالآخر حضرت ابراہیمؑ ذبح فرماتے ہیں۔یہ تھی وہ عظیم قربانی جس کی تائید آج پوری امتِ مسلمہ کرتی ہے۔ یہ عظیم مثال ہے صبر وضبط ایثار واستقلال، اور اللہ کے حکم کی پاسداری کی۔ مسلمانوں کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ حضرت اسماعیلؑ کی اس قربانی کی سنت کو ہر سال پورا کرنے کا موقع پاتے ہیں۔قربانی کو ہر صاحبِ نصاب پر واجب قرار دیا گیا۔ اس طرح اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کو تادم قیامت زندہ جاوید کردیا۔اور تمام امتِ مسلمہ کے لیے اس قربانی کو شکر گزاری، اور خوشی کا موقع قرار دے دیا گیا۔

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی زندگی جیسے جیسے آگے بڑھتی جاتی ہے اللہ نے ان دونوں باپ بیٹے اور پیغمبروں سے اہم ترین کام کرواتا ہے۔ جب حضرت ابراہیمؑ بڑھاپے کی عمر اور حضرت اسماعیلؑ نوجوانی کی عمر پوری کر چکتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ جو اب تک اپنے بیٹے سے دور تھے ان کے گھر تشریف لاتے ہیں۔ حضرت اسماعیلؑ تلاشِ معاش کے سلسلے میں اس وقت گھر موجود نہیں، ان کی زوجہ دروازہ کھولتی ہیں۔
حضرت ابراہیمؑ ان سے احوال پوچھتے ہیں۔ وہ اپنے احوال کا شکوہ کرتی ہیں، اپنی مشکلات پر نوحہ کناں نظر آتی ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ اس ناشکری کو ناپسند فرماتے ہیں اور یہ عظیم باپ اپنے بیٹے کے لیے پیغام چھوڑتے ہیں کہ اپنے گھر کی چوکھٹ کو تبدل کر لیں۔ حضرت اسماعیلؑ گھر تشریف لاتے ہیں۔ ان کی زوجہ انھیں تمام واقعہ سناتی ہیں اور پیغام ان تک پہنچاتی ہیں۔ حضرت اسماعیلؑ، اپنے والد محترم کا پیغام سمجھ کر اپنی زوجہ کو طلاق دیتے ہیں اور ایک اور خاتون سے نکاح فرماتے ہیں۔ ایک مخصوص عرصے کے بعد ان کے والد محترم پھر تشریف لاتے ہیں۔ حضرت اسماعیلؑ کی زوجہ سے ان کے گھر کے احوال معلوم فرماتے ہیں۔ وہ اللہ کی حمد و ثناء فرماتی ہیں اور شکر کا کلمہ پڑھتی ہیں۔ بلا شبہ ایک نیک عورت، خصوصا نبی کی زوجہ شکر گزار ہی ہوتی ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے کے لیے پیغام دیتے ہیں کہ اس چوکھٹ کو کبھی نہ بدلیں۔ حضرت اسماعیلؑ واپس گھر تشریف لاتے ہیں تو ان

کی زوجہ ان کو تمام واقعہ سناتی ہیں۔ حضرت اسماعیلؑ اپنے والد کی نصیحت پر عمل فرماتے ہیں۔ اس طرح اللہ اس گھرانے کے ہر فرد کو شکر گزار بناتا ہے۔ اب حضرت ابراہیمؑ کو حکم ہوتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ مل کر اللہ کے ایک ایسے گھر کی تعمیر فرمائیں جو تمام عالم کے لیے مرکز کی حیثیت رکھے۔ تمام عالم میں اللہ کے ماننے والے اس کا طواف کریں اور اس عظیم گھرانے کی زندگیوں سے حاصل ہونے والے تمام اسباق کو عملاً اپنائیں۔ اس طرح حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ اللہ کے گھر کی تعمیر فرماتے ہیں۔ حضرت اسماعیلؑ پتھر اٹھا کر لاتے ہیں جبکہ ان کے والد حضرت ابراہیمؑ ان پتھروں کو نصب کرتے جاتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ اس کام کے دوران اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ میری اولاد میں ایک نبی مبعوث فرما جو لوگوں کو برائی سے روکے اور اچھائی جانب راغب کرے۔

حج کے اعمال و مناسک تمام کے تمام عشق و محبتِ خداوندی کے اعمال ہیں۔ یہ تمام اعمال سنت ابراہیمی کا ورثہ اور مسلمانوں کے لیے اللہ کی خصوصی رحمت ہے۔ یہ وہ ورثہ ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے راہ خدا میں اپنی محبت و وفا، بندگی و اخلاص، تسلیم و رضا اور قربانی سے قائم کیا۔ یہ سنت ابراہیمی مسلمانوں کے لیے اتحاد کا مظہر ہے۔ تمام دنیا میں بسنے والے مسلمان اس سنت کی ادائیگی کے لیے ہر سال مکہ مکرمہ آتے ہیں۔ نسل اور قومیت سے بالاتر ہو کر ایک سا

لباس، ایک عربی زبان اختیار کرتے ہیں، چاہے مشرق سے آئے ہوئے مسلمان ہوں یا مغرب کے۔ اللہ کے ماننے والوں کو یہ سنت ایک لڑی میں پرو دیتی ہے۔ اور دنیا دیکھتی ہے کہ اللہ کو ماننے والے جس بھی نسل سے ہوں جو بھی زبان بولتے ہوں، صبر واستقامت اور ایثار کا منبع ہیں وہ اپنے رب کی رضا کے لیے صعوبتیں، مشقت اٹھانے کو تیار ہیں۔

آغازِ سالِ نو

محرم الحرام کے محترم مہینے کے آغاز کے ساتھ ہی اسلامی سال کا بھی آغاز ہوتا ہے ۔ محرم الحرام سال کے ان محترم مہینوں میں سے ایک ہے جو ہر الہامی مذہب کے لیے محترم ہے۔اس مہینے کی اہمیت اور فضیلت مسلم ہے ۔ نئے اسلامی سال کا آغاز جہاں حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت کی یاد دلاتا ہے وہاں یہ مہینہ کربلا میں بیتنے والے عظیم سانحہ کی یاد تر و رتازہ کر دیتا ہے ۔ کربلا میں ہونے والی حق و باطل کی جنگ اور حضرت امام حسینؓ کی جان نثاری کی عظیم یاد تمام امتِ مسلمہ کے لیے ایک ابدی سبق ہے ۔ یہ ایسا واقعہ ہے جس تادمِ قیامت نہ صرف زندہ و جاوید رہے گا بلکہ یہ واقعہ اسلام کی بقاء کا ضامن بھی ہے ۔اس واقعہ کے اثرات رہتی دنیاتک قائم ع دائم رہیں گے یہ وہ المناک سانحہ ہے جب نواسہ رسول ﷺ ، جگر گوشہ ء بتولؓ ، حضرت امام حسینؓ ، جنتیوں کے سردار ، اپنے جان نثاروں کے ساتھ خود کو مسلمان کہنے والوں کے ساتھ جنگ و جدل میں مبتلاء ہوئے اور اس جنگ کے نتیجے میں شہادت کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہوئے ۔

ظلمت کے اندھیروں کو مٹانے کے لیے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے اور اس روشنی کے لیے چراغ جلانے پڑتے ہیں ۔ چاہے ان چراغوں میں تیل کی جگہ شہیدوں کا لہو ہی

کیوں نہ ہو۔ یہ چراغ جان اور مال کی قربانی مانگتے ہیں اور دین کی بقاء کی خاطر یہ قربانی دینا پڑتی ہے۔اگر یہ چراغ نہ جلائے جائیں تو ظلمت کے اندھیرے صدیوں پر محیط ہو جاتے ہیں، انسانیت اس اندھیرے میں بھٹکتی پھرتی ہے،جب ظلم و بربریت اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔زمیں پر رہنے والے خدا کی برابری کرنے لگتے ہیں اور جب جب زمین پر بسنے والوں کے جرم خدائی کی حد کو چھونے لگتے ہیں تب تب خداان زمین کے فرعونوں کو شکست دینے، حق کی سربلندی کے لیے موسیٰ مبعوث فرمایا کرتا ہے۔ہر زمانے کے فرعونوں کے تدارک کے لیے لوگوں کو چناگیااور فرعونوں کے مدمقابل کھڑا کیاگیااور باالآخر حق کو فتح نصیب ہوئی۔مشیتِ ایزدی کبھی عالم انسانیت کو ظلمت کے اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑتی بلکہ ان اندھیروں کو ختم کرنے لیے ایسے لوگ منتخب کرتی ہے جو اپنی ہمت وجرات سے ان اندھیروں کو روشنی میں بدل دیتے ہیں۔

تاریخ عالم گواہ ہے کہ ہر زمانے میں فرعونیت جب حد سے بڑھی تو خدا نے اس کے خاتمے کے لیے اپنے بہترین بندوں کو چنتا ہے۔ یہ اللہ کے چنیدہ بندے انسانیت کی معراج پر ہوتے ہیں۔ انسانیت کی بقاء کے ضامن۔خدا کے یہ چنیدہ بندے حق کی سربلندی کے لیے اپنی جان دینے سے گریز نہیں کرتے، یہ اپنے لہو سے ظلمت کے اندھیروں کو مٹانے کے لیے چراغ روشن کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

کوفہ میں جب یزید کے ظلم ایک حد سے بڑھ گئے تو اللہ نے حضرت امام حسینؑ کو اس کی سرکوبی کے لیے چنا۔ یہ وہ وقت تھا جب یزید شام کا امیر اور ابن زیاد کوفہ کا گورنر تھا ۔چہار جانب ظلم و بربریت ، بدامنی کا دور دورہ تھا۔یزید نے زبان سے نہیں بلکہ اپنے اعمال سے خدائی کا دعویٰ کر رکھا تھا۔ قبیح رسومات معاشرے میں جڑ پکڑ چکی تھی اور اسلام کا وجود خطرے میں پڑ چکا تھا۔ ایسے حالات میں امام عالم حضرت امام حسینؑ کی ذات وہ واحد ذات تھی جو اسلام کو اس دنیا سے مٹ جانے سے بچا سکتے تھے اور انھوں نے اپنے فرض کی انجام دہی کے لیے کوئی دقیقہ فروگزارشت نہ کیا۔ کوفہ کے رہنے والوں نے یزید کے اس ظلم و ستم سے نجات حاصل کرنے کے لیے حضرت امام حسینؑ کو پے در پے خطوط لکھے کہ ان کی مدد کریں ، کوفہ تشریف لائیں اور انھیں یزید کے ظلم سے نجات دلائیں جن میں اس بات کی بھی یقین دہانی کروائی کہ کوفہ میں حضرت امام حسینؑ کی بھرپور مدد کی جائے گی لیکن جب حضرت امام حسینؑ اپنے خاندان کے ساتھ کوفہ پہنچے تو ان کا ساتھ دینا تو درکار ان کے حق میں کسی نے آواز تک بلند نہیں کی ۔ امام الامام حضرت حسینؑ کسی جنگ کے لیے کوفہ تشریف نہیں لا رہے تھے بلکہ وہ اس لیے کوفہ آرہے تھے کہ لوگوں کے دلوں میں پھر سے دینِ اسلام کی شمع روشن کریں ۔یزید کو اس کی بداعمالیوں سے روکیں لیکن یزید اپنی طاقت کے نشے میں دھت تھا اس نے اس نہتے قافلے جس میں عورتیں اور بچے

بھی شامل تھے کے سامنے اپنا لشکر لا کھڑا کیا۔ حضرت امام عالی مقامؑ اور ان کے ساتھیوں کو کوفہ پہنچنے سے پہلے ہی کربلا (نیں نواء) کے مقام پر روک دیا گیا۔ نہ صرف روکا گیا بلکہ ان معصومین پر دریائے فرات کا پانی تک بند کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ قافلے میں شامل بچے تک پیاس سے تڑپتے رہے۔ دریائے فرات آج تک اپنی اس بدبختی پر روتا ہے کہ نواسہء رسول ﷺ اس کے کنارے رکے اور پیاسے رہے۔ یہ بھوکا پیاسا کاروان جو کوفہ کے رہنے والوں کو یزید کے ظلم سے بچانے اور اللہ کی راہ دیکھانے انھی کی درخواست پر آیا تھا اس پر جنگ مسلط کی گئی۔ جب کہ یزید جانتا تھا کہ حضرت امام حسینؑ کون ہیں؟ ان کی نسبت کن سے ہے؟ وہ کس مقصد سے آئے ہیں لیکن اس کے غرور اور انا نے حضرت نبی پاک ﷺ کے خاندان سے جنگ تو گوارا کر لی لیکن جھکنا نہیں۔ امام اعلی مقام نے سب کو اجازت دی کہ وہ چاہیں تو اپنی جان بچا سکتے ہیں لیکن کسی نے اپنے امامؑ کو ان حالات میں چھوڑنا گوارا نہ کیا اور بالآخر جان کی قربانی دی۔ اس قربانی میں شیر خوار بچے بھی شامل تھے اور جوان بھی۔ اس جنگ میں حضرت امام حسینؑ اور ان کے تمام ساتھیوں کو شہید کر دیا گیا۔ خانوادہء رسول ﷺ کی پردہ دار خواتین کو سرِ بازار بے پردہ کیا گیا۔ بچوں اور خواتین کو زندان میں ڈال دیا گیا۔ یہاں تک کہ حضرت امام حسینؑ کی صاحب زادی حضرت بی بی سکینہؑ اسی زندان میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ ان تمام مظالم کے باوجود یزید اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اللہ نے اسے شکستِ فاش دی اور بظاہر

شکست کا شکار ہونے والے حضرت امام حسینؓ اور ان کے جان نثاروں کو دنیا کے لیے ایک مثال بنا دیا۔۔یہ وہ ۷۲ جان نثار تھے جو اپنی کم تعداد، کم اسلحہ کے باوجود باطل قوتوں سے ٹکرا گئے، بالآخر باطل کو شکستِ عظیم کا سامنا کرنا پڑا اور حق کا الم ہمیشہ کے لیے سربلند ہو گیا۔آج حضرت امام حسینؓ کی یاد رتو تمام عالم میں زندہ ہے ان کے روضہ پر آج بھی لاکھوں زائرین جمع ہوتے ہیں لیکن یزید اور اس کی نسل کا نام ونشان تک اس زمین سے مٹ چکا ہے۔اسلام آج بھی زندہ ہے، اسلام کو مٹانے کی کوشش کرنے والے خود خاک میں مل کر اپنا نام ونشان گنوا بیٹھے ہیں

تا قیامت یہ بہادر جان نثار اور عظیم امام کی یاد، اس واقعہ کے اسباق یاد رکھے جائیں گے ۔یہ واقعہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ حق ہمیشہ غالب رہتا ہے چاہے بظاہر حق پرستوں کو شکست ہو۔

واقعہ کربلا، حضرت امام حسینؓ اور لشکر حسینیؓ کے ہمت و حوصلے کون واقف نہیں ؟۔حضرت امام حسینؓ کی یزید سے جنگ، حق کی سربلندی کے لیے اپنی جان کی قربانی، اس چراغ کی مانند ہے جو خداوند عالم نے ظلم و بربریت کے خلاف روشن کیا۔یہ واقعہ تاریخ کے صفحوں میں اس روشن تحریر کی مانند ہے جو رہتی دنیا تک انسانیت کو روشنی فراہم کرتا رہے گا۔

قتل حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلاء کے بعد

آج بھی ہمارا معاشرہ اسی یزدیت کا شکار ہے۔ ایک اللہ اور ایک رسول ﷺ کے ماننے والے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ حق پرستی اور دین پرستی کو فرسودہ خیالات کہہ کر پامال کیا جا رہا ہے۔ ہر طرف دین کی قدروں کو پامال کیا جا رہا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بھی حکمران طبقہ خود کو خدا سمجھنے لگا ہے۔ امن اور انصاف ناپید ہے۔ ہمیں اپنے معاشرے کو سدھارنے کے لیے حضرت امام حسینؓ کی زندگی سے حاصل ہونے والے سبق کو یاد رکھنا چاہیے۔ ان کی پیروی کرنا چاہیے۔ اگر ہر شخص اسوۂ حسینی کا نمونہ بن جاتا ہے تو معاشرہ از خود ایک فلاحی معاشرہ بن سکتا ہے۔

مقامِ حسینؓ : اشعارِ اقبال کی روشنی میں

حضرت امام حسینؓ ایک ایسی ہستی ہیں جن کا مقام بیان کرنا کسی کے بس کی بات نہیں ۔ قلموں کی روشنائی، لکھنے والوں کے الفاظ اس ہستی محترم کی ہمہ پہلو شخصیت کی تعریف سے یکسر قاصر ہیں ۔ان کے درست مقام کا اندازہ کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ ذرا اندازہ کیجئیے ! ان کا مقام کیا ہو گا جنؓ کی نسبت ان سے ہے جو وجہ وجودِ کائنات ہیں ۔ امام حسینؓ وہ عظیم ہستی ہیں جن کے نانا رحمت العالمین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ، جن کی والدہ وہ نبی پاک ﷺ کی لاڈلی بیٹی جنت کی خواتین کی سردار، جن کے والد وہ کہ جب قلعہ خیبر فتح نہیں ہو پاتا تو نبی پاک ﷺ ان سے مدد لیتے ہیں، جنھیں نبی پاک ﷺ اپنے صحابہ میں ایک اعلیٰ مرتبہ عطا فرماتے ہیں ۔ امام حسینؓ کی ہستی اس حد تک محترم ہے کہ ان کی مدح سرائی کے لیے الفاظ ایجاد ہی نہیں ہو پائے ۔ جن کی سواری نبی آخر الزماں ﷺ ہوں جن کے لیے رحمت العالمین خطبہ چھوڑ کر منبر سے اتر آئیں، جنھیں اپنے کندھوں پر اٹھائیں ان کے مقام کا اندازہ کرنا ممکن ہی نہیں ہے ۔۔ جن کے بارے میں نبی پاک ﷺ فرماتے ہیں

حسین منی و انا من الحسین

ترجمہ : حسینؓ مجھ سے ہے اور میں حسینؓ سے ہوں ۔

یہی امام حسینؓ جب جوانی کی عمر کو پہنچتے ہیں تو لوگ ان کے پاس اپنے مسائل کے حل کے لیے آتے ہیں۔ مدینہ منورہ میں دینِ اسلام کے یہ سپوت حکمرانی کی خواہش سے بے بہرہ اپنے ایال کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے جب کوفہ کے رہنے والوں نے پے در پے خطوط لکھ کر حضرت امام حسینؓ کو کوفہ آنے کی نہ صرف دعوت دی بلکہ مدد کی یقین دہانی بھی کروائی۔ جب امام عالی مقام کربلا کے مقام پر پہنچے تو اللہ کے نام لیوا آپؓ کے مدِ مقابل آن کھڑے ہوئے۔ ایک اللہ کے ماننے والوں نے اسی اللہ کے محبوب ﷺ کے خاندان سے جنگ کی۔ صد لعنت ہو ان بدبختوں پر جنھوں نے دنیاوی جاہ وجلال کے لیے یہ نہیں جانا کہ جس نبی ﷺ کے نام کے بنا ان کا کلمہ تک مکمل نہیں وہ انھی کے نواسۂ جن کے پاس جنگی ساز وسامان بھی موجود نہیں ان کے خلاف نہ صرف جنگ کی بلکہ انھیں شہید کیا۔ ان پاک دامن اور پردہ دار بیبیوں جن کے دامن پر فرشتے نماز پڑھتے ہوں۔ جن کی عزت و حرمت سارے عالم پر واجب ہو انھیں بے پردہ کیا گیا۔ طاقت کے نشے میں جھومنے والے یہ بھول گئے کہ وہ دنیا کے عظیم ترین لوگوں کو جن کے پاؤں کی دھول اس قابل ہے کہ مسلمان اس کا سرمہ بنائیں ان کے ساتھ اس حد تک ظالمانہ سلوک کیا۔ جنھوں نے ان پیاس سے نڈھال بچوں کو شہید کیا۔ اس ظلم سے وہ جو نامِ حسینؓ کو مٹانے کے درپے تھے ان کو اللہ نے بدترین شکست دی اور امام عالی مقامؓ کا نام ہمیشہ کے لیے امر کر دیا۔ علامہ اقبال نے اپنے متعدد اشعار میں امام عالی مقام کی مدح سرائی کی ہے اور مقام حسینؓ کو

بیان کیا ہے۔ علامہ اقبال نے اسی دکھ کو اپنے شعر میں کچھ یوں بیان کیا ہے

عجیب مذاق ہے اسلام کی تقدیر کے ساتھ
کاٹا حسینؓ کا سر نعرہء تکبیر کے ساتھ

یہ اسلام کی تقدیر کے ساتھ مذاق ہی تھا کہ اسلام کا منبع خود کو مسلمان کہلانے والوں کے ہاتھوں شہید ہو جائے۔ ایک حدیث میں کچھ یوں ارشاد ہوتا ہے جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ جس نے حسنینؓ سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی جس نے ان سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھا۔ تو جس نے حضرت امام حسینؓ سے جنگ کی اس نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے جنگ کی اور قیامت تک ملعون کہلائے گا۔

"نہایت اس کی حسینؓ ابتداء ہے اسماعیل

مذہب اسلام کا آغاز قربانی سے شروع ہوتا ہے اس کی بقاء اور انتہا قربانی پر مبنی ہے۔ اسلام کے فرزند کبھی اس قربانی سے دریغ نہیں کرتے چاہے وہ حضرت اسماعیلؑ ہوں یا حضرت امام حسینؓ قربانی کا حق ادا کرنے سے کبھی گریز نہیں کرتے۔ جرات مندی کی ایسی مثال دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ملتی

تا قیامت قطع استبداد کرد
موجِ خون او چمن ایجاد کرد

امام حسینؓ اور یارانِ حسینؓ نے ایسی مثال قائم کی کہ جان نثار کر دو

مگر ظالم، جابر اور لادین حکمرانوں کی غلامی قبول نہ کرو۔ جو تمھیں دین سے غداری کی جانب راغب کریں۔ آپؓ کے پاکیزہ اور مقدس خون نے امت محمدی ﷺ کے باغ سے گندگی کو زائل کرکے ایمان کی چمک سے سرفراز کیا۔ جرات کی وہ داستان رقم کی جس کی مثال نہیں مل سکتی۔

نقش لا اللہ بر صحرا نوشت

سطرِ عنوان نجات ما نوشت

امام نے کربلا کی مٹی کو اپنے خون سے اللہ کے دین کا کلمہ سربلند کیا اسلام کو حیاتِ نو سے روشناس کرایا اور ابد تک اسلام کی روح کو زندہ وجاوید کر گئے۔ امام عالی مقامؓ کا کوفہ کی جانب سفر کسی دنیاوی غرض سے متعلق نہیں تھا بلکہ دین کی بقاء کی خاطر تھا۔ کوفہ میں مسلمان تو موجود تھے لیکن اسلام کا وجود خطرے میں آن پڑا تھا۔ انھیں ہر صورت اپنے نانا کے دین کو بچانا تھا اور یہ فرض انھوں نے بڑی تندہی سے انجام دیا۔

سر حق در خال و خون غلطیدہ است

پس بنائے لا الہ گرویدہ است

امام حق کے لیے شہید ہوئے کلمہ توحید کی روشن بنیاد ثابت ہوئے۔ ظلم کا کافرانہ حکم ماننے سے انکار کیا اور مسلمانوں کے لیے ابدی مثال قائم کی۔ امام عالی مقامؓ کی شہادت نے قیامت تک ہر مظلوم کو معتبر، ہر نہتے جان نثار کو کامیاب، ہر بے کس و بے سہارا کو باعزت بنا دیا زمانے میں ظالم

ہمیشہ کے لیے بے توقیر ہوئے۔ظالم اپنے ظلم کے ساتھ اگر زندہ بھی رہے تو درحقیقت یہ ابد تک ناکام رہے گا۔ امام عالی مقامؓ کا امت مسلمہ پر یہ احسان ہے کہ آج ہمارا دین سلامت ہے۔ یہ آپ کا ہی امتیاز ہے کہ اب ہر وہ شخص جو حق کی سربلندی کے لیے لڑے گا اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔

حق حق ہے اور کسی کی شہادت سے حق نہیں مٹتا بلکہ اس کو جلا ملا کرتی ہے۔

مرکے بھی چین نہ پایا۔۔۔۔۔۔

رات کا سناٹا ہر ایک چیز کو گھیرے ہوئے تھا۔گھپ اندھیرے میں کہیں کہیں بلبلوں کی مدھم روشنی ایک عجیب اداس سا ماحول پیدا کر رہی تھی۔ قبرستان میں کچھ قبریں پکی جبکہ کچھ کچی تھی۔آئے روز یہاں قبروں میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ہر نئی قبر اگلی قبر کے لیے جگہ کی کمی کا باعث بنتی جارہی تھی جس کو گورکن بڑی آسانی سے لاوارث قبروں کو ملیا میٹ کرکے پورا کر رہے تھے۔ایک میت کو آج ہی لایا گیا تھا۔یہ ایک ننھا وجود تھا جو کہ بمشکل زندگی کی دس بہاریں ہی دیکھ پایا ہوگا۔نہ جانے کسی بیماری کا شکار ہوا تھا یا کسی حادثے کا۔منوں مٹی تلے اس ننھے جسم کو دبا کر لواحقین اپنے اپنے گھروں کو لوٹ چکے تھے وہ نہیں جانتے تھے کہ جس عزیز بچے کو وہ یہاں دفنا کر جارہے ہیں اس کا جسم آج ہی رات کسی اور انسان کا رات کے کھانے میں تبدل ہو جائے گا۔ اس بچے کی لاش کو دو ظالم جوانوں نے نکالا،اس کے گوشت کو پکایا اور کھا لیا۔صبح کو جب اس بچے کے لواحقین دعا کرنے قبر پر آئے تو وہاں قبر کی مٹی کچھ ہٹی ہوئی تھی۔کچھ ایسے آثار تھے جیسے قبر کو کھودا گیا ہو۔کافی پس و پیش کے بعد فیصلہ ہوا کہ قبر کو کھولا جائے۔جب اس قبر کو دوبارہ سے کھودا گیا تو اس میں لاش کا نام و نشان تک نہیں تھا ۔لواحقین کے وہم و گمان میں بھی نہیں

تھا کہ لاش اس طرح غائب بھی ہو سکتی ہے۔ اس خبر کو قریبی تھانے تک پہنچا دیا گیا، رپورٹ درج کروائی گئی۔ پولیس کی تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ دو نوجوان میت کو قبر سے نکال کر کھانے کے جرم میں ملوث ہیں۔ جب انھیں پکڑا گیا تو انھوں نے عدالت میں اعتراف کیا کہ وہ اس سے پہلے بھی سو کے قریب لاشیں پکا کے کھا چکے ہیں۔ کسی بھی میت کی یہ بے حرمتی کسی غیر مسلم یا کسی یورپ کے ملک کا المیہ نہیں ہے اس المیے کا تعلق ہمارے ملک کے ایک شہر بھکر سے ہے۔ صرف یہی نہیں گوجرنوالہ کے نواح میں ایک شخص نے مردہ خاتون کا ریپ کیا، اس سے پہلے اس طرح کے لوگ نارتھ ناظم آباد، کراچی اور پیر کھوئے شاہ قبرستان کرم پور میں پکڑے گئے۔ یہ ایک ایسی روح فرساء داستان ہے جس کو سن کر اور پڑھ کر روح تک کانپ جاتی ہے۔ یہ کوئی ایسا واقعہ نہیں ہے جس میں کسی نے اپنی بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ ظلم کیا ہو یا کسی مجبوری کے تحت ایسا کیا گیا ہو۔ بلکہ یہ عادی مجرم تھے جو مردہ انسانی گوشت کھانے کے عادی تھے۔ مردہ انسانی گوشت کھانے کی سزا میں پہلے بھی پکڑے گئے لیکن کوئی قانونی ضابطہ اور قانونی شق نہ ہونے کی وجہ سے انھیں قرار واقع سزا نہ ہو پائی۔ صرف ایک یہی نہیں اکثر و بیشتر خبریں ایسی سننے کو ملتی ہیں۔ جب کسی جوان عورت کی میت کے ساتھ ریپ کیا گیا یا کسی مردے کے گوشت سے پیٹ بھرا گیا۔ پہلے پہل صرف کفن کا کپڑا چرا کر بیچا جاتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہاں جرائم میں اضافہ ہوا ہے وہاں جرائم کی نوعیت بھی سنگین سے سنگین تر

ہوتی جارہی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ ملکی آئین میں کسی بھی قسم کے ضابطہ اخلاق کا نہ ہونا بھی ہے۔ حفاظتی اقدامات تو ارضِ وطن کے زندہ لوگوں کے لیے نہیں کیے جا سکے مردوں کے لیے ایسا کوئی اقدام بعید از قیاس ہے تاہم کسی قانون یا سزا کی موجودگی اس طرح کے واقعات کو کم کرنے کا باعث ضرور بن سکتی ہے۔

وجہ کوئی بھی ہو یہ ایک عظیم انسانی المیہ ہے کہ اب مرنے کے بعد کسی کی لاش تک محفوظ نہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ مرنے کے بعد جب اس کے جسم کو مٹی کے سپرد کیا جائے گا تو مٹی کے کیڑوں کی غذا بننے سے پہلے کسی انسان کی غذا بن جائے یا کوئی باپردہ خاتون مرنے کے بعد کسی کی ہوس کا نشانہ بن جائے گی۔ اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں کہ موت کے بعد جسم قبر میں محفوظ رہے گا یا نہیں۔ یہ ایک ایسا المیہ ہے جس کی جانب کسی کی توجہ کبھی نہیں ہوئی۔

ہماری ارضِ وطن کا حال تو بقول شاعر کچھ یوں ہے

اب تو گھبرا کے کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

میت کی بے حرمتی چاہے وہ کسی بھی صورت میں ہو کسی بھی مذہب میں قابلِ معافی نہیں مبادہ کہ اسلام جیسا پاک اور صاف مذہب۔ ایسے مجرم کو زندہ رہنے

کا کوئی حق نہیں جس کے شر سے زندہ لوگ تو درکنار مردے بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔ایسے شخص کو تو سرِ عام پھانسی کی سزا دینی چاہیے۔

نبی پاک ﷺ کے زمانہ حیات میں ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔اس کی روایت بہت کم کتابوں میں ملتی ہے۔نبی پاک ﷺ کے زمانہ نبوت میں ایک جوان شخص نبی پاک ﷺ کے پاس آیا اور معافی کی درخواست کی۔نبی پاک ﷺ نے فرمایا۔گناہ کتنا ہی کبیرہ نہ ہو اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا ہے۔

اس نے کہا گناہ قبر سے متعلق ہے اور معافی پر تکرار کرنے لگا۔بار بار تکرار کرنے پر جب اس سے استفسار کیا گیا تو اس نے بتایا کہ اس نے ایک نوجوان عورت کی میت کا ریپ کیا ہے۔نبی پاک ﷺ نے اس کی جانب توجہ نہ فرمائی اور اسے وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا اور غصے کا اظہار فرمایا۔یہاں تک کہ وہ روتا رہا لیکن اسے معافی نہیں ملی۔اس واقع سے یہ ثابت ہوا کہ میت کی ایک حرمت ہے اور اس حرمت کا احترام واجب ہے اور یہ ایک ایسا گناہ ہے جس کا کوئی کفارہ، جس کی کوئی معافی نہیں ہے۔جس عمل کو رحمت العالمین ﷺ معاف نہ فرمائیں اور اس عمل پر برہمی کا اظہار فرمائیں وہ کس حد تک بڑا گناہ ہے اس کا اندازہ ناممکن ہے۔وہ ایسا گناہ کبیرہ ہے جس کو اللہ بھی معاف نہیں فرمائے گا کیونکہ اس کے محبوب کی ناراضگی درحقیقت اللہ کی ناراضگی ہے۔

قبر سے میت چوری یا میت کی بے حرمتی کے واقعات کو روکنے کے لیے ھکومتی اور عوامی ہر دو سطح پر ضروری اقدامات کیے جانے چاہیں ۔ عوام الناس کو اپنی مدد آپ کے تحت قبرستانوں میں بلب لگانے چاہیں جو کہ ساری رات روشن رکھے جائیں ۔ رات میں روشنی کی موجودگی میت چوروں کو متنبہ کرے گی اور اس طرح کے جرائم میں کمی واقع ہو گی ۔ دوسری صورت یہ ہے کہ علاقہ کے چوکیدار کو کہا جائے کہ وہ قبرستانوں پر بھی نظر رکھے ۔

جبکہ حکومت کو چاہیے کہ کوئی ایسا ضابطہ قانون وضع کیا جائے جس میں میت کی بے حرمتی ، یا مردہ انسان کے گوشت کو کھانے کی سخت سے سخت سزا مقرر کی جائے تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو اور کوئی ایسا قبیح فعل کا سوچتے ہوئے بھی محتاط رہے ۔اس طرح کم از کم مرنے کے بعد تو انسانی جسم محفوظ رہ پائیں گے اور مردوں کے لواحقین کو یہ یقین ہو گا کہ جس کو انھوں نے دفنایا ہے وہ قبر میں موجود ہے۔ نہ کہ یہ شک ہی رہے کہ قبر میں ان کے عزیز کی لاش موجود بھی ہے یا نہیں ۔

موسم سرما یا سرد مہری

موسم سرما کی شدت میں اضافہ کے ساتھ ساتھ میں مختلف طرح کی اشیاء جن میں ابلے انڈے ، مچھلی ، سموسے ، پکوڑے وغیرہ اہم ہیں کے استعمال میں اضافہ ہو جاتا ہے ۔ بھنی ہوئی مونگ پھلی کی ریڑھیاں شام ڈھلتے ہی سڑک کے کنارے سج جاتی ہیں ۔ موسم سرما کے آغاز کے ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے بچے ایک بالٹی نما تھرماس ابلے انڈے میں ڈالے بیچتے نظر آتے ہیں ۔ تلی ہوئی مچھلی کی دکانوں پر لوگوں کا رش دیدنی ہوتا ہے ۔ ابھی چند دن پرانی بات ہے مجھے شام ڈھلے بازار جانا پڑا حسبِ اندازہ مچھلی کی دکان اور ہوٹل پر رش کی وجہ سے فٹ پاتھ سے گزرنا نہایت مشکل تھا۔ (دھمیال روڈ کے اس علاقہ میں مچھلی فروش فٹ پاتھ پر ایک بڑی کڑاھی میں مچھلی تلتا ہے اس لیے عموماً آپ رات یا شام کے وقت فٹ پاتھ پر رش دیکھیں گے جس کی وجہ سے راہ گیروں کے لیے چلنا دوبھر ہو جاتا ہے اسی رش کی وجہ سے مختلف لوگوں کی روزی کا انتظام بھی ہو جاتا ہے جن میں ننھے بچے بھی شامل ہیں)۔

اسی رش کے بیچوں بیچ ایک ننھا بچا جس کے ہاتھوں کی نرم جلد سردی کی وجہ جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی ۔اس بچے کے ہاتھ بتا رہے تھے کہ وہ محنت کش ہے اور فکرِ معاش نے اس سے اس کا بچپن چھین لیا ہے ۔ اس نے اپنے ننھے ہاتھوں میں

کچھ دینی کتب پکڑ رکھی تھی وہ اس رش میں کھڑے ہر شخص کے پاس جاتا اسے کتب بیچنے کی کوشش کرتا۔ وہاں موجود اکثر و بیشتر لوگ اسے نظر انداز کر دیتے وہ ایک بے بسی آنکھوں میں لیے ہر ایک شخص کو دیکھتا، پھر کڑاھی میں ڈلی مچھلی کے ٹکڑوں کی جانب دیکھتا اور سر جھکا لیتا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بھاگ کر میری جانب آیا امید کی ایک چمک اس کی آنکھوں سے واضح تھی۔ میرے پاس پہنچتے ہی اس نے کتب اپنے دونوں ہاتھوں میں پھیلا دی۔ کتابیں بھی اس کے ننھے ننھے ہاتھوں کی مانند چھوٹے سائز کی تھی۔ سورت یٰس، نماز اور اسلامی دعائیں۔ وہ سب ایسی کتب تھیں جن کی مجھے قطعاً ضرورت نہ تھی۔ میں اس کے سوال میں چند لمحے خاموش رہی وہ تیزی سے بولنے لگا۔ باجی اگر ایک خریدیں گی تو پچاس کی دوں گا لیکن دو اسی میں دے دوں گا۔ باجی ایک کتاب لے لیں یہاں کسی نے مجھ سے کوئی کتاب نہیں لی۔ مجھے محسوس ہوا کہ شاید یہاں سردی نہیں بلکہ سرد مہری تھی۔ یہاں کھڑے ہوئے ہر شخص کے پاس اتنے پیسے تو تھے کہ چھ سو سے بارہ سو روپے کلو مچھلی خرید لیں لیکن وہ پچاس روپے نہیں تھے جو اس بچے سے ایک کتاب خریدنے کے کام آ سکیں۔ یہی بچہ اگر عزت کی محنت مزدوری کی بجائے بھیک مانگ رہا ہوتا تو شاید یہاں کھڑے لوگوں میں سے چند ایک تو اس کو بھیک ضرور دیتے۔ میں نے بنا دیکھے ایک کتاب اس کے ہاتھ سے لے لی اور پچاس روپے اس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ اس ننھی سی کتاب کی قیمت شاید بیس روپے تھی۔ اس بچے نے اس لیے زیادہ قیمت بتائی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ

جو بھی اس سے کتاب خریدے گا اس کو قیمت کم کرنے کا ضرور کہے گا۔ یہ ہمارے معاشرے کی بے حسی کا دوسرا بڑا ثبوت تھا کہ ایک پچاس روپے کی چیز کی قیمت تو کم کروائی جائے گی لیکن کئی سو روپے دوسری اشیاء پر لگا دئے جائیں گے۔اس نے ایک بار میری جانب اس تذبذب سے دیکھا کہ بقایا لوٹا دے میں نے مسکرا کر نفی میں سر ہلا دیا۔اس بچے کی خوشی دیدنی تھی۔ میرے لیے تو شاید ان پچاس روپے کی اتنی حیثیت نہ تھی جتنی اس بچے کے لیے تھی۔اس کے لیے شاید وہ ایک وقت کا کھانا تھا۔ یہ صرف ایک بچہ نہیں روزانہ نہ جانے کتنے ہی بچے بھیک سے بچنے کے لیے اس طرح کی کتب، کھانے پینے اور استعمال کی چھوٹی چھوٹی اشیاء بیچتے نظر آتے ہیں۔ یہ چائلڈ لیبر نہیں یہ وہ بچے ہیں جو اپنے خاندان کا پیٹ پالتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو محنت مزدوری کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی حاصل کرتے ہیں لیکن ایسے بچوں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔

یہاں حیات نبوی ﷺ سے ایک واقعہ تحریر کرتی چلوں۔ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیؓ فرماتے ہیں۔ ایک بار ہم حضور ﷺ کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک بچہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا۔ یارسول اللہ ﷺ میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان میں یتیم ہوں، میری ایک بہن اور بیوہ ماں ہے۔ہم مفلوک الحال اور کئی دن سے بھوکے ہیں۔آپ ﷺ اپنے ہاں سے ہمیں کھانا عنایت فرمایے اس کے بدلے اللہ کریم آپ ﷺ کو کھانا عطا کرے گا۔ نبی پاک ﷺ بچے کی اس گفتگو سے نہایت خوش ہوئے اور فرمایا

۔ ہمارے گھر جاؤ وہاں سے جو کچھ ملے میرے پاس لے آؤ۔ وہ لڑکا کاشانہ ء نبوی ﷺ سے اکیس کھجوریں لے آیا اور لا کر آپ ﷺ کی ہتھیلی پر رکھ دیں ۔ رحمت العالمین ﷺ نے ان کجھوروں پر پھونک ماری اور برکت کی دعا فرمائی اور فرمایا۔بیٹا ! یہ سات کجھوریں تیرے لیے ، سات تمھاری ماں کے لیے اور سات تمھاری بہن کے لیے ، صبح شام ایک ایک کھا لیا کرو۔ یہ لڑکا بارگاہ نبوت ﷺ سے باہر آیا تو حضرت معاذ بن جبلؓ اس کی طرف اٹھے اور اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے دعا فرمائی ۔اللہ کریم تمھارے حالات کو بہتر بنائے۔ حضرت نبی آخرالزماں ﷺ دیکھ رہے تھے ۔ جب معاذؓ واپس آئے تو آپ ﷺ نے پوچھا۔۔ تم نے ایسا کیوں کیا ؟ حضرت معاذؓ نے عرض کی ۔یارسول اللہ ﷺ ! بچے پر رحمت کے جذبے سے ۔ اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا۔اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے جو مسلمان کسی یتیم بچے کے ساتھ پیار کرتا ہے ،اللہ تعالیٰ اس یتیم کے ہر بال کے ، بدلے اس کے درجات بلند کرتا ہے ، ہر بال کے بدلے اسے ایک نیکی عطاء فرماتا ہے اور ہر بال کے بدلے ایک خطاء معاف فرماتا ہے ۔اس واقعہ سے ثابت ہوا کہ یتیم اور نادار بچوں کے سر پر دستِ شفقت رکھنا بھی ایک نیکی ہے اور اسلامی معاشرے کا ایک خاصہ ہے کہ ایسے نادار بچوں کی مدد کی جائے ۔

اکثر و بیشتر غریب بچے یا عورتیں چھوٹی چھوٹی چیزیں بیچتے اور بعض اوقات سڑکوں پر موجود گاڑیوں کے شیشے دھوتے نظر آتے ہیں ۔ یہ وہ بچے ہیں جو

ٹھٹھرتی شاموں میں رزق کی تلاش میں نکلتے ہیں اس امید پر کہ یہ اشیاء خریدی جائیں گی اور ان کے گھروں کا انتظام چلتا رہے گا۔ ہمارے ملک میں تقریباً ۳۰ فی صد لوگ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں جبکہ ۲ فی صد لوگ ایسے ہیں جو دنیا کے امیر ترین خاندانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ پکے گھروں سے بھی محروم ہیں اور جھگیوں میں اپنی زندگیاں گزارنے پر مجبور ہیں۔ راولپنڈی اور اسلام آباد جیسے شہروں کے مضافات میں بھی لوگ جھگیوں میں رہتے ہیں جہاں موسم گرما تو شاید کسی نہ کسی طرح گزر ہی جاتا ہے لیکن موسم سرما کی شدت.برداشت کرنا نہایت ہی مشکل امر ہے۔ ان جھگیوں کے مکین بنا کسی گرم کپڑے کے گھاس پھوس جلا کر موسم کی شدت سے مقابلہ کرتے نظر آتے ہیں۔ جبکہ اسی ملک کی اشرافیہ کئی کئی ہزار کا ایک ایک سوئٹر خریدتی نظر آتی ہے۔ معاشرے میں بے حسی کا یہ عالم ہے کہ پرانے کپڑے تک کوئی کسی کو دینے کو تیار نہیں۔ غریب اپنی غربت سے لڑ رہا ہے اور امیر اپنے حال میں اس قدر مست ہے کہ اسے کسی اور کا احساس ہی نہیں۔ کوئی سفید پوش جو اپنی غیرت اور عزت کو مدِ نظر رکھ کر اگر بھیک نہ مانگنا چاہے تو کوئی اس کی مدد خود سے کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اس کے.برعکس بھیک مانگنے والوں کی مدد کی جاتی ہے جو کہ پیشہ ور فقیر ہیں۔ ہمیں ان دو افراد میں فرق کرنے کی ضرورت ہے۔

معاشرے سے اس بے حسی کو ختم کرنے کے لیے ہمیں کسی ابنِ مریم کی ضرورت نہیں

کسی راہنما، کسی لیڈر، کسی حکمران کی ضرورت نہیں اس بے حسی کے خاتمہ کے لیے، بس ہمیں اپنے اندر سے اس بے حسی کو ختم کرنا ہوگا۔ جو آپ میں اور مجھ میں ہے۔ ہمیں اپنے ان معصوم بچوں، ان بزرگوں اور ان ماؤں کی مدد کرنا ہوگی۔ انھیں بھیک نہیں دینی ان کی غیرت کا سوا نہیں کرنا، بس ان کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی بے وقت اشیاء کو اپنی حیثیت کے مطابق خریدنا ہے۔ اگر ہر وہ شخص جو بہتر مالی حالات رکھتا ہو، وہ ان غیرت مندوں سے اشیاء خریدے تو یہ ان کی سب سے بڑی مدد ہوگی۔

نظم وضبط اور پی ٹی آئی

نظام وضبط کسی بھی قوم کی ترقی کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو قومیں نظم و ضبط کا مظاہرہ کرتی ہیں وہ اقوامِ عالم میں اپنا ایک نام بنانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ ہماری ارض وطن اور قوم خصوصا اس خوبی سے بھی محروم ہے۔ سیاسی جلسوں میں ہلڑ بازی اور افرا تفری عام ہے۔ نظم و ضبط کا مظاہرہ بھی خال خال ہی کیا جاتا ہے ۔ جلسے تو در کنار، ٹی وی شوز اور قومی اسمبلی میں بھی بد نظمی کے مظاہرے عام ہیں۔ انتخابات کے موسم میں تو اس طرح کے ہنگامے عام ہیں۔ بد لیاتی انتخابات کے آغاز کے ساتھ ہی ملک کے طول و عرض میں سیاسی، پارٹی بنیادوں پر جلسے جلوس کا انعقاد کیا جا رہا ہے۔ ہر پارٹی رہنما کی کوشش ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ عوام تک رسائی حاصل کرکے اپنی جیت کو یقینی بنائیں۔ اس لیے زیادہ سے زیادہ جلسے منعقد کیے جا رہے ہیں۔ جہاں جہاں کوئی جلسہ منعقد ہوتا ہے وہاں وہاں سڑکوں کو بلاک کر دیا جاتا ہے ٹریفک کو روک دیا جاتا ہے۔ کسی بھی سیاسی پارٹی کے حالات کا جائزہ لینا ہو تو اس کے جلسوں میں نظم و ضبط کو دیکھ لیں۔ میڈیا اور اخبارات پارٹیوں کے جلسوں کا احوال براہِ راست پیش کرتے ہیں ان میں کچھ تو درست ہوتا ہے جبکہ کچھ مبالغہ آرائی بھی ہوتی ہے۔ ہمارے ملک کی ہر سیاسی پارٹی کے جلسے میں ہنگامہ آرائی ایک عام بات ہے اور اگر کوئی کہے

کہ اس پارٹی کے ارکان یا کارکنان نے نظم و ضبط کا مظاہرہ کیا تھا تو یہ نعید از قیاس بات لگتی ہے۔

لیکن ہمارے ملک کی سیاست میں بھی کبھی کبھی ان ہونیاں ہو ہی جاتی ہیں اور اس طرح کی ان ہونیوں کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ ہماری قوم بھی نظم و ضبط کا مظاہرہ کر سکتی ہے اگر منتظمین اور پارٹی قیادت ذہانت اور اعلیٰ نظم و ضبط کا مظاہرہ کرے۔ آپ بھی حیران ہوں گے کہ ہمارے ملک کی سیاسی پارٹیاں اور نظم و ضبط، دو الگ باتیں ہیں اور ناممکنات میں سے ہیں۔ یہاں میں ایک جلسے کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتی چلوں ۔ مورخہ یکم دسمبر کو راولپنڈی کے علاقہ صادق آباد میں پی ٹی آئی نے بدلیاتی انتخابات کی مہم کو کامیاب بنانے کے لیے جلسہ منعقد کیا۔ یہ جلسہ ایک سڑک پر منعقد کیا گیا۔ یہ جلسہ شام کے وقت منعقد کیا گیا جب تقریبا تمام اداروں میں چھٹی ہو چکی ہوتی ہے۔ کم و بیش جب ہم اس سڑک سے گزرے جہاں جلسہ ہو رہا تھا، اس وقت پانچ بج کر بیس منٹ ہو چکے تھے۔ ہمیں یہ علم ہی نہیں تھا کہ اس علاقہ میں کوئی جلسہ ہے، ہماری گاڑی آفس کے بتائے گئے روٹ کے مطابق اس سڑک سے گزر رہے تھے۔ اس سرک پر موجود جلسے میں شامل کارکنوں کا جوش وجذبہ اور وہاں کا نظم و ضبط ہمیں حیران کر دینے کو کافی تھا۔ پہلی بار کوئی ایسا جلسہ میری نظر سے گزرا ہے جہاں نہ تو سڑک کو بلاک کیا گیا تھا اور نہ ہی گاڑیوں کو روکا جا

رہا تھا۔ متتیعنی جلسہ بھی جاری تھا اور ٹریفک بھی رواں دواں تھی۔ منتظمین اور کارکنان نے ایک سفید رنگ کی رسی پکڑ رکھی تھی جو سڑک کو دو حصوں میں تقسیم کر رہی تھی۔ ایک حصہ وہ جس طرف کارکن اور جلسے میں شامل افراد کھڑے تھے اور نعرے لگا رہے تھے جبکہ دوسری جانب سے سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی۔ ی لاؤڈ سپیکر پر بار بار اعلان ہو رہا تھا کہ جلسہ میں شامل افراد رسی کے ایک جانب رہیں تاکہ دوسری جانب ٹریفک کے بہاؤ میں کوئی رکاوٹ نہ آنے پائے۔ اعلان سننے والے بنا کسی دھکم پیل کے رسی کی ایک جانب سرک جاتے اور دوسری جانب آدھی سڑک کھلی رہتی

۔

راولپنڈی تو کیا اسلام آباد کے رہنے والوں کے لیے بھی ایک حیران کن جلسہ ہو گا بلکہ یقیناً یہ ناقابلِ یقین سا لگتا ہے کہ وہ پی ٹی آئی جس کے جلسوں میں عموماً ہنگامہ آرائی دکھائی دیتی ہے وہ ملک جہاں اس وقت تک جلسہ مکمل ہی نہیں ہوتا جب تک کہ ٹریفک کو روکا نہ جائے جہاں لوگوں کو زبردستی جلسے میں شامل کیا جانا عام سی بات ہے۔
جہاں یہ تک ممکن ہے کہ ایک ہی پارٹی کے کارکن آپس میں لڑ پڑیں اور کرسیاں الٹ دی جاتی ہوں۔ وہاں اس نوعیت کا نظم و ضبط۔ میں بھی اگر یہ خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتی تو شاید یہ بات میرے لیے بھی ناقابلِ یقین ہوتی۔ میرے ذہن میں پی ٹی آئی کے وہ جلسے گھوم گئے جن میں بے تحاشا ہلڑ بازی کی گئی تھی اور اسلام آباد میں منعقد کیئے گئے تھے۔

بات یہاں تک محدود نہیں ہے۔ کچھ لمحے بعد کا نظارا میرے لیے اس لیے زیادہ حیران کن تھا۔ جب پی ٹی آئی کے چیئرمین عمران خان اس جلسے میں شرکت کی خاطر آئے اور ان کی گاڑی ہماری گاڑی کے بالکل ساتھ سے گزری۔ محافظ فورس کی ایک گاڑی جس میں پانچ افراد سوار تھے اس کے پیچھے عمران خان کی گاڑی جس میں ایک ان کا ڈرائیور اور ایک گارڈ موجود تھا۔ عمران خان گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر ڈائیور کے ساتھ بیٹھے تھے ۔اس گاڑی کے پیچھے کارکنان کی گاڑیاں تھی۔ سیکیوٹری وجوہات کے باوجود سڑک عوام کی آمد و رفت کے لیے کھلی تھی۔ عوام کی گاڑیوں کے درمیان سے ایک لیڈر کی گاڑی گزر رہی تھی یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ ایک عوامی لیڈر ہے جس کو عوام سے کوئی خطرہ نہیں اور جو عوام کو خطرہ ہے وہ اس لیڈر کو بھی ہے۔ کیا یہ واقعی ہی سیاسی جلسہ تھا جس میں ایک پارٹی کا راہنما شامل ہو رہا تھا؟ ہم سب کے لیے یہ سب کچھ حیران کن تھا۔ کوئی روٹ نہیں لگایا گیا تھا عوام کو کوئی دانستہ تکلیف نہیں دی گئ تھی۔ کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہو رہا تھا۔ اگرچہ عمران خان زیادہ وقت وہاں نہیں رکے اور جلد واپس لوٹ گئے تاہم یہ نظم وضبط قائم ہو جانا (جو کہ ہماری ملکی سیاست میں تقریبا ایک ناممکن سی بات لگتی ہے)اور قائم رہنا منتظمین کا حقیقتاً ایک کارنامہ ہی سمجھنا چاہیے اور عمران خان کا وی آئی پی پرٹوکول کی خاطر عوام کو تکلیف نہ دینا خالصتاً ان کی اچھی سوچ کا مظہر ہے۔

میرے پی ٹی آئی سے کچھ نظریاتی اختلافات ہیں۔ عمران خان صاحب کے بعض بیانات سے مجھے بھی پاکستان کے بہت سے لوگوں کی طرح اختلاف ہے۔ لیکن یہ نظم و ضبط اور اس طرح سے جلسہ منعقد کروایا جانا اور اس جلسے کے دوارن ٹریفک کو نہ روکا جانا اور وی آئی پی پروٹوکول کو محدود رکھنا جس میں عوام کو تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے یہ عمل واقعتاً قابلِ تعریف ہے۔ ایسے عمل کی تعریف کی جانا بھی ضروری ہے اور دوسری پارٹیوں کو بھی چاہیے کہ وہ اچھی رسم کو اپنائیں۔ آپ کے کسی جلسے سے عوام کو کوئی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے تب ہی آپ اس قابل ہیں کہ آپ عوام کی نمایئدگی کریں۔ ایسے نظم و ضبط کا مظاہرہ ہر پارٹی، ہر پارٹی کے چیئرمین کو کرنا چاہیے۔ سیاسی راہنماؤں اور لیڈروں کو خود پر اس حد تک اعتماد ہونا چاہیے کہ اگر وہ عوامی نمائندے ہیں تو عوام سے انھیں کوئی نقصان نہیں ہوگا اور یہ تب ہی ممکن ہے جب وہ اپنا کام اس قدر اچھے طریقے سے سرانجام دین کہ عوام کے دلوں میں ان کے لیے غم و غصہ کی بجائے عزت اور محبت ہو۔ بلٹ پروف شیشوں کے پیچھے کھڑے ہو کر تقریر کرنے والے عوامی لیڈر ہو ہی نہیں سکتے۔ آج کے دور میں جب دنیا ایک گلوبل ویلج کی حیثئت اختیار کر چکی ہے وہاں ان نمائندگان کو اور زیادہ احتیاط اور نظم و ضبط سے کام لینا چاہیے کیونکہ تمام عالم اب

ان جلسوں کو لائیو دیکھ رہا ہے اور یہ سب پاکستان کے سفیر کے طور پر خود کو دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

رحمت العالمین ﷺ غیر مسلموں کی نظر میں

ربیع الاول کے مہینے کا آغاز ہے ، چہار جانب نبی اکرم ، رحمت العالمین ، وجہ وجود کائنات حضرت رسولِ عربی ﷺ کی دنیا میں قدم آواری کا جشن منانے کی تیاریاں اپنے عروج پر ہیں ۔ وہ رحمت العالمین ﷺ ، ایک ایسی ہستی جن کی شان کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کے لیے ان گنت الفاظ ، ان گنت صفحے اور ان گنت قلم چاہییں ، پھر بھی ان کی شان کو بیان کرنا ممکن نہیں ۔ جن کی محبت میں اللہ رب العزت خود مداح سرا ہے۔ وہ عظیم ہستی ﷺ ، محبوب ربِ العالمین ﷺ جن کے لیے خدائے ذوالجلال نے زمین اور آسمان کو تخلیق کیا۔ جس نے اپنے نبی ﷺ اپنے محبوب ﷺ پر درود بھیجنا واجب کر دیا ، کہ جب تک آپ نماز میں درود پاک نہ پڑھ لیں نماز مکمل نہیں ہو سکتی ۔ کسی انسان کے بس کی بات ہی نہیں کہ ان کی شخصیت کا مکمل احاطہ کر پائے ۔

نبی محترم ﷺ وہ یتیم جنھوں نے یتیموں کے لیے تا قیامت بھلائی کو عام کیا۔ جنھوں نے غلاموں اور عورتوں کو سہارا دیا۔ جنھوں نے ہر مشکل کو سہا اور پتھر مارنے والو ں کو دعا دی ۔ جنھوں نے جہالت میں ڈوبی ہوئی قوم کو جہالت سے نکال کر تہذیب و تمدن سے روشناس کروا دیا۔ یہ وہ ہستی جن کی شان بنان کرنے

کے لیے اگر سالوں لکھا جائے تو بھی کم ہے۔ نبی پاک ﷺ ایسے راہنما جنھوں نے انسانی زندگی کے ہر ہر لمحے کے لیے تا قیامت راہنمائی کی اور جن کی ہدایت، روشنی تا قیامت جاری رہے گی۔ یہ نبی پاک ﷺ کا انسانیت پر احسانِ عظیم ہے کہ تا قیامت انسان آپ ﷺ کی سیرت مبارکہ سے ہدایت حاصل کرتے رہیں گے۔ یہ وہ ہستی ﷺ ہیں جن کے بارے میں مسلمان تو مسلمان، ہر مذہب کے لوگوں نے لکھا اور انھیں انسانیت کی بقاء کی وجہ قرار دیا۔ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد نے ان کی مدح سرائی کی۔ کچھ کے الفاظ کو یہاں لکھتی چلوں

امریکہ کے سپریم کورٹ کے داخلی دروازے پر جو کتبہ نصب ہے اس کی تحریر کچھ یوں ہے۔

Prophet Nuhammad (S.A.W) was one of the most influencial of all Law Givers in the history of the world.

(Untited States Supreme court)

حضرت محمد ﷺ دنیا کی تاریخ میں سب سے زیادہ انصاف کرنے والے ہیں۔

دنیا کو محمد ﷺ کی طرح کا سوچ رکھنے والے انسان کی ضرورت ہے۔ میرا یقین ہے کہ اگر ان (محمد ﷺ) جیسی سوچ رکھنے والے بندے کو اس دنیا کا ڈکٹیٹر حکمران بنا دیا جائے تو اس دنیاکے تمام مسائل کو اس طرح حل کرلیں گے کہ یہ دنیا امن، خوشحالی اور سلامتی کا گہوارہ بن جائے گی۔ (سر جارج.برناڈ شاہ۔دہ

(جنیوین اسلام ۔ والیوم ا۔ نمبر ۸

اگر مجھے دنیا کے متاثر کر دینے والے افراد کی فہرست بنانے کو کہا جائے تو میں محمد ﷺ کا نام سہر فہرست لکھوں گا کیونکہ باقی ہر ایک پر سوال اٹھایا جا سکتا ہے۔ واحد محمد ﷺ وہ ہیں جو تاریخ میں مذہبی اور معاشرتی طور پر کامیاب ترین فرد ہیں۔ (Micheal H Hert: The 100 : A ranking of the Most Influencial persons in the History)

ملک کے حکمران اس کے ساتھ ساتھ چرچ کے نگہبان، ایک ہی وقت میں قیصر اور پوپ لیکن وہ ایسے پوپ تھے جو صرف پوپ نہ تھے، ایسے قیصر تھے جو صرف قیصر نہ تھے، ۔ایسے قیصر جو قیصر کے لباس میں نہ تھے، نہ ہی ان کا حفاظتی دستہ، نہ فوج اور نہ ہی مستقل آمدنی، اگر کسی نے درست طریقے سے حکومت کی ہے تو بلا شبہ وہ محمد ﷺ ہی تھے۔ جنھوں نے حکومت میں طاقت کا مظاہرہ نہ کیا۔

R.Bosworth smith : Muhammad and Muhammadism

وہ امین، صادق ہیں جنھوں نے دوسرے امین اور صادق لوگوں کی وفاداری حاصل کر پائے۔

Encyclopedia Britinica

نیپولین بونا پارٹ کچھ یوں راقم ہوا۔

مجھے امید ہے کہ وہ دن دور نہیں ہے جب میں تمام دنیا کے سمجھدار اور پڑھے لکھے افراد کو اکٹھا کرکے ایک ایسی شوریٰ بناؤں گا جو کہ قرآن کے احکام

پر مبنی ہو گی جو کہ سچ ہے اور انسان کو ابدی خوشی کی جانب لے جا سکتا ہے۔ (محمد ﷺ
(قرآن کی عملی تفسیر ہیں

فلسی، خطیب، رسول، قانون ساز، جنگجو، فاتح، بہترین صلاحیتوں کو نکھارنے والے، بیس سے زیادہ مملکتوں کے بانی، ایک روحانی مملکت عطاء کرنے والے، بلاشبہ محمد ﷺ ہیں۔ یہ وہ تمام پیمانے ہیں جن سے انسان کی عظمت کو ماپا جا سکتا ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان (محمد ﷺ) سے زیادہ عظیم کوئی ہستی نہیں ہے۔

(Lamartine Histoire De La Turque Paris 1854)

کے ایس رمانشد راؤ جو کہ ایک ہندو فلسفی ہے اس نے اپنی کتاب میں نبی پاک ﷺ کی زندگی کو بہترین نمونہ لکھا۔ وہ کچھ یوں لکھتا ہے

محمد ﷺ کی ذات کو پوری طرح سے جانچنا ناممکن ہے۔ جو مجھے نظر آیا، محمد ﷺ بیک وقت ایک نبی، ایک رسول، ایک صوفی، ایک بادشاہ، ایک فاتح، غلاموں کے محافظ یتیموں کے والی، عورتوں کے حقوق کے علمبردار، اور صوفی ہیں۔ معاشرے میں یہ تمام، کردار اہم ہیں اور محمد ﷺ ان تمام شعبوں کے ہیرو ہیں۔

Muhammad The Prophet of Islam

ایک انگریز ادیب تھامس کریل یوں لکھتا ہے۔

کیسے ایک شخص لڑتے ہوئے قبیلوں کو ایک میز پر لا سکتا ہے اور دو صدیوں سے کم وقت میں انھیں ایک طاقت ور اور تہذیب یافتہ قوم میں تبدیل کر سکتا ہے۔

یہ محمد ﷺ ہی ہیں جن کی مثال نہیں ملتی۔

Heros and Hero Worships

ڈی سی شرما نے لکھا

محمد ﷺ واحد شخصیت ہیں ج ن کا اثرو رسوخ ۱۴۰۰ سال پہلے سے ابد تک محسوس کیا جائے گا اور قائم رہے گا۔

The Prophets of East Calcuta 1935

یہ وہ تمام لوگہیں جن کا مذہب اسلام نہیں ہے لیکن وہ بھی نبی پاک ﷺ کے مختلف شعبوں پر کئے گئے احسانات کو نہ صرف مانتے ہیں بلکہ ان کی مدح سرائی بھی کرتے ہیں

۔

اے نئے سال تجھ میں نیاء کیا ہے؟

نئے سال کی آمد آمد ہے۔ سال 2015ء اپنے ساتھ کچھ خوشیاں اور کچھ غم لیے ہمیں الوداع کہہ رہا ہے۔نئے سال کے آغاز کے ساتھ ایک اہم سوال جو اکثر ذہنوں میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس نئے سال میں نیا کیا ہے ؟انفرادی سے لے کر اجتماعی حالات ،سیاست ، راہنماؤں کے دعوے اور انہی راہنماؤں کے پرٹوکول کی وجہ سے معصوم بچی کا جان سے ہار جانا، سبھی کچھ پچھلے سال کی مانند ہے۔اس نئے سال میں بظاہر نیا کچھ نہیں نظر آتا۔

حکومتی سطح پر سال 2015 ء بھی ہر سال کی طرح دھاندلی کے نعروں میں بارہا۔ پنجاب میں لوگوں کو میٹرو بس کا تحفہ دینے والے بجلی اور گیس کا بحران حل نہ کر سکے ۔بجلی کا بحران حکومتی دعوؤں کے باوجود جوں کا توں رہا۔ بجلی کی لوڈ شیڈنگ کا دورانیہ بھی کم نہ ہو سکا۔حالیہ حکمرانوں کا یہ دعویٰ تھا کہ حکومت ملنے پر یہ بجلی کا بحران ختم کریں گے لیکن یہ دعویٰ صرف لفاظی کی حد تک ہی رہا۔ موسم سرما کے آغاز کے ساتھ ہی چولہوں میں جلتی گیس بھی کم سے کم ہوتے ہوتے ختم ہو جانے لگی ۔عوام گیس کی لوڈشیڈنگ کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے ۔اگرچہ صوبہ خیبر پختونخواہ میں پولیس کا انظام بہت حد تک بہتر بنایا گیا۔اس صوبہ میں پولیس ریفارمز کی گئی جو کہ دوسرے صوبوں کے لیے مثال کی

حیثیت رکھتا ہے۔

سیاسی منظر نامہ پر تمام برس سیاسی جماعتیں ایک دوسرے پر بے عملی دھاندلی کے الزام لگاتی نظر آئی۔ لیکن عملی طور پر کسی پارٹی کی جانب سے کوئی قابلِ ذکر کارنامہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ بدلیاتی انتخابات میں ہمیشہ کی طرح دنگل اور بد انتظامی رہی۔ انتخابات کے نتائج کو ہمیشہ کی طرح رد کیا گیا۔ یہاں تک کہ محترمہ بینظیر بھٹو کی برسی پر جیالوں اور پولیس اہلکاروں کی کھانے کی دیگوں پر ہاتھا پائی ہو گئی۔ ملک میں وی آئی پی پرٹوکول کی وجہ ایک ننھی جان، جان کی بازی ہار گئی۔ جسکی پورے ملک میں مذمت کی گئی۔ تمام صوبوں کی عوام صحت عامہ کی ناکافی سہولیات کا شکار رہے۔ تعلیم پر حالیہ سال میں بھی کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ نہ تو سکولوں میں موجود بھوسے کے گوداموں کو ختم کیا گیا اور نہ ہی بلوچستان میں موجود بنا چھت کے سکولوں پر کوئی توجہ دی گئی۔ گذشتہ برس بھی ملک میں افراطِ زر میں اضافہ ہوا اور افراطِ زر کی شرح 2.73 فی صد رہی جبکہ شرح نمو میں کمی واقع ہوئی۔ دسمبر میں منی بجٹ نے عوام کی قوتِ خرید میں مزید کمی کی۔ عالمی سطح پر پیٹرول کی قیمتوں میں کمی کے باوجود ملکِ عزیز میں عوام کو کوئی خاص ریلیف نہیں دیا گیا۔ ڈالر کی وہ قدر جو کہ سال کے آغاز میں اٹھانویں روپے تھی سال کے اختتام پر پھر سے سو روپے سے زائد ہو گئی۔ ٹیلی کام سیکٹر میں ٹیکس کی شرح

میں اضافہ کیا گیا جس کی وجہ سے ٹیلی کام سیکٹر کے منافع میں کمی واقع ہوئی۔ حسبِ سابق حکمرانوں نے بلند و بانگ دعوے کیے لیکن نہ تو وی آئی پی پروکول کو روکا گیا اور نہ ہی سیاست دانوں کی شاہ خرچیوں کو کم کیا گیا۔ ملک کے بجٹ میں ایک بڑا حصہ حکمران طبقہ اور سیاست دانوں کے لیے مختص کیا گیا جبکہ ترقیاتی بجٹ، تعلیم، صحت کا طبقہ بدستور حکمرانوں کی نااہلی کا شکار رہا۔ سرکاری سکول اور سرکاری ہسپتالوں کی حالت زار میں خاطر خواہ بہتری نہیں آئی۔ غریب عوام آج بھی انھی مسائل کا شکار ہیں جن کا وہ ہمیشہ سے شکار رہے۔

اس برس بھی ملک قدرتی آفات کا شکار رہا، زلزلے، سیلاب اور قحط سالی نے ملک کو اپنے پنجوں میں دبوچے رکھا۔ خصوصا ملک میں دوسرا بڑا زلزلہ آیا جس نے ملکی تاریخ میں اگرچہ اتنی زیادہ تباہی نہیں مچائی تاہم بہت سا جانی اور مالی نقصان ضرور ہوا۔ صوبہ سندھ میں تھر کا وہ علاقہ جہاں مور ناچتے تھے وہاں موت کا رقص جاری رہا۔ خطہ ء تھر کے لوگ اپنے بھوک اور پیاس سے بلبلاتے ننھے بچوں، عورتوں کی لاشیں اٹھاتے رہے۔ اسی وقت سندھ فیسٹیول میں منعقد کیا گیا لیکن ان غریبوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ عوامی نمائندوں چاہے وہ صوبائی سطح پر ہوں یا وفاق کی سطح پر کسی نے اس علاقے کی جان کوئی توجہ نہیں کی اور نہ ہی اس علاقے کے لوگوں کا کوئی پرسان حال نہ

ہوا۔

اس برس بھی ملک میں دہشت گردی کا راج رہا۔ کئی بم دھماکوں میں ان گنت معصوم لوگوں کی جانیں ہاتھ سے گئی ۔تاہم کراچی سے خیبر تک ملک میں پاک فوج نے اپنی بہادری کے کارنامے سرانجام دیئے ۔آپریشن ضرب عضب کو کامیابی سے جاری رکھے ہوئے افواجِ پاکستان ملک کو دہشت گردوں سے پاک کرنے کے لیے کوشاں رہی ۔فوج کے دہشت گردوں کے خلاف اس آپریشن کی وجہ سے پچھلے سال میں بم دھماکوں اور دہشت گردی کی کاروائیوں میں کمی ہوئی ۔ فوج کی اعلیٰ ترین قیادت جنرل راحیل شریف عملی اقدامات اور لڑنے والے افسران کے ساتھ خود کمانڈ اینڈ کنٹرول کی بنا پر پاکستانی افواج کے کامیاب ترین جنرل اور پاکستان کی مشہور ترین شخصیت قرار پائے ۔ اس کی دوسری بڑی وجہ جنرل راحیل شریف نے ہر سطح پر پاکستان کے موقف کو موجودہ حکمرانوں کی نسبت بہتر طریقے سے حفاظت کی اور مفادِ پاکستان کو تمام عالم کے سامنے بیان بھی کیا۔مشرقی سرحد پر بھارتی افواج کی جانب سے کی جانے والی دراندازیوں کے ساتھ ساتھ افغانستان سرحد کو بھی محفوظ کیا۔

پہلی بار سندھ خصوصا کراچی میں رینجرز کو اختیارات دیئے گئے اور رینجرز نے ان اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے کراچی میں امن وامان کو بحال کیا اور

پہلی بار کراچی کے عوام نے بہت عرصے بعد بھتہ خوری اور ٹارگٹ کلنگ سے نجات حاصل کی۔ رینجرز نے کم و بیش ہر سیاسی جماعت میں موجود شر پسند عناصر کو گرفتار کرکے کیفرِ کردار تک پہنچایا۔ کراچی میں رینجرز کی تعیناتی کے بعد ٹارگٹ کلنگ میں واضح کمی واقع ہوئی۔

بین اقوامی سطح پر بھی مسلمانوں کی حالت کچھ زیادہ بہتر نہ رہی۔ بیشتر مسلم ممالک دہشت گردی کا شکار نظر آئے۔ داعش ایک ایسی اسلامی جماعت کے طور پر سامنے آئی جو کہ مشرقِ وسطیٰ، شام اور عرب ممالک میں دہشت گردی کی کاروائیوں میں مصروفِ عمل رہی۔ پیرس پر دہشت گردی کے حملوں نے شامی مہاجرین کی مشکلات میں بیش بہا اضافہ کیا۔ نہ صرف یہ بلکہ شام پر مغربی ممالک کی بمباری نے رونما ہونے والی اموات میں اضافہ بھی کیا۔ بھارتی اپنی ازلی ہٹ دھرمی اور پاکستان دشمنی میں پیش پیش رہا۔ بھارتی وزیر دفاع اور بھارتی وزیرِ اعظم پاکستان کے خلاف ہر فورم پر زہر اگلتے رہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بھارت کی جانب سے پاکستان میں دہشت گردی کی غرض سے داعش جیسی تنظیم کو ملوث کرنے اور اس کی مدد کرنے کی کوششیں تمام دنیا کے سامنے بیان کے طور پر پیش کر دی گئی جس کی پاکستان کی جانب سے مذمت بھی کی گئی۔ اس تمام دشمنی کے باوجود بھارتی وزیرِ اعظم ایک نجی دورے پر پاکستانی وزیرِ اعظم کی سالگرہ اور ان کی نواسی کی شادی میں شریک ہونے آن پہنچے، جن کا

پاکستان میں خیر سگالی کے طور پر بہترین استقبال کیا گیا۔

نئے سال میں کا آغاز نئے وعدوں اور نئے دعوؤں سے کیا جاتا ہے لیکن صرف یہ کافی نہیں ہے۔ تاریخ بدلنے کے علاوہ اس نئے سال میں ہمیں خود کو بھی بدلنا ہوگا۔ تہوار منا لینا کافی نہیں۔ ہر شخص کو خود احتسابی کرنا ہوگی اور اس خود احستابی کے بعد خود کو سدھارنا ہوگا۔ جب ہر ایک خود کو سدھار لے گا تو معاشرہ خود بخود سدھر جائے گا۔

چہار سو بہتا لہو مسلماں

اقوامِ عالم پر اگر نظر دوڑائی جائی تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گی کہ مسلمان جہاں جہاں بستے ہیں وہ ممالک کسی نہ کسی مسئلے کا شکار نظر آتے ہیں۔ پوری دنیا میں مسلمان ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ جزیرہ نماء عرب جو کبھی امن و آشتی کا گہوارہ تھا آج وہاں بھی جنگ و جدل جاری ہے۔ پہلے یمن اور شام کا تنازعہ اور اب سعودی عرب اور ایران کا۔ ایران اور سعودی عرب دو بڑے اسلامی ممالک ہیں۔ دونوں میں بسنے والے باشندوں میں ننانوے فی صد مسلمان ہیں اور دونوں ہی ملک عالمِ اسلام کے ستون کی مانند ہیں۔ اگر سعودی عرب کی جانب دیکھا جائے تو مسلمانوں کا قبلہ، روضہ رسول ﷺ، شہرِ مکہ، شہر مدنہ اس ملک کو پورے عالم اسلام تو کیا پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے مقدس بناتے ہیں۔ اس ملک میں سنی مسلمانوں کی اکثریت ہے اور حکومت بھی اہلِ سنت کے پاس ہے۔ اس کے برعکس اگر ایران کی جانب دیکھا جائے تو مسلم دنیا کی ابھرتی ہوئی معیشت جس کے پاس بے بہا قدرتی وسائل خصوصا معدنی تیل کے وسیع ذخائر موجود ہیں اس ملک میں اہلِ تشیعہ مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے، بعض اصحابہ کرامؓ کی قبور کی اس ملک میں موجودگی اس ملک کو فقہ ء جعفریہ کے مسلمانوں کی توجہ کا خصوصی مرکز

بناتی ہیں۔ فرقہ کوئی بھی، دونوں ممالک کے مکین مسلمان، ہیں اور دونوں ہی اسلامی ملک ہیں۔ اگر دونوں کے درمیان کشیدگی جنم لیتی ہے تو نقصان مسلم امہ کا ہے۔ اگر خدا نخواستہ دونوں ممالک آپس میں دست و گریباں ہو جائیں گے تو بہنے والا خون عالمِ اسلام کا ہوگا۔ دونوں ملکوں میں سے جس بھی ملک کو شکست ہوگی وہ مسلمان ہے۔ جس بھی ملک کو معاشی اور معاشرتی نقصان اٹھانا پڑے گا وہ نقصان امتِ مسلمہ کا ہوگا۔ اور اس جنگ، کشیدگی کا فائدہ ان تنظیموں، اسلام دشمن عناصر کو ہوگا۔

حال ہی میں سعودی عرب نے کچھ دہشت گردوں کو ان کے جرم کی پاداش میں پھانسی دی ان دہشت گردوں میں ایک شیعہ عالم بھی شامل تھے۔ جن کا نام نمر الباقی تھا، کی پھانسی نے ایران میں شیعہ مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکا دیا اور مشتعل عوام نے سعودی سفارتخانہ پر حملہ کر دیا۔ اس حملے میں سعودی سفارت خانہ کو آگ لگا دی گئی اور اس کے گارڈ کو مار مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس حملے کے بعد سعودی عرب نے اپنے سفارت خانہ کے عملہ کو واپس بلا لیا اور جواباً ایران کے سفارتی عملہ کو بھی ملک سے نکل جانے کے احکام جاری کیے۔ ایرانی سفارت خانہ کے عملہ کو نکل جانے کے لیے اڑتالیس گھنٹے کا وقت دیا گیا۔ جس نے دونوں ملکوں کے مابین سفارتی تعلقات کو عارضی طور پر منقطع کر دیا ہے۔ سعودی عرب کے ساتھ یکجہتی کے اظہار کے طور پر پہلے سوڈان پھر دیگر

ممالک نے سعودی عرب کے ساتھ سفارتی تعلقات منقطع کر دیئے۔ امریکہ اور برطانیہ ایران کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔ بہت سے ممالک نے ایران کا ساتھ دینے کا اور بہت سے ممالک نے سعودی عرب کا ساتھ دیتے ہوئے ایران سے سفارتی تعلقات ختم کرنے کا عندیہ دیا ہے۔ پوری مسلم امہ واضع طور پر دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ اس کشیدگی سے مسلم امہ کو نقصان اور ان اسلام دشمن تنظیموں کو فائدہ پہنچے گا۔

دونوں ممالک کے دمیان کشیدگی کے بڑھتے ہی شدت پسند تنظیموں کی جانب سے بیانات کے سلسلہ کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہاں حسن نصر اللہ۔ سیکرٹری حزب اللہ لبنان کا بیان ملاحضہ ہو۔ شیخ نمر الباقر کی پھانسی کا بدلہ لیں گے۔ سعودی عرب کو خون میں نہلا دیں گے۔ مدینہ کی گلیاں خون سے سرخ نہ کر دیں تو حزب اللہ چھوڑ دوں گا۔ یہ وہ حزب اللہ ہے جو خود کو مسلمان کہلاتے ہیں اور جن کا کہنا ہے کہ وہ نفاذِ اسلام کے لیے جہاد کر رہے ہیں۔ ایسا شہر جس کی ناموس پورے عالم اسلام کے اہم ہے۔ جو کہ محترم ترین شہر ہے۔ جس کو خود خدا نے امن والا شہر قرار دیا اس کے بارے میں اس طرح کے بیانات صرف اور صرف مسلمانوں کے جذبات کو مزید بھڑکانے کی ایک سازش ہے۔ اس طرح دونوں بڑے فرقے آمنے سامنے آن کھڑے ہوں گے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس عالم دین کو پھانسی کی سزا دی گئی آیا وہ عالم دین تھے بھی یا نہیں ؟ وہ اس جرم میں ملوث تھے یا نہیں ؟پہلی صورت میں دہشت گردوں کو پھانسی کی سزا دینا سعودی عرب کا اندرونی معاملہ ہے ہر ملک کو اپنی سرزمین پر امن وامان قائم کرنے کے لیے حق حاصل ہے کہ وہ مجرموں کو قرار واقعی سزا دے۔ ہر ملک اس معاملے میں آزاد ہے کہ وہ اپنے آئین کے مطابق فیصلے کرے ان فیصلوں کو عالمی سطح پر اچھالا جانا اور مذہبی فرقہ واریت کا رنگ دینا کسی صورت مناسب نہیں ہے۔ یہ فیصلہ کرنا کہ نمر الباقر دہشت گرد تھے یا نہیں یہ سعودی قانون پر منحصر ہے اور سعودی قانوں کے مطابق انھیں اگر سزا دی گئی ہے تو کسی ملک عوام کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ سعودی عرب کے سفارت خانہ پر حملہ کرے۔اگر ایران یا کسی بھی ملک کو اس پھانسی پر شکوک و شبہات تھے تو اسے چاہیے تھا کہ وہ سعودی سفارت کار کو طلب کرکے ملکی سطح پر جرم ثابت کرنے کے لیے ثبوت مانگتے۔دوسری صورت میں اگر وہ دہشت گردی کے جرم میں ملوث تھے اور یہ فیصلہ حق پر کیا گیا تو سعودی عرب از خود کو اس کے ثبوت ایران کو فراہم کرنے چاہیں تاکہ ایران میں لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا کیا جاسکے۔ عالمی سطح پر ایسے تمام حقائق جس میں ثابت ہو کہ وہ عالم دین واقعتاً دہشت گردی یا دہشت گردوں کی مدد میں ملوث ہیں میڈیا کے سامنے لائے جائیں تاکہ دونوں ممالک میں موجود خلیج کو کم کیا جاسکے۔ اگر یہ پھانسی مذہبی یا فرقہ وارانہ بنیادوں پر دی گئی ہے تو یہ قطعاً غلط ہے اور

اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اس صورت میں سعودی عرب کو ایران سے معافی مانگنی چاہیے تاکہ اسلام کے دو بڑے فرقوں کو آپس میں دست و گریبان ہونے سے روکا جاسکے۔ جس طرح بھی ممکن ہو عالم اسلام کو جنگ سے بچانا ہر ملک کی اولین ترجیح ہونی چاہیے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کا اس صورت حال میں موقف کیا ہو؟ یہ انتہائی نازک وقت ہے اور اس نازک وقت میں پاکستان کی وزارتِ خارجہ کی جانب سے کسی قسم کا کوئی بیان سامنے نہیں آیا دو دن بعد پاکستان کے سیکرٹری وازرت خارجہ نے بیان دیا ہے کہ اس معاملے کو اس کی حساسیت کے مطابق دیکھا جارہا ہے۔ وزیرِ اعظم پاکستان اس نازک موقع پر سری لنکا کے دورے پر ہیں۔ ان کی جانب سے بھی کسی قسم کا کوئی بیان نہیں آیا۔ پاکستان کی اعلیٰ قیادت کی یہ خاموشی اس وقت عالم اسلام میں پاکستان کی حیثیت کو مشکوک کر دے گی۔ یہاں یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ پاکستان کی قیادت افواجِ پاکستان یا عوام کوئی نہیں چاہتا کہ وہ ان دونوں ممالک کی آگ میں جھونکے جائیں۔ پاکستان از خود دہشت گردی کی جنگ لڑ رہا ہے جس میں بے بہا جانی اور مالی نقصانات ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ آپریشن ضربِ عضب اور کراچی میں آپریشن جاری ہے۔ اس صورت حال میں افواجِ پاکستان کسی بھی ملک میں جا کر لڑنے سے قاصر ہیں اور ایسا کوئی فیصلہ کرنے سے بھی حکومت کو گریز کرنا ہوگا۔

اس کشیدگی کو مذاکرات اور مصالحت کے ذریعے ختم کیا جانا ضروری ہے اور تمام اختلافات کو مذاکرات کی میز پر حل کیا جانا چاہیے تاکہ دونوں ممالک کے مکین اور ان کی معیشتیں محفوظ رہیں۔ پاکستان کا اس وقت وہ مقام ہے کہ دونوں ہی ممالک میں ثالث کا کردار ادا کر سکتا ہے۔ پاکستان کو دونوں ممالک میں اپنے سفارتی تعلقات کا استعمال کرتے ہوئے اس بڑھتی ہوئی خلیج کو کم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ تاہم اگر کوئی تنظیم یا ملک مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ کو نشانہ بنانے کی کوشش کرے تو اس کو تمام امت مسلمہ کا فرض ہے کہ اس تنظیم یا ملک کو آہنی ہاتھوں سے پکڑا جائے۔

مقاماتِ مقدسہ کا احترام اور حفاظت ہر مسلمان کا اولین فریضہ ہے اور اس فریضہ کی ادائیگی میں تمام امتِ مسلمہ کو یک جان ہونا چاہیے تاکہ کسی میں بھی ان مقامات کی جانب بری نظر سے دیکھنے کی ہمت نہ ہو۔

بھیک ۔۔۔ پیشہ یا حق

اللہ کے نام پی دے دو بابا۔اللہ تمھاری مراد پوری کرے گا۔ بیٹی ! ماں باپ کا صدقہ دے دو خدا تمھارے نصیب اچھے کرے۔اللہ تیرے بچے جیئیں ۔جو دے اس کا بھی بھلا جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔اندھے فقیر کو دیتا جا بابا۔یہ ایسی دعائیں ہیں جو پاکستان کے کسی بھی چوک بھی سے گزرتے ہوئے آپ کو ملیں گی۔یہ وہ لوگ ہیں جن پر ہر شخص ترس کھاتا ہے، جو شخص پریشان ہوتا ہے کسی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے وہ لازمی ان فقیروں کو کچھ نہ کچھ دیتا ہے۔

اگر آپ اسلام آباد سے راولپنڈی کی جانب عازم سفر ہیں تو ایر پورٹ روڈ پر آپ کو فقیروں کی بہتات نظر آئے گی۔اس کے علاوہ راولپنڈی اور دیگر چھوٹے بڑے شہروں میں خصوصا بازاروں، بس اڈوں، لاری اڈوں پر آپ کو جگہ جگہ بھیک مانگنے والے افراد نظر آئیں گے۔بھیک مانگنے والوں میں ہر عمر کے افراد، بچے، بوڑھے، جوان مرد، عورتیں سبھی شامل ہیں۔ان میں سے کوئی اندھا ہے تو کوئی لنگڑا ہے۔کسی کو، کوئی عارضہ لاحق ہے تو کسی کو کوئی۔ان میں سے کچھ تو واقعتا کسی معذوری کا شکار ہوتے ہیں جبکہ اکثر و بیشتر ان بیماریوں کا شکار نہیں ہوتے۔ان میں سے کچھ کو تو اغواء کے بعد اعضاء کاٹ کر سڑکوں

کے کنارے بھیک مانگنے کی غرض سے بیٹھا دیا جاتا ہے اور اس میں ان کی اپنی کوئی مرضی شامل نہیں ہوتی۔ جبکہ کچھ کو کوئی عارضہ لاحق نہیں ہوتا وہ صرف اداکاری کر رہے ہوتے ہیں۔ کسی بھی سفید پوش شخص کے لیے بھیک مانگنا، اپنی عزتِ نفس کا سودا کرنا انتہائی مشکل امر ہے۔ جو عموماحقدار ہوتے ہیں وہ بھیک مانگنے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ ارضِ وطن میں بھیک مانگنے والے غریب نہیں بلکہ بھیک ایک پیشہ کے طور پر رائج ہو چکی ہے۔ پورے پورے خاندان اس پیشہ سے وابسطہ ہیں۔ یہی نہیں ان کے باقاعدہ قبیلے ہیں جہاں ان کا ایک ٹھیکے دار ہوتا ہے جو ایک مخصوص علاقے کے سردار کے طور پر کام کرتا ہے اور اس علاقے میں بھیک مانگنے والوں سے باقاعدہ حصہ وصول کرتا ہے ۔ ٹھیکیدار ایک مضبوط شخصیت کا مالک ہوتا ہے اس کے اپنے خدمات گار ہوتے ہیں جو کہ اس کی حفاظت بھی کرتے ہیں اور اس کا رعب بھی قائم رکھتے ہیں۔ یہ خدمت گار یا نوکر ٹھیکیدار کو حصہ نہ دینے والوں یا حصہ دینے سے گریز کرنے والوں کو سزائیں بھی دیتے ہیں۔ ان قبیلوں میں قانون نام کی کوئی چیز نہیں۔ان قبیلوں میں سزا پانے والوں کی داد رسی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا، نہ ہی یہاں سے کوئی رپورٹ درج کروائی جاتی ہے اور نہ ہی کوئی کورٹ کچہری کے چکر میں پڑھتا ہے اور نہ ہی کوئی ٹھیکیدار کے خلاف آواز اٹھانے کی جسارت کر سکتا ہے۔

ہر قبیلے کا ایک علاقہ مخصوص ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہیں کہ ہر ایک قبیلے نے آپس میں علاقے بانٹ رکھے ہیں اور مخصوص علاقے میں ایک حق کے ساتھ بھیک مانگتے ہیں۔ ایک علاقے کے لوگ (فقیر) دوسرے علاقے میں بھیک نہیں مانگ سکتے۔ ہمارے ملک میں بھیک ایک بہت بڑے شعبے کے طور پر متعارف ہو چکی ہے۔ پاکستان میں ایک بہت بڑی رقم بھیک کے طور پر دی جاتی ہے جو کہ زکوۃ اور ٹیکسوں سے الگ ہے۔ بھیک میں دو روپے سے لے کر سو روپے تک دیئے جاتے ہیں۔ پاکستان میں بھیک مانگنے والوں کی فی کس آمدنی چھ ڈالر یومیہ پاکستانی سات سو روپے تک ہے۔ جبکہ محنت مزدوری یا دفاتر میں کام کرنے والے پڑھے لکھے افراد زیاہ سے زیادہ اوسط پانچ سو سے ایک ہزار رپے تک کما پاتے ہیں۔ یومیہ کمائی جانے والی بھیک میں سے بعض اوقات بیس سے پچاس روپے ٹھیکے دار کو دئے جاتے ہیں جبکہ کبھی کبھار یہ رقم بڑھ کر سو تین سو یا چار سو تک پہنچ جاتی ہے۔ ایک سروے کے مطابق پاکستان میں ستر بلین ڈالر چندہ میں دئے جاتے ہیں۔ بھیک مانگنے والوں کی آمدنی 30 ہزار ماہانہ ہے۔ پڑھے لکھے گریجویٹ افراد کی تنخواہ اوسط بیس سے پچیس ہزار روپیہ ماہانہ ہے جبکہ ایک عام مزدور کی آمدنی زیادہ سے زیادہ 20 ہزار تک ہے۔ ان مزدوروں میں پڑھے لکھے افراد بھی شامل ہیں۔ ملکی بجٹ میں مزدور کی کم سے کم تنخواہ آٹھ ہزار تک مقرر کی گئی جو ایک فقیر یا بھیک مانگنے والے کی آمدنی سے کہیں کم ہے۔

کہا جاتا ہے کسی زمانے میں ایک امیر شخص رہتا تھا اس نے ایک بار سنا کہ اللہ ہر حال میں انسان کو رزق دیتا ہے۔یہ سننا تھا کہ اس کے دل کی حالت بدل گئی اس نے اپنا ہر کام چھوڑا اور ایک جنگل میں نکل گیا۔ وہاں ایک درخت کے نیچے جا بیٹھا۔اب نہ وہ محنت کرتا نہ کام کاج یہاں تک کہ اس کی حالت خراب ہونے لگی۔ایسی حالت میں ایک قافلے کا وہاں سے گزر ہوا وہ اس کو کچھ کھانے پینے کا سامان دے گئے۔ دن اسی طرح گزرتے رہے۔ایک دن اس نے دیکھا کہ ایک کتا ہے جو کہ اپاہج ہے۔ رزق کی تلاش سے قاصر ہے ایک باز اس کے منہ میں ایک گوشت کا ٹکڑا ڈال کر اڑ جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر اس نے سبق حاصل کیا کہ رزق تو اللہ نے دینا ہے تو یہ بہتر ہے کہ دوسروں کو کھلانے والا بنا جائے بنسبت اس کے کہ دوسروں کے ہاتھوں کی جانب دیکھا جائے کہ کوئی ہمارے رزق کا وسیلہ بنے گا۔ پہلے وہ رزق دینے کا وسیلہ تھا اب وہ دوسروں کا محتاج ہے یہ سوچ کر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ واپس اپنا کام کاج شروع کرے گا۔یہ سوچ اسے جنگل سے واپس دنیا میں لے آئی۔یہ واقعہ کہاں تک سچ ہے یہ تو کوئی نہیں جانتا لیکن اس سچائی سے کوئی انکار بھی نہیں کہ خود کما کر کھانے والا اس کی نسبت ہزار گنا بہتر ہے جو دوسروں کی جانب اس امید سے دیکھا جائے کہ کوئی رزق کا وسیلہ بنے گا۔

یہاں نبی پاک ﷺ کی حیات مبارکہ سے ایک واقعہ تحریر کرتی چلوں۔ابن عمر سے

روایت ہے کہ زمانہ نبوت ﷺ میں جب ایک شخص بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا اور کچھ مانگا۔ نبی پاک ﷺ نے عطاء فرمایا۔ جب وہ شخص چلا گیا تو نبی پاک ﷺ نے یوں فرمایا اگر تمھیں پتہ چل جائے کہ مانگنے (بھیک) کا مطلب کیا ہے تو تم میں کوئی کبھی کچھ نہ مانگے ۔ سنن نسائی ۔۲۵۸۶

ایک اور جگہ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ تمھارے لیے یہ بہتر ہے کہ تم لکڑی کا ایک گٹھا اٹھاؤ اور اسے بیچو بنسبت اس کے کہ کسی سے مانگو اور وہ انکار کرے ۔ (بخاری اور مسلم)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ بے شک دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔

اسلام ان لوگوں کی شدت سے مخالفت کرتا ہے جو کہ محنت سے جی چرائیں اور معاشرے کے ایک بے کار رکن کی حیثیت سے زندگی بسر کریں کیونکہ یہ اللہ کی ناشکری میں شمار ہوتا ہے اور توکل کے برخلاف عمل ہے۔ بھیک مانگنے کے لیے انسان کو سب سے پہلے اپنی غیرت کا سودا کرنا پڑھتا ہے جس کی اکوئی مذہب اجازت نہیں دیتا۔ اسلام میں محنت مزدوری کرکے کمانے کو بھیک یا مانگنے کی نسبت پسندیدہ قرار دیا ہے۔ اسلام بھیک ، کاہلی اور بے عملی کو سختی سے

روکتا ہے کیونکہ کسی سے مانگنا انسان کی عزتِ نفس پر ایک ضرب ہے اور مانگنا انسان کی شخصیت کو تباہ کر دیتا ہے۔ اگر بھیک رائج ہو جائے پورے پورے خاندان اس کو پیشہ کے طور پر اپنائیں تو یہ معاشرے میں موجود بے عمل اور کاہل طبقہ بن جاتا ہے جو خود تو محنت مشقت نہیں کرتا بلکہ دوسروں کی محنت کی کمائی کو اپنی زندگی گزارنے کا ذریعہ بنا لیتا ہے اور وہ لوگ جو محنت مزدوری کرکے اپنے بچوں کا پیٹ پالتے ہیں وہ دعا کی خاطر یا بددعاء کے ڈر سے اپنی کمائی کا حصہ ان فقیروں کو لازما دیتے ہیں۔ اس طرح یہ ان لوگوں کا بھی حق مارتے ہیں جو کہ حقیقتاً اس روپے کے حقدار ہیں۔ اسلام ایک جانب تو بھیک کو ناجائز قرار دیتا ہے جبکہ دوسری طرف ااسلام حکم دیتا ہے کہ مخیرّ شخص خود سے غریب، نادار اور بے کس کو کھانا کھلائے اور مانگنے والے کو خالی ہاتھ نہ لوٹائے ۔یعنی اسلام ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینا چاہتا ہے جہاں ہر ایک کی عزتِ نفس محفوظ ہو۔ کسی نادار اور غریب کی یہ نوبت نہ آئے کہ وہ امیر کے پاس کچھ مانگنے کو آئے یا کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ جہاں ہر شخص عزت و آبرو کی زندگی گزارے۔

بھیک ہمارے معاشرے میں ناسور کی طرح پھیلتی جا رہی ہے اس ناسور کے خاتمے کے لیے عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔ حکومت، مخیرّ حضرات یا این جی اوز کو پورے ملک میں ایسے ادارے قائم کرنے چاہئیں جو بھیک مانگنے والوں کو کوئی ہنر

سکھا سکیں اور وظیفہ بھی دیں۔ اس کے علاوہ عوام کو ایسے بھکاریوں کو بھیک دینے سے گریز کرنا چاہیے جو بظاہر تندرست نظر آتے ہوں تاکہ بھیک کو پیشہ کے طور پر نہ اپنایا جا سکے اور اس کی حوصلہ افزائی بھی نہ ہو۔

ناچتے مور اور دم توڑتے لوگ

تھر کا لفظ نیپالی زبان سے نکلا ہے جس کے لفظی معنیمیں بکری نما جانور۔ تھر کے بارے میں مشہور ہے کہ یہاں صرف اور صرف ریت ہے جو کہ غلط ہے۔ تھر کے بارے میں جاننے کے لیے آیئے ! تھر کی سرزمین کا ایک تفصیلی جائزہ لیں۔ یہ دنیا کا سرواں بڑا صحرا ہے جس کا کچھ حصہ بھارت میں ہے جبکہ کچھ حصہ پاکستان میں۔ تھر کا وہ رقبہ جو پاکستان میں واقع ہے وہ ۲۲۰۰ مربع میل پر مشتمل ہے۔ تھر کی سرزمین سندھ اور پنجاب میں واقع ہے۔ یہاں کی آبادی کم و بیش ڈیڑھ کروڑ ہے۔ ۴۰۰۰ سے ۵۰۰۰ ہزار سال پرانی تہذیب کا مالک یہ خطہ اپنی مثال آپ ہے لیکن اس کے بارے میں لوگ اس حد تک نہیں جانتے جس حد تک اس علاقہ کی تہذیب قابلِ تحقیق اور قابلِ ستائش ہے۔۔ یہاں کے لوگوں کی زبان سندھی ہے اور لوگ بے حد ملنسار اور محبت کرنے والے ہیں تھر، برِاعظم ایشیاء کا وہ واحد ایسا صحرا ہے جہاں انسانی آبادی بڑی تعداد میں موجود ہے۔

یہاں کثرت سے پایا جانے والا پودا تھوہر اور ایسے پودے ہیں جس کی بیرونی سطح سخت اور کانٹے دار ہوتی ہے۔ یہ پورے مختلف بیماریوں کے علاج کے طور پر استعمال کیے جا تے ہیں۔ ان کی طب میں ایک خاص حیثیت ہے۔ تھوہر کے علاوہ اس

علاقے میں کانٹے دار جھاڑیاں پائی جاتی ہیں جو انواع واقسام کے جانوروں، کیڑے مکوڑوں کو پناہ دیئے ہوئے ہیں۔ یہاں پائے جانے والے جانوروں میں اونٹ سب سے اہم ہے۔ اس علاقے میں ۱۴۱ نسل کے نایاب پرندے پائے جاتے ہیں جن میں سب سے زیادہ اقسام مور کی ہے۔۔ تھر میں پائے جانے والے مور اپنی خوبصورتی کے اعتبار سے اپنا ثانی نہیں رکھتے۔شام ہوتے ہی یہ مور جھاڑیوں سے نکل آتے ہیں اور علاقے میں گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تھر کو موروں کے ناچنے کی جگہ کے طور پر بھی یاد کیا جاتا ہے۔یہاں کے لوگوں کی گزر بسر کا انحصار ۸۰ فی صد بارش پر ہے۔ زراعت کا شعبہ اس علاقہ میں نہ ہونے کے برابر ہے، جبکہ زیادہ تر آبادی کا انحصار مویشیوں خصوصا بکری، بھیڑ اور اونٹ کی افزائش پر ہے۔

اگر موسموں کا ذکر کیا جائے تو اس علاقے میں موسم گرما سخت ترین اور طویل ہوتا ہے جب درجہ حرارت ۵۰ سے ۵۵ ڈگری سنٹی گریڈ تک جا پہنچتا ہے۔ یہاں موسم سرما شدید نہیں ہوتا۔ موسم گرما تو ایک جانب موسم سرما میں بھی تھر کا درجہ حرارت ۲۵ ڈگری سنٹی گریڈ سے کم نہیں ہوتا۔ موسم سرما یا گرما میں اس علاقہ میں قابلِ ذکر بارش نہیں ہوتی۔ بارش اس علاقیکو صرف مون سون میں سیراب کرتی ہے۔ مون سون میں ہونے والی بارش کا پانی قدرتی طور پر بنے ہوئے تالابوں اور جوہڑوں میں محفوظ ہو جاتا ہے۔اس پانی کو محفوظ کرنے کے لیے

کوئی متبادل ذرائع موجود نہیں یہاں تک کہ تالاب تک پکے نہیں کیے گئے۔ بارش کے پانی کو جمع کرنے کے لیے یہاں قدرتی تالاب اور جوہڑ ہی واحد ذرائع ہیں جن میں جب پانی جمع ہو جاتا ہے تو لوگ اپنے گھروں کے استعمال کے لیے، پینے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ لوگ دور دراز سے پانی کو جمع کرنے کے لیے ان جوہڑوں اور تالابوں کا رخ کرتے ہیں خصوصاً خواتین گھڑے اور گاگریں اٹھا کر پانی بھرنے کے لیے کوسوں دور جاتی ہیں۔ موسم گرما کے آغاز کے ساتھ ہی درجہ حرارت میں اضافہ اس پانی کو بخارات کی صورت میں ہوا میں تحلیل کر دیتا ہے یا ریت اس پانی کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ پانی کی غیر موجودگی نہ صرف انسانی جانوں کے ضیاع کا باعث بنتی ہے بلکہ اس سے پودوں اور جانوروں کی افزائش بھی رک جاتی ہے۔ الغرض یہ علاقہ ہر پچھلے کئی سالوں سے غذائی قلت اور پانی کے بحران کا شکار رہا ہے۔ انھی جوہڑوں اور تالابوں کے پانی سے انسان اور مویشی دونوں ہی سیراب ہوتے ہیں۔ اس پانی کی صفائی کا بھی کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں جس کی جان قحط سالی اور بھوک سے بچ جائے وہ بیماری کا شکار ہو کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

پانی کی ناکافی فراہمی اور صحت کی ناپید سہولیات اس علاقے میں وسیع پیمانے پر ہونے والی اموات کی بنیادی وجہ ہیں۔ پچھلے تین سالوں میں ۱۲ سے کم عمر بچوں کی اموات میں بے تحاشا اضافہ ہوا ہے۔ موسم گرما کی شدت اور طوالت کے

باعث یہ اس علاقہغذائی قلت ، پانی کی کمی کا شکار رہتا ہے ۔آج تک کسی حکومت نے اس علاقے میں پانی کی فراہمی کے نہ تو دوسرے ذرائع مہیا نہیں کیے اور نہ ہی موجودہ پانی کو محفوظ کرنے کے لیے زیرِ زمین کوئی ٹینک یا کارنر بنائے گے ۔ پانی کیبحران کی یہ بنیادی وجہ ہے کہ اس علاقہ میں مون سون کے پانی کو نہ تو صاف کرنے کے کوئی ذرائع موجود ہیں اور نہ ہی محفوظ کرنے کے ۔

پانی کا بحران ہو یا صحت عامہ کے مسائل یہ علاقہ حکمران طبقے کی جانب سے مسلسل بے توجہی کا شکار رہا ہے ۔ اس علاقہ میں صحت کی سہولیات بھی نایاب ہیں ۔ اگر کسی شخص کو کوئی بیماری لاحق ہو جائے تو اسے اسی علاقے کے طبیب سے علاج کروانا ہوتا ہے کیونکہ صحت کی سہولیات اس علاقہ سے کسی کوس دور ہیں ۔ ۲۲۰۰ مربع میل کے رقبہ اور ایک کروڑ آبادی کے لیے دور دور تک کوئی سرکاری ہسپتال موجود نہیں ۔قریب ترین سرکاری ہسپتال بھی تھر سے متصل شہروں میں موجود ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتے ہیں ۔

تھر وہ علاقہ جہاں کل تک مور ناچا کرتے تھے آج وہاں موت کا رقص جاری ہے ۔ موت کے مہیب سائے نہ جانے کتنے ہی سالوں سے اس علاقے کو اپنی لپیٹ میں لیئے ہوئے ہیں ۔ جس کی بنیادی وجہ ہمارے ملک کی حکومتیں ہیں ۔حکومت چاہے صوبائی

ہو یا وفاقی ، جمہوریت ہو یا آمریت اس علاقے کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ یہ ہمارے ملک کا المیہ ہے کہ تھر کا وہ علاقہ جسے اگر توجہ دی جاتی تو پوری دنیا کے سیاحوں کی نگاہوں کا مرکز ہوتا ، آج وہ ہمارے حکمرانوں کی بے توجہی کی وجہ سے موت ، قحط اور بیماری کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ تھر صرف قحط ، بھوک اور موت کی بستی نہیں ، یہ ایک ایسا خطہ ہے جہاں کے لوگ محبت سے گندھے ہیں اور اس زمین کے خدوخال اپنی مثال آپ ہیں ۔ان لوگوں کی بحالی کے لیے چند ایک غیر سرکاری اور پرائیویٹ اداروں کے علاوہ حکومتی سطح پر کسی قسم کی کوئی عملی سرگرمی نظر نہیں آتی ۔اگرچہ ٹاک شوز میں گھنٹوں اس مسئلے پر بحث ہوتی رہی ہے۔ صوبائی حکومت ، وفاق اور وفاق صوبائی حکومت پر الزام دیتا آیا ہے لیکن عملی کوشش کسی نے نہیں کی ۔

المیہ یہ ہے کہ ایک جانب تو ملک میں اربوں ڈالر کی رقوم کے استعمال سے بڑے بڑے ہسپتال ، فلائی اور بنائے جارہے ہیں جبکہ دوسری جانب دم توڑتے ہوئےبچے وفاق ، صوبے ، حکومت اپوزیشن سب کی جانب یہ امید لگائے جان کی بازیاں ہارتے جا رہے ہیں کہ کوئی ان کی جانب توجہ کرے گا۔ ایک صوبے مس بچوں کو پولیو کے قطرے پلائے جارہے ہیں دوسرے صوبے میں طلباء کو مفت لیپ ٹاپ دئے جا رہے ہیں ۔ اسی سندھ کے صوبہ میں سندھ فیسٹیول پر کئی کروڑ روپے لگائے جاتے ہیں۔ بلدیاتی انتخابات میں سیاسی جماعتیں بے بہا پیسہ لٹا دیتی ہیں لیکن ان بے

بس اور لاچار لوگوں کی امداد کرنے کا خیال تک کسی کے ذہن میں نہیں آتا۔ یہ علاقہ بھی ہمارے ہی ملک کا حصہ ہے، یہ ہمارے ہی بچے، ہماری ہی مائیں بہنیں ہیں ہمارے ہی ملک کے جوان ہیں۔ میرا موقف یہ نہیں کہ ملک میں ترقیاتی کام نہ ہوں بلکہ میرا موقف یہ ہے کہ ان ترقیاتی کاموں کے بجٹ کا کچھ حصہ ان جانوں کو بچانے کے لیے، ان پیاس اور بھوک سے سسکتے بلکتے لوگوں کے لیے استعمال کیا جائے۔ اگر حکمران طبقہ، ملک کا مخیّر طبقہ اپنے اخراجات کا کچھ حصہ جان سے ہارتے ہوئے ان بچوں پر لگائیں تو کئی جانیں ضائع ہونے سے بچ سکتی ہیں۔

جنرل راحیل شریف: پاکستان کی تاریخ کا ایک سنہرا دور

جنرل راحیل شریف، پاکستان کی معروف ترین شخصیات میں سے ایک ہیں۔ جنرل راحیل نہ صرف پاکستان بلکہ پوری دنیا کی معروف شخصیات میں ایک واضع مقام رکھتے ہیں جس کی بنیادی وجہ ان کی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ایک واضع اور سخت موقف، پاکستان میں امن و امان کی بہتری کی جانب مائل حالات ہیں۔ جنرل راحیل شریف نے پاکستان کی بری افواج کے ۱۵ ویں چیف آف آرمی سٹاف کی حیثیت سے ۲۰۱۳ء میں اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کا آغاز کیا اور دو سال کی قلیل مدت میں جنرل کیانی کی سرکردگی میں جاری دہشت گردی کے خلاف جنگ کو نہ صرف اگلے مرحلے میں داخل کیا بلکہ اس جنگ میں پاکستان کے موقف کو سختی کے ساتھ واضع کیا
۔

افغانستان اور ہندوستان کی جانب سے بین اقوامی سرحدوں کی خلاف ورزی کو رد کیا اس کے ساتھ ساتھ جنرل راحیل شریف کے دور میں ڈرون حملوں میں واضع کمی ہوئی۔ بطور چیف آف آرمی سٹاف جنرل راحیل نے دوسرے ممالک کے کسی بھی آرمی چیف سے زیادہ دورے کیے جن کی وجہ سے پاکستان کے عالمی سطح پر پاکستان کا امیج بہتر ہوا اور دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات میں بھی بہتری آئی۔ جنرل راحیل کی زیر سرپرستی وانا (شمالی وزیرستان) کا ایک بہت بڑا علاقہ

دہشت گردوں سے پاک کروالیا گیا۔دہشت گردوں کی کمر توڑ دی گئی ۔ جنرل راحیل نے اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے ہمیشہ جوانوں کا حوصلہ بڑھایا اور آپریشن ضرب عصب میں ایک بہترین سپہ سالار کی مانند پہلی صف میں لڑنے والوں کے ساتھ وقت گزارا، چاہے وہ عید کا تہوار ہو یا کوئی اور موقع ، یہ سپہ سالار سرحدوں پر موجود جوانوں کے ساتھ رہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان دو سالوں میں پاک فوج نے وہ کامیابیاں حاصل کی جو کہ عرصہ دراز سے حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے ۔ آپریشن ضربِ عصب کے ساتھ ساتھ کراچی میں رینجرز آپریشن کا آغاز کروایا گیا۔ جس کی بدولت کراچی میں امن و امان کی صورت تحال میں بہت حد تک بہتری آئی ۔ حال ہی میں چیف آف آرمی سٹاف نے کراچی میں امن کی بحالی کو یقینی بنانے کے لیے ہر حد تک جانے کا اعلان کیا ہے ۔ کراچی میں کور ہیڈ کوارٹر میں فوجی قیادت کے اہم اجلاس میں آرمی چیف نے کہا کہ انٹیلی جنس اجنسیوں نے دہشت گردوں کے نیٹ ورک کا سراغ لگا کر انھیں ختم کیا ۔ کراچی میں طویل عرصے کے بعد بھتہ خوری ، ٹارگٹ کلنگ میں واضع کمی ہوئی ۔ پہلی بار کراچی کے عوام نے سکھ کا سانس لیا اور کراچی کی روشنیاں بحال کروا دی گئی ۔

پاک چین اقتصادی راہداری کا آغاز، خیبر ایجنسی میں کرکٹ سٹیڈیم کے افتتاح اور شمالی وزیرستان میں ایک سپورٹس کمپلیکس کا اعلان بھی جنرل راحیل کی

کامیابی کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے۔ جن پر جلد ہی کام شروع کر دیا جائے گا۔

سال ۲۰۱۵ء میں کیئے جانے والے سروے کے مطابق جنرل راحیل دنیا کی مشہور ترین شخصیات میں سے ایک ہے ہیں جبکہ دنیا کے دس مشہور ترین جرنیلوں میں جنرل راحیل کا نمبر پہلا ہے۔ جنرل راحیل نے نہ صرف فوج بلکہ ملک میں موجود تمام سیکیورٹی اداروں کو بہتری کی جانب مائل کیا اور سکیورٹی اداروں کو بہتر بنانے میں ایک کلیدی کردار ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جنرل راحیل کو سال ۲۰۱۵ء کا Man of the year بھی کہا گیا۔ پاکستان میں جنرل راحیل کو اعزاز برائے دس سال خدمت ۔، اعزاز برائے بیس سال خدمت ، اعزاز برائے تیس سال خدمت ، کمانڈر اینڈ سٹاف کالج سینچری اعزاز شامل ہیں ۔ علاوہ ازیں یادگاری اعزاز میں قراردادِ پاکستان تمغہ ، تمغہ ء استقلال ، ہجری تمغہ ، تمغہ جمہوریت ، تمغہ بقاء شامل ہیں ۔ جنرل راحیل صرف پاکستان نہیں بلکہ پوری دنیا میں اپنی بہترین قائدانہ صلاحیتوں کے لیے اپنی مثال آپ ہیں ۔۔ برازیلی حکومت نے خطرات سے نمٹنے کے جرات مندانہ جدوجہد ، اپنی قوم کو امید دلانے ، کثیر الجہتی خطرات سے نمٹنے کے دوران فوج کیعمدہ قیادت کرنے اور شاندار قائدانہ صلاحیتوں کے اعتراف پر برازیل کے اعلیٰ ترین اعزاز آرڈر آف میرٹ سے نوازا گیا۔ چیف آف آرمی سٹاف کو خارجہ اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ جس میں ۔

اعزاز برائے فوج میں میرٹ (ریاستِ ہائے متحدہ امریکہ) آرڈر آف عبدالعزیز آل سعود بھی دیا گیا۔

جنرل راحیل نے اپنی مدت ملازمت کے دو سالوں میں انتہائی بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ اس تمام عرصہ میں ان پر بہت زیادہ دباؤ بھی آیا کہ وہ جمہوری حکومت کو ختم کرکے ملک کی باگ دوڑ سنبھالیں لیکن انھوں نے اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داریوں سے انحراف نہ کیا۔ نہ تو حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی اور نہ ہی ملک میں حکومت کی۔

پاکستان میں بری افواج کے سربراہ کی ایک طاقت ہوتی ہے اور جنرل راحیل اس لیے بھی مضبوط ہیں کہ وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں بہت حد تک کامیاب رہے۔ یہ کہنا تھا حسن عسکری رضوی کا جو کہ ایک دفاعی تجزیہ کار ہیں۔

جنرل راحیل کی مدتِ ملازمت اختتام پذیر ہونے ہی کو ہے۔ ملازم ت کے اختتام پر ایک اہم سوال یہ اٹھتا ہے کہ ان کی ملازمت میں توسیع کی جائے گی یا پھر وہ مقررہ وقت پر ریٹائر ہو جائیں گے ؟ بہت سے سیاسی حلقے اور دفاعی تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ جنرل راحیل کی مدتِ ملازمت میں توسیع ہونا چاہیے کیونکہ ان کی سربراہی میں افواجَ پاکستان نے واضع کامیابیاں حاصل کی ہیں

۔جو آپریشن ان کی سربراہی میں شروع ہوئے انھیں بھی پائے تکمیل تک پہنچانا چاہیے ۔عوام کے دلوں میں ان کے لیے بے پناہ عزت اور احترام موجود ہے۔ بعض حلقوں کا کہنا ہے کہ جنرل راحیل کی مدت ملازمت میں توسیع نہیں کی جانی چاہیے ۔اس بحث سے قطع نظر آئی ایس پی آر نے ان تمام خبروں کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے
جنرل راحیل کی مدتِ ملازمت میں توسیع کی خبریں بے بنیاد ہیں۔
جنرل راحیل کا پاکستان فوج کی کتاب کا ایک سنہری باب ہیں جس کا آغاز ۱۶ جولائی ۱۹۵۶ء کو کوئٹہ کے ممتاز فوجی گھرانے میں ان کی پیدائش سے ہوا۔ والد میجر محمد شریف، ان کے بڑے بھائی میجر شبیر شریف ۱۹۷۱ء کی جنگ میں شہید ہوئے اور انھیں پاکستان کے اعلیٰ ترین اعزاز نشانِ حیدر سے نوازا گیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد پاکستان ملٹری آکیڈمی میں داخل ہوئے۔ اکیڈمی کے ۵۴ لانگ کورس سے فارغ التحصیل ہوئے۔ ۱۹۷۶ء میں فرنٹیئر فورس کی سولیوں بٹالین میں کمشن حاصل کیا اور بطور چیف آف آرمی سٹاف ۲۰۱۳ء میں اپنے فرائض کا آغاز کیا۔
جنرل راحیل کے بطور چیف آف آرمی سٹاف یہ دو سال قوم کے لیے کسی بھی تحفہ سے کم نہیں۔

ریاست کے فرائض

کسی بھی ریاست یا ملک کی کامیاب معیشت کے لیے ضروری ہے کہ اس ریاست یا ملک میں امن و امان کی صورت حال اور قانون کی بالا دستی عام ہو۔ ملک میں امیر غریب طاقت ور، کمزور کے لیے یکساں قانون رائج ہو جہاں کوئی طاقت ور، اپنی طاقت کی، وجہ سے قانون کی گرفت سے باہر نہ ہو۔ کیونکہ اگر قانون، امیر غریب، طاقت ور، کمزور کے لیے الگ الگ ہو گا تو اس ملک میں طاقت ور اور امیر کے لیے جرائم کا راستہ کھلا رہے گا اور وہ ایک بے لگام ہاتھی کی مانند اپنی راہ میں آنے والوں کو کچلتے چلے جائیں گے حضرت عمر فاروقؓ کا قول ہے کہ جو ریاست مجرموں پر رحم کرتی ہے وہاں کے لوگ بڑی بے رحمی سے مرتے ہیں۔ (کنزالعمال ۱۳۸ حیات الصحابہ ۱۵۴۵)

حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں اسلامی سلطنت کئی سو ایکڑ رقبہ پر محیط تھی اور انصاف کا یہ عالم تھا کہ جنگل میں کسی بھیڑیے کو بھی یہ جرات نہ تھی کہ کسی بھیڑ پر حملہ کر سکے۔ مورخین نے حضرت عمرؓ کی وفات پر ایک شخص جنگل میں آہ و بقاء کرنے لگا کہ آج خلیفہء وقت اس دنیا میں نہیں رہے لوگوں نے جب استفسار کیا کہ وہ یہ بات کس طرح کہہ سکتا ہے تو اس نے کہا کہ

آج اس کی ایک بکری کو بھیڑیا شکار کرکے لے گیا ہے جب تک حضرت عمراس دنیا میں تھے کسی بھیڑیے میں یہ جرات نہیں تھی ۔ یہی عمر فاروقؓ ایسے بادشاہ تھے جن کا کہنا تھا کہ اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی مرتا ہے تو عمرؓ اس کے لیے جوابدہ ہیں ۔

اسلام وہ مذہب ہے جس میں انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جب ایک عورت چوری کے جرم میں بادشاہء دنیا ودیں نبی محترم حضرت محمد ﷺ کے حضور پیش کی جاتی ہے ، قریش کے لوگ اس کی سفارش کرتے ہیں تو ارشاد کچھ یوں ہوتا ہے ۔

اگر اس عورت کی بجائے ، میری بیٹی فاطمہؓ بھی ہوتی تو میں ان کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیتا۔

اب ایک نظر ڈالتے ہیں اسلامی جمہوریہ پاکستانپر جس کے قانون اور معاشرے کو اسلام کے مطابق ہونا چاہیے تھا وہاں کے حکمران ہی ملزموں کو بچانے کی خاطر میدان عمل میں رہتے ہیں جہاں جرم کرنے والا انصاف فراہم کرنے والوں کی پشت پناہی میں ہوتا ہے ۔ یہاں راہنما ہی رہزن بن بیٹھے ہیں ۔ حکمرانوں ہی کے بھتیجے ، رشتہ دار ، یا کسی سیاسی پارٹی کے کارکن بے گناہوں کی بے دردی سے جان لے لیتے ہیں اور کوئی سزا نہیں پاتے ۔ ہمارے ، ملک میں امن وامان کے حالات دن بدن ناگفتہ بہ ہوتے جارہے ہیں یہی وجہ ہے کہ یہاں بے گناہ بے

رحمی سے مرتے ہیں کیونکہ مجرموں کو بچایا جاتا ہے۔ارضِ وطن میں مجرموں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا بلکہ انھیں ایک اہم مقام دیا جاتا ہے۔آیئے ! پچھلے برس کے کچھ نامی گرامی مجرموں پر نظر ڈالیں۔ یہ ایسے مجرم ہیں جن کا جرم ثابت ہوا اور انھیں وی آئی پی پروٹوکول ملا۔ چاہے وہ ماڈل ایمان علی ہو جس کے تمام جرائم ثابت ہو چکے ہوں، اس کے باوجود جب اسے رہا کیا جاتا ہے اور ایک اعلیٰ تعلیمی ادارے میں اسے لیکچر کے لیے مدعو کرے تو کیا یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اس قابل ہے کہ طالب علموں کو پڑھا سکے ؟ نہیں بلکہ یہ ہمارے معاشرے کی کمزوری ہے، چاہے وہ شاہ رخ جتوئی ہو جس پر قتل کا جرم ثابت ہو چکا ہو اور اسے کم عمر قرار دے کر رہا کر دیا جائے۔ صرف اور صرف اس لیے کہ وہ ایک سیاسی کارکن کا بیٹا تھا اور اس کا باپ ایک حیثیت کا مالک تھا اور مقتول ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا فرد تھا اور مقتول کے لواحقین کمزور تھے ، اس قابل نہ تھے کہ قاتل کے خلاف لڑ سکیں۔پھر یہ بھی ہوا کہ چیف جسٹس کا بیٹا غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہوا ، بہت دنوں تک بہت سے ثبوت اس کے خلاف پیش کیے گئے ، کئی تجزیے کیے گئے لیکن اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکا کیونکہ اس کا باپ ایک طاقت ور شخص تھا۔ سانحہ بدلیہ ٹاؤن ہو، یا کراچی کی کسی فیکٹری کو، اس وقت جلا دیا جائے جب اس میں نہ جانے کتنے ہی گھروں کے واحد کفیل مزدوری کر رہے ہوں ۔ صرف اس لیے کہ اس فیکٹری کے مالک نے بھتہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان سانحوں پر گھنٹوں بحث کی جاتی

ہے ، کئی کئی دن تک یہ لوگ میڈیا کی خبروں کی زینت بنے رہتے ہیں ، پھر آہستہ آہستہ یہ خبر پرانی ہو جاتی ہے اور بالاآخر اس پر گرد پڑنے لگتی ہے ۔ کسی بھی ملزم کو قرار واقع سزا نہیں دی جاتی ۔ کوئی طاقت ور شخص قانون کی گرفت میں نہیں آتا ۔ سیاسی جماعتو ں کے نمائندے ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں ، ایک دوسرے کو.برا بھلا کہا جاتا ہے اور اس بحث میں اصل مسئلہ دب کر رہ جاتا ہے ۔اگر کسی عام آدمی سے کوئی جرم ہو جائے تو اسے سالوں اس جرم کی سزا بھگتنا پڑتی ہے اس کے.برعکس سیاست دانوں کے بچے چاہے کسی کا قتل کر دیں وہ آسانی سے.بری الزمہ ہو جاتے ہیں ۔ ملک میں تیزی سے پھیلتی بدامنی کی.بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ بدامنی پھیلانے والوں کو وڈیروں ، سیاسی کارکنوں ، کسی ایم این اے، کسی ایم پی اے کی پشت پناہی حاصل رہی ہے اور وہ جانتے ہیں کہ اگر ان کا جرم ثابت بھی ہو جائے گا تو ان کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں جرائم کی سطح مسلسل بلند ہو رہی ہے ۔اگر اعداد وشمار کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ملک میں جرائم کی سطح بلند ہوئی ہے ۔ تمام صوبائی دار لحکومت میں پچھلے ایک ماہ میں ہونے والے جرائم کے واقعات کے اعداد و شمار کچھ یوں رہے 549 سٹریٹ کرائم 520 کار چوری کے واقعات 227 حادثات 212 چوری اور ڈاکہ کی وارداتیں 194 شہری قتل ہوئے جن میں سے کراچی میں ہونے والے جرائم کی تعداد 932 لاہور میں 694 پشاور میں 69 جبکہ کوئٹہ میں ہونے واقعات کی کل تعداد 57 رہی ۔ سال

کا اگر جائزہ لیا جائے تو اعداد و شمار رونگٹے کھڑے کر دینے کو کافی ہیں۔ سال میں کل 329 عورتیں اور بے گناہ بچیاں گینگ ریپ کا شکار ہوئیں جبکہ 13276 کا قتل ہوا ریپ ہونے والی عورتوں کی تعداد 3285 رہی۔ 81520 ڈاکے اور چوری کی وارداتیں ہوئیں جبکہ کار اور موٹر سائیکل چوری کی وارداتوں کی تعداد 33243 رہی ۔ یہ وہ اعداد و شمار ہیں جو تھانوں میں رپورٹ کئے گئے یا جن پر پولیس نے کچھ نہ کچھ کام کیا۔ ایسے نہ جانے کتنے ہی ان گنت واقعات ایسے ہیں جن کی کوئی رپورٹ درج نہیں کروائی گئی اور نہ ہی ان پر پولیس نے کوئی کام کیا۔ ایسے لوگ جو کسی وڈیرے یا کسی سیاسی کارکن یا کسی طاقتور شخص کے ظلم کا شکار ہوئے انھوں نے کہیں کوئی رپورٹ درج نہیں کروائی۔ اس کی وجہ ان میں جرات کی کمی نہیں بلکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ وہ ان طاقتور افراد کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے الٹا اگر وہ ان کا نام پولیس میں لیں گے تو پولیس انھی کے اہلِ خانہ کو تنگ کرے گی۔

اب دیکھیئے! تصویر کا دوسرا رخ اگر کوئی بھوک سے نڈھال شخص چوری کر لے یا کسی پر چوری کا الزام لگا دیا جائے تو شک کی بنیاد اس کو مار مار کر لہولہان کر دیا جاتا ہے۔ اس غریب شخصکا جرم ثابت ہونا بھی ضروری نہیں بلکہ اس شخص پر جرم عائد ہونے کا وقت نہیں دیا جاتا۔ لوگ اس حد تک قانون کی بے اعتدالیوں سے تنگ آ چکے ہیں کہ وہ مجرم کو خود سزا دینے کے درپے ہو جاتے

ہیں۔ کیونکہ ہمارے ملک میں وہ جانتے ہیں کہ قانون کسی مجرم کو سزا نہیں دے گا۔
ایسے واقعات بھی تواتر سے خبروں کی زینت بنتے رہتے ہیں کہ لوگوں نے کسی بے گناہ کو صرف شک کی بنیاد پر بے تحاشا پیٹ ڈالا۔ یہاں تک کہ بعض لوگ ان واقعات میں جان تک کی بازی ہار گئے۔ یہ ہمارے معاشرے میں بڑھتے ہوئے اس انتشار کی نشاندہی ہے جو کہ قانون، پولیس پر عدم اعتماد کی غماز ہے۔
کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی بھوک مٹانے کے لیے چوری کرے تو ہاتھ چور کا نہیں بلکہ گلہ اس ریاست کے حکمران کا کاٹا جانا چاہیے۔ کیونکہ یہ حکمران ہی ہیں جو اس معاشرے میں امن وامان، غریبوں کی بھوک مٹانے، انصاف کی فراہمی کے ذمہ دار ہیں اور یہ ذمہ داری وہ اس وقت پوری کر سکنے کی اہلیت رکھتے ہیں جب قانون ہر ایک کے لیے ایک سا ہو جب کوئی شاہ رخ جتوئی، کوئی ایمان علی قانون کی گرفت اور سزا سے نہ بچ سکے۔

جمہوریت یا وراثت

پاکستان جب معرضِ وجود میں آیا تو اس ملک کے آئین میں پاکستان کو ایک جمہوری مملکت قرار دیا گیا۔ آئین میں یہ قرار پایا کہ ملک میں پارلیمانی نظام رائج ہو گا حکومت کسی ایک شخص کی بجائے پوری پارلیمنٹ کے پاس ہو گی اللہ کو مطلق العین قرار دیا گیا ۔اس مملکت کے نام اور آئین کے مطابق یہاں جمہوریت کا دور دورہ ہو گا۔ لیکن آغازِ سفر سے ہی جمہوریت اس ملک میں کامیاب نہیں ہو سکی ۔آزادی کے حصول اور قائداعظم کے انتقال کے بعد ملکی سیاست میں ایک بہت بڑا خلاء پیدا ہو گیا اور حکومت حاصل کرنے کی خاطر سیاسی قتل کیۓ جانے لگے ۔ان قتلوں میں محترمہ فاطمہ جناح اور لیاقت علی خان جیسے عظیم راہنما تک شامل تھے۔ جمہوریت کی کمزوری کی وجہ سے 1958 میں پہلی بار فوج نے مارشل لاء لگا کر ملک کے انتظامی امور سنبھال لیے ۔جمہوری حکومتوں کی ناقص کارکردگی کی وجہ سے کوئی حکومت تین یا چار سال سے زیادہ نہ چل سکی ۔سیاسی عدم استحکام کی وجہ سے ملک میں تین بار بالترتیب 1958,1977,1999 میں ایوب خان ، ضیاء الحق اور پرویز مشرف ہیں مارشل لاء لگایا اور پارلیمانی حکومت کو ختم کرکے ملک کے انتظامی امور سنبھالے ۔2013 تک پاکستان میں کسی ایک سیاسی حکومت نے بھی اپنا مقررہ وقت مکمل نہیں کیا تھا۔اور نہ ہی ملکی انتظام ایک سیاسی حکومت سے دوسری تک منتقل ہو پایا۔

اس کی بنیادی وجہ سیاست دانوں کی نااہلی تھی ۔

جہاں ملک میں چھوٹی بڑی سیاسی جماعتیں سیاست میں مصروفِ عمل ہیں وہاں چند برس پہلے تک ملک میں بنیادی طور پر دو جماعتیں تھیں ۔ ایک مسلم لیگ ایک پیپلز پارٹی ۔ یہی جماعتیں بالترتیب حکومت اور اپوزیشن میں رہی ۔ صوبائی سطح پر ہر صوبے میں کسی ایک جماعت کو اکثریت حاصل ہے لیکن بنیادی طور پر ملک کے دو بڑے صوبوں میں مسلم لیگ (نواز گروپ) اور پیپلز پارٹی (پارلیمنٹیرنز) کی اکثریت ہے ۔ جبکہ حالیہ انتخابات میں صوبہ خیبر پختونخواہ میں تحریک انصاف کو اکثریت حاصل ہوئی ۔ اس کے علاوہ سندھ میں ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کی حکومت رہی ۔ ان تینوں جماعتوں میں سیاسی راہنما نسل در نسل ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ملک میں پہلی بڑی سیاسی جماعت پیپلز پارٹی کی مثال لیں ۔ 1970 ء کی دہائی کے بعد معرض وجود میں آنے والی یہ پارٹی جس کو بنانے والے ذوالفقار علی بھٹو تھے ۔ انھوں نے اس پارٹی کی بنیاد روٹی کپڑا اور مکان کے بنیادی حقوق کی فراہمی پر رکھی ۔ ان کی کامیابی اور پیپلز پارٹی کی سندھ میں مقبولیت کے بعد سے آج تک پیپلز پارٹی کی سیاسی قیادت بھٹو خاندان ، زرداری خاندان یا اس خاندان کے رشتہ داروں تک محدود رہی اور آج تک بھٹو خاندان تک ہی محدود ہے ۔ ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دیئے جانے کے بعد اس پارٹی کی قیادت ان کی بیٹی محترمہ بینظیر بھٹو نے سنبھالی ، ان کے قتل کے بعد یہ قیادت آج کل بینظیر بھٹو کے صاحبزادے بلاول بھٹو کے پاس ہے جبکہ بینظیر

بھٹو کے شوہر آصف علی زرداری کرپٹ ترین سیاست دان ہونے کے باوجود پانچ برس تک اس ملک کے صدر کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں ۔ اس پارٹی کے کارکن چاہے کتنی ہی قربانیاں کیوں نہ دیں پارٹی قیادت اور پارٹی کے اعلیٰ عہدے اسی خاندان تک محدود رہیں گے ۔ صرف پیپلز پارٹی ہی نہیں ملک کی دوسری بڑی جماعت مسلم لیگ کی بھی کچھ یہی صورت حال ہے مسلم لیگ کی قیادت میاں خاندان کے پاس ہے اور حال میں مسلم لیگ کے میاں نواز شریف ملک کے وزیر اعظم جبکہ انھی کے بھائی میاں شہباز شریف صوبہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ ہیں ۔ جبکہ ان کے بھتیجے حمزہ شہباز شریف اور بیٹی مریم نواز بھی سیاست میں آچکے ہیں ۔ گویا بلاول بھٹو زرداری جن کو پاکستان کی سیاست تو درکنار پاکستان کی معاشرتی اقدار تک کے بارے میں آگاہی نہیں ۔ حمزہ شہباز شریف یا مریم نواز ،آنے والے وقت میں ان پارٹیوں کی قیادت سنبھالیں گے ۔ ان کے علاوہ کسی میں صلاحیت ہو یا نہ ہو ، کوئی کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو ،وہ پارٹی کی قیادت نہیں سنبھال سکتا۔ کیونکہ ہمارے یہاں سیاست اور قیادت بھی موروثی جائیداد کے طرح اگلی نسلوں کو منتقل ہوتی ہے اور اس منتقلی میں خاندان کے علاوہ کسی کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

تیسری سیاسی پارٹی جو کہ سندھ اور خصوصا کراچی میں متحدہ قومی موومنٹ ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس سیاسی جماعت کی بنیاد الطاف حسین نے رکھی جو کہ ایک

طویل عرصے سے خود ساختہ جلا وطنی کاٹ رہے ہیں۔ ان کی تقاریر، کارکنوں سے خطابات تمام ہی وڈیو کانفرس کے ذریعے اور رابطہ کمیٹی کے ذریعے ہوتے رہے ہیں۔ اس جماعت کے لیڈر کے خاندان سے فی الحال کوئی بھی سیاسی میدان میں نظر نہیں آیا تاہم یہ جماعت کراچی میں اپنا ایک اثر و رسوخ رکھتی ہے اور زیادہ تر انتخابات میں واضع اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب رہتی ہے۔ اگرچہ اس جماعت کے نمائندے تقریبا تمام ملک کے الیکشن میں حصہ لیتے ہیں تاہم، باقی تین صوبوں میں اس جماعت کو خاظر خواہ سیٹیں نہیں مل پاتی۔

1996ء میں تحریک انصاف کے قیام کے بعد یہ پارٹی پاکستانی سیاست میں ایک تیسری قوت بن کر ابھری۔ اور اس وقت یہ پارٹی ملکی سیاست میں تیسری بڑی پارٹی ہے ۔حالیہ الیکشنز میں تحریک انصاف ملک کی تیسری بڑی سیاسی پارٹی کے طور پر ابھری ہے جو کہ صوبہ خیبر پختونخواہ میں اپنی حکومت بنانے میں کامیاب ہو پائی۔ تحریک انصاف کی قیادت عمران خان کا کہنا تھا کہ وہ پرانے سیاست دانوں کو اس پارٹی میں جگہ نہیں دیں گے لیکن وہ بھی اپنے وعدے پر پورے نہیں اتر پائے۔ اس پارٹی میں بھی وہ سیاست دان جن کے باپ دادا سے سیاست انھیں منتقل ہوئی نہ صرف شامل ہوئے بلکہ اس پارٹی کے اعلی عہدوں پر بھی فائز ہیں۔ ان سیاست دانوں میں شاہ محمود قریشی وائس چیئر مین، جہانگیر ترین سیکریٹری جنرل اور شیرین مزاری شامل ہیں۔ یہ وہ سیاست دان ہیں

جو کہ مسلم لیگ ، پیپلز پارٹی کو چھوڑ کر ابھرتی ہوئی اس تیسری سیاسی قوت کے ساتھ شامل ہوئے۔ان پرانے سیاست دانوں کی تحریک انصاف میں شمولیت اس بات کی گواہی ہے کہ بنیادی طور پر ہمارے ملک کی سیاست چند ہی لوگوں ، چند ہی خاندانوں کے ہاتھوں میں اور آنے والے وقتوں میں بھی اس ڈھانچے میں کوئی خاص تبدیلی آنے کی توقع کرنا عبث ہے ۔ اس سیاسی جماعت کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس جماعت میں جماعتی بنیادوں پر بھی الیکشن کروائے جاتے ہیں ۔ صوبہ خیبر پختونخواہ کے علاوہ یہ جماعت کسی صوبے میں اس حد تک کامیاب نہیں رہ سکی جس حد تک اس جماعت کے لیڈر کی شہرت تھی اور کسی حد تک انھیں امید بھی تھی ۔اگرچہ انتخابات میں اس جماعت نے بہت حد تک اشتہارات وغیرہ میں پیسہ بھی لگایا تاہم اس جماعت کی کامیابی کا گراف محدود رہا۔

اگر پوری ملکی سیاست کا جائزہ لیا جائے تو یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ آج پاکستان کی سیاست پر وڈیروں ، جاگیرداروں ، نسل در نسل حکمرانی کرنے والے سیاست دانوں کا راج ہے ۔ سرمایہ دار سیاست دان بن چکے ہیں ۔ اس ملک کی سیاست چند ہی ہاتھوں میں ہے ، کچھ خاندان چاہے وہ اس ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کے قابل ہوں یا نہیں ۔ جب آئین میں شک پاس ہوئی کہ ملکی سیاست ان کے ہاتھ میں آئے گی جن کے پاس گریجویشن کی ڈگری ہو گی تو انھی سیاست دانوں نے جعلی ڈگریاں کورٹ میں پیش کر دی اور ان جعلی ڈگریوں کی بنیاد پر ان

سیاست دانوں نے ملکی حکومت میں اپنا حصہ ڈالا۔

پاکستان میں بسنے والی آبادی کا دو فی صد حصہ بقایا اٹھانویں فی صد کے ادا کئے گئے ٹیکس پر عیاشی کرتا نظر آتا ہے۔ پچھلے دس سالوں میں ملکی ترقی کی شرح نمو دس فی صد سے کم ہے جو اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ ملک میں موجود حکمرانوں نے ملک کا پیسہ اپنے اکاؤنٹس میں جمع کر رکھا اور یہ وہ طبقہ جو نہ صرف ٹیکس نہیں دیتا بلکہ ملکی کا ایک.بڑا حصہ اپنے اکاؤنٹس میں منتقل کرتا رہتا ہے۔ یہ ملک کی وہ اشرافیہ ہے جو تمام تر کرپشن کی ذمہ دار ہے

پانامہ لیکس اور پاکستانی حکمران

آج کل ساری دنیا میں پانامہ لیکس نے سیاسی فضاء کو متغیر کر رکھا ہے۔ کچھ ممالک کے وزراء، اعلیٰ سطحی حکام، ارکانِ پارلیمنٹ نے ان پیپرز کی اشاعت کے بعد استعفیٰ دے دیا ہے اور بعض کے خلاف مظاہرے جاری ہیں۔

اس تمام تر اشاعت پر بات کرنے سے پہلے ہمیں یہ جاننا ہوگا کہ پانامہ لیکس یا پانامہ پیپرز دراصل ہے کیا؟ پانامہ پیپرز یا پانامہ لیکس دراصل گیارہ اشارعہ پانچ میلین خفیہ دستاویزات پر مشتمل ہیں جن میں 214,000 آف شور کمپینیوں کے شیئر ہورڈرز، مالکان اور ڈیرکٹرز کی تفصیل موجود ہے۔ دراصل یہ تمام دستاویزات ایک گمنام شخص جان ڈو نے جرمنی کے ایک اخبار Suddeutsche Zeitung 2015 کو میں بھیجے اس اخبار کے لیے یہ ایک بہت بڑی خبر تھی لیکن اس اخبار نے پاکستانی اشاعتی اداروں کی مانند بنا تحقیق کے اس خبر کو اقوامِ عالم کے سامنے نہیں رکھا بلکہ ان تمام دستاویزات کی تصدیق کے لیئے اس اخبار نے International consortium of investigative Journalists (ICIJ) سے مدد مانگی جو کہ عالمی طور پر مشہور ترین صحافیوں کی اعلیٰ پائے کی تنظم ہے۔ اس تنظیم نے تمام دستاویزات کو تحقیق اور تجزیہ کے لیے چار سو صحافیوں اور

ایک سو سات تشہراتی اداروں میں (جو کہ چھہتر ممالک میں قائم ہیں) میں تقسیم کئے گئے

کا دعویٰ ICIJ۔ پہلی نیوز رپورٹ جو ان پیپرز پر مشتمل تھی تین اپریل کو شائع ہوئی۔ ہے کہ تمام ممالک میں موجود آف شور کمپنیوں کی مکمل تفصیل مئی تک شائع کر دے گی۔

یہاں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ آف شور کمپنیوں کی حقیقت کیا ہے؟ آف شور دراصل کمپنیاں ہیں جو کہ کسی بھی بیرون ممالک بنائی جاتی ہیں اور ان کی مالکیت اور شیئرز کو خفیہ رکھا جاتا ہے۔ ان کمپنیوں کے مالکان کا اس ملک میں جہاں یہ کمپنی بنائی جاتی ہے آنا جانا کم ہوتا ہے اور عموماً یہ کمپنیاں عام کمپنیوں کی طرح کام کرتی ہیں قانونی طور پر یہ کمپنیاں غیر قانونی نہیں ہیں کیونکہ یہ باقاعدہ رجسٹرڈ کمپنیاں ہیں سوائے چند ایک کے۔ ان کمپنیوں کی باقاعدہ رجسٹریشن ہوتی ہے اور یہ تمام کمپنیوں کی طرح اپنے شیئرز بھی لانچ کر سکتی ہیں۔ آف شور کمپنی بنانے کے لیےباقاعدہ قانونی کاروائی کی جاتی ہے جس کی بناء پر یہ کمپنیاں غیر قانونی قرار نہیں دی جا سکتی۔ یہ کمپنیاں کالے دھن کو قانونی بنانے کا ایک ذریعہ بھی ہیں۔ پانامہ پیپرز یا پانامہ لیکس میں وہ تمام تر ثبوت، دستاویزات کے ساتھ موجود ہیں جن میں حکمرانوں، سیاست دانوں، اداروں کے سربراہوں، کے نام ہیں جنھوں نے اپنے ان آف شور کمپنیوں میں اپنا پیسہ لگایا اور ان کو عوام کی نظروں سے اوجھل رکھا گیا۔

جس وقت یہ پیپرز شائع ہوئے ان میں پانچ ممالک کے ایسے سربراہاں جنھوں نے اپنے اثاثاجات آف شور کمپنیوں میں لگائے کے نام سرفہرست تھے۔ان ممالک میں ارجنٹینا، آئیس لینڈ، سعودی عرب، یوکرائین، متحدہ عرب امارات کے حکمرانوں، ان کے قریبی رشتہ داروں، اعلیٰ سطحی سرکاری افسران کے نام شامل تھے۔ ان پانچ ممالک کے علاوہ چالیس ممالک کے افسران، حکمران اور سیاست دان جنھوں نے آف شور کمپنیوں میں رقوم لگائی ان کے اثاثوں کی تفصیلات شائع کی گئی۔

یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ یہ آف شور کمپنیاں کس جگہ پر بنائی گئی اور کس ملک نے ان کمپنیوں کے بنائے جانے سے فوائد بھی حاصل کیئیے۔ واضع رہے کہ یہ آف شور کمپنیاں اس ملک سے کہیں دور کسی اور ملک میں بنائی جاتی ہیں جہاں ان کے مالکان رہتے ہیں۔یہ کمپنیاں زیادہ تر برطانیہ کے جزائر میں بنائی گئی جبکہ زیادہ تر بینک، قانونی مشاورتی ادارے اور افراد جن کے ذریعے رقوم ان کمپنیوں میں منتقل کی گئی یا جن کے ذریعے ان کمپنیوں کے شیئرز خریدے گئے ان میں سے زیادہ تر کا تعلق ہانگ کانگ سے ہے۔

پانامہ پیپرز کے شائع ہونے کے بعد جہاں بہت سے ممالک کے حکمرانوں، اعلیٰ سطح کے افسران کے آف شور کمپنیوں میں اثاثوں کی تفصیلات دنیا کی نظروں کے

سامنے آئی ہیں وہاں وطنِ عزیز کے حکمران خاندان اور خصوصا وزیر اعظم پاکستان کے اثاثاجات کی تفصیلات بھی دنیا کے سامنے لا رکھی گئی ہیں ۔افسوس کی بات یہ ہے کہ نہ صرف وزیر اعظم بلکہ کئی افسران پر بھی کرپشن کے ذریعے کمائی گئی رقوم کو آف شور کمپنیوں کے شیئرز خرید کر ناجائز کمائی کو جائز میں تبدیل کیا۔ان دستاویزات کا مالیاتی پہلو اگر دیکھا جائے تو وزیر اعظم جناب نواز شریف کے ان اثاثوں کی تفصیل ہے جن کا پہلی بار انکشاف ریمنڈ ڈبلیو بیکر نے 2005 میں اپنے ایک کالم Capilisms Achilles Heels میں بھی ان اثاثوں The observer میں کیا۔1998ء میں کے بارے میں ایک کہانی شائع کی گئی ۔تاہم حکمران خاندان ان خبروں کی مسلسل تردید کرتا آیا ہے لیکن پانامہ پیپرز میں ان تمام اثاثوں کے ثبوت پیش کیئے گئے ۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان پیپرز کے شائع ہوتے ہی پارلیمنٹ اور قومی اسمبلی میں وزیر اعظم اور ان اعلیٰ سطحی ارکان جو کرپشن میں ملوث رہے اور اس کرپشن کے ثبوت بھی دنیا کے شامنے لائے جا چکے ہیں ان کے خلاف قرار داد پیش کی جاتی اور ان پیپرز پر عالمی سطح اور ملکی سطح دونوں پر خود وزیر اعظم تحقیقات کا حکم دیتے اور ان تحقیقات کے مکمل ہونے تک اپنے عہدے سے معطل کیے جاتے ۔اگر ثابت ہو جاتا کہ وہ کرپشن کے مرتکب رہے ہیں تو عہدہ سے از خود مستعفی ہو جاتے اور اگر اس کے برعکس نتائج سامنے آتے تو ان لیکس پر

کام کرنے والوں کے خلاف ایکشن لیا جاتا۔ لیکن ایسا کچھ نہیں جبکہ اس کے برعکس حالیہ پانامہ لیکس کے انکشافات پر وزیر اعظم کچھ بوکھلائے نظر آتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ پانامہ لیکس کی آڑ میں انتشار پھیلانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

ان پیپرز کے شائع ہوتے ہی وزیر اعظم علاج کی غرض سے بیرونِ ملک روانہ ہو چکے ہیں۔ ان پانامہ لیکس کے خلاف لندن میں مظاہرے بھی ہوئے ہیں۔ ایک ہفتہ گزر جانے کے بعد وزیرِ خزانہ جناب اسحاق ڈار، اور وزیر داخلہ چوہدری نثار کے مطابق ان پیپرز کی تحقیقات کے لیے ایک عدالتی کمشن بنایا جائے گا۔ عدالتی کمشن صرف اور صرف رپورٹ پیش کر سکتا ہے کیونکہ اس کا دائرہ کار محدود ہوتا ہے اس کمشن کو کسی قسم کی سزا کا اسے کوئی اختیار نہیں اور بالآخر اس عدالتی کمشن کے فیصلے پر عملدرآمد اگر کسی کو کچھ کرنا ہے تو وہ یہی کرپٹ حکمران ہیں۔ یاد رہے کہ کئی معاملات میں عدالتی کمشن بنائے گئے، جنھوں نے اپنی رپورٹیں بھی پیش کی لیکن ان پر کوئی عملدرآمد نہیں کیا گیا اور نہ ہی کسی طاقت ور مجرم کو قرار واقع سزا ملی۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارے حکمران دوسرے ممالک کے حکمرانوں کی طرح کرپشن کے الزامات پر مستعفی نہیں ہوتے اور بلکہ وہ اس کے برعکس ان تمام باتوں کی

تردید کرتے نظر آتے ہیں۔ عوام کی حالت یہ ہے کہ وہ نظریاتی بنیادوں پر انھی کرپٹ لوگوں کا چناؤ کرتے ہیں اور کرپشن کے الزامات، ثبوت کے باوجود ملک کو لوٹنے والے ملک کے حکمران بنتے ہیں۔ کرپشن کے حق میں مظاہرے کیے جاتے ہیں۔ المیہ در المیہ یہ کہ کرپشن کے خلاف احتجاج کرنے والے خود بھی کرپشن کے مرتکب ہوتے ہیں
۔ جمہوریت کی آڑ میں کرپٹ سیاست دان ایک دوسرے کا نہ صرف ساتھ دیتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کی مکمل مدد کرتے ہیں۔

تحفظ حقوقِ نسواں بل

اسلامی نظریاتی کونسل نے پنجاب اسمبلی میں بحث کے لیے بلآخر حقوقِ نسواں بل پیش کر دیا ہے۔ تحفظ حقوق نسواں بل طویل عرصے سے متنازعہ تھا اور ملک کا ہر طبقہ قریبااس بل پر بات کرتا چلا آیا ہے۔ مجوزہ حقوقِ نسواں بل مفتی امداداللہ نے تیار کیا ہے جو کہ 163 شقوں پر مشتمل ہے۔اس بل کے بارے میں بات کرنے سے پہلے اس بل میں شامل چند شقوں کو یہاں بیان کرتی چلوں۔

اسلام یا کوئی مذہب چھوڑنے پر عورت قتل نہیں کی جائے گی۔

باشعور لڑکی کو اسلام قبول کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

غیرت کے نام پر قتل ، ونی ، کاروکاری کو قتل کردانا جائے گا اور اس کی سزا پھانسی کی صورت ہی ہو گی۔

ونی یا صلح کے لیے لڑکی کی زبردستی شادی کروانا قابلِ تعزیر جرم ہوگا۔

عاقل اور بالغ لڑکی ولی کی اجازت کے بغیر از خود نکاح کر سکے گی۔

تادیب کے لیے عورت پر ہلکا پھلکا تشدد کرنے کا حق مرد کو حاصل رہے گا تاہم تادیب سے تجاوز پر عورت شوہر کے خلاف کاروائی کے لیے عدالت سے رجوع کر سکتی ہے۔
(واضع رہے کہ تادیب کی حد یہاں واضع نہیں کی گئی)

بیک وقت تین طلاقیں دینا قابلِ تعزیر جرم ہو گا۔

خاتون نرس سے مردوں کی تیمار داری پر پابندی ہو گی۔

جہیز کے مطالبہ اور نمائش پر پابندی ہو گی۔

آرٹ کے نام پر رقص، موسیقی، مجسمہ سازی کی تعلیم اور نمائش پر پابندی ہو گی۔

گیر ملکی مہمانوں کے استقبال میں خواتین شامل نہیں ہوں گی۔ عورتوں کے غیر محرم افراد کے ساتھ تفریحی دوروں اور آزادنہ میل جول پر پابندی ہو گی۔

شوہر اہلیہ کی اجازت کے بغیر نس بندی نہیں کروا سکے گا

حمل کے 120 دن بعد اسقاطِ حمل کو قتل گردانہ جائے گا۔

بیرونی صدمے سے اسقاب حمل کا مرتکب دیت کا بیسواں حصہ دینے کا پابند ہو گا۔

دورانِ جنگ عورت کو قتل کرنے کا حق نہیں ہو گا۔

عورت سے زبردستی مشقت لینے پر مکمل پابندی ہو گی۔

تیزاب گردی یا کسی حادثے سے عورت کی موت کی مکمل تحقیقات کی جائیں گی۔

معاشرتی بگاڑ سے متعلق اشتہارات میں عورت کے کام کرنے پر پابندی ہو گی۔

عورت کو شریعت کے فراہم کردہ تمام حقوق حاصل ہوں گے۔

عورتوں کو سیاست میں حصہ لینے کی اجازت ہو گی جبکہ عورتیں جج بھی بن سکیں

گی اور انھیں وصیت کا حق حاصل ہو گا۔ تاہم عورتیں فوجی، عسکری خدمات میں براہِ راست حصہ لینے کی ذمہ دار نہیں ہوں گی۔

پرائمری کے بعد مخلوط تعلیم پر پابندی ہو گی تاہم حجاب کی اجازت، آزادانہ میل جول پر پابندی پر مخلوط تعلیم کی اجازت ہو گی۔

عورت بچے کو دو سال تک دودھ پلانے کی پابند ہو گی، ماں کا متبادل دودھ پر مبنی اشتہارات پر پابندی ہو گی۔

واضح رہے کہ پنجاب اسمبلی میں تحفظ حقوق نسواں بل پاس کیا گیا تھا جس کو غیر اسلامی قرار دیا گیا تھا۔ ہمارا ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اور یہاں اسلامی قوانین کو رائج کرنا ہی مسلمانوں کی اولین ترجیح تھی۔ اس سلسلہ میں اسلامی نظریاتی کونسل کی جانب سے پنجاب اسمبلی کو ایک خط بھی لکھا گیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ عائلی معاملات میں قانونی اداروں کو براہ راست شامل کر دینے سے معاشرے میں خاندانی نظام کو شدید نقصان پہنچے گا۔اس بل کو اسلامی نظریاتی کونسل کی جانب سے غیر اسلامی قرار دیتے ہوئے نامنظور کر دیا گیا تھا۔

اس بات کی وضاحت نہایت ضروری ہے کہ اگر ہم میں سے ہر ایک شخص نبی پاک ﷺ کی عائلی زندگی کا مطالعہ کرے، قرآن پاک کی سورت النساء اور سورت نور کا مطالعہ کیا جائے اور ان احکامات پر عمل کیا جائے تو ہمیں کسی حقوق ن نسواں بل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ قرآن اور حدیث میں ہر ایک حد متعین کر دی گئی

ہے۔ چاہے وہ خواتین کے حقوق ہوں یا مردوں کے۔ حقوق کی ادائیگی کے لیے کسی قانون کا ہونا یا نہ ہونا ضروری نہیں بلکہ یہ ایک فرد پر ہے کہ وہ اپنی بیوی کے حقوق ادا کرتا ہے یا نہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی جانب سے اس بل کا پیش ہونا اور اگر یہ بل پاس ہو جاتا ہے تو اس کا آئینِ پاکستان کا حصہ بن جانا بلاشبہ معاشرہ میں موجود قبیح رسموں کے خاتمے کا ذریعہ بنے گا۔ ہمارے میڈیا اور لبرل سیاست دانوں نے اس بل کی ایک شق کو نشانہ بنا رکھا ہے اس شق میں اگرچہ ترمیم کر دی جائے مثلاً مرد کو عورت کی اصلاح کے لیے ہلکے پھلکے تشدد کی اجازت ہو گی لیکن کوئی مرد اس کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائے گا کیونکہ نبی پاک ﷺ نے اپنی کسی بھی زوجہ محترمہ پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا اور نہ ہی کبھی کسی پر تشدد کیا۔ بلاشبہ یہ بل پاکستان میں نفاذ اسلام کی جانب ایک مثبت قدم ہے۔

جلتے جسم، سلگتی روحیں

پنجاب اسمبلی میں حقوق نسواں کا بل پاس ہو چکا ہے۔تاہم اس بل کا عام عورت کے مسائل یا اس کے تحفظ کے مسئلے پر خاطر خواہ فرق نہیں پڑھا۔پاکستان میں عورت آج بھی اتنی ہی غیر محفوظ ہے جتنی کل تھی ۔ عورت کے حقوق پر اگرچہ بہت بحث و مباحثہ ہوا، بہت سی تنظیمیں، این جی اوز بنائی گئی لیکن عام عورت کے حالات پر کوئی خاطر خواہ فرق نہیں پڑا۔ اس ملک کے باسیوں میں پھیلتی ایک قبیح رسم جو کہ عزت کے نام پر جان سے مار دینا ہے آج بھی اسی شدت سے جاری و ساری ہے۔ پچھلے چند دن میں ماؤں نے اپنی ان بیٹیوں کو جنھوں نے اپنی پسند سے شادی کی خاندان کی عزت کی خاطر جلا دیا۔ لڑکیوں کو زندہ جلانے کے واقعات میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ وجہ چاہے کچھ بھی ہو کسی کو زندہ جلا دینا از خود ایک انتہائی قبیح فعل ہے۔انسانی زندگی باہر حال ایک حیثیت رکھتی ہے اور کسی کی جان لے لینے سے خاندان کی کھوئی ہوئی عزت واپس نہیں آ سکتی۔ عزت کے نام پر قتل یا شوہر کی وفات کے ساتھ ہی بیوی کو زندہ جلا دینا ہندؤں کے رسم ورواج کا حصہ تھا اور پہلے پہل صرف اندرونِ سندھ اور اندرونِ پنجاب تک محدود تھا لیکن آج اکیسویں صدی میں چاہے مری کے سبزہ زار ہوں، پنجاب کے میدان ہوں، ایبٹ آباد کی گلیاں ہوں، سندھ کی سرزمین ہو یا پشاور کے درودیوار، عورت کی جان ارزاں درارزاں

ہوتی جارہی ہے۔اس رسم کو کاروکاری کے نام سے جانا جاتا تھا اس رسم کا شکار زیادہ تر خواتین ہی ہوتی آئی ہیں لیکن اب یہ سلسلہ پورے ملک میں جاری ہو چکا ہے۔وجہ چاہے پسند کی شادی ہو یا بے حرمتی کا شکار ہونے کے بعد اس کو جان سے مار دیا جائےعورت معاشرے کا ایک کمزور ترین جزو ہے۔

اگر گذشتہ برسوں کے اعداد و شمار کا جائزہ لیا جائے تو انتہائی پریشان کن حقائق سامنے آتے ہیں۔سال ۲۰۱۱ء میں عزت کے نام پر قتل ہونے والی خواتین کی تعداد ۶۰۵ تھی جبکہ سال ۲۰۱۰ء میں عزت کی خاطر قتل ہونے کے ۹۶۰ واقعات پیش آئے۔ ہیومن رائٹس کمشن کی رپورٹ کے مطابق گذشتہ برس میں کم و بیش ۵۰۰ افراد کو عزت کے نام پر قتل کیا گیا جن میں مرد عورتیں سبھی شامل تھے اس سال عزت مئی کے مہینے کو قتل کیا گیا۔ ۲۳۳

یہاں ایک قابلِ غور سوال یہ ہے کہ کیا اسلام پسند کی شادی کی اجازت ہے ؟ تو متعدد احادیث سے ثابت ہے کہ اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ اگر کوئی لڑکی یا لڑکا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تو انھیں بدکاری سے بچانے کے لیے نکاح کے رشتہ میں باندھ دیا جائے اور معاشرے میں بد چلنی کی حوصلہ شکنی کی جائے۔اسلام درپردہ دوستی اور بدکاری کی حوصلہ شکنی کرتا ہے اس کے برعکس اسلام نکاح کو پسند کرتا ہے اور یہ حکم دیتا ہے کہ اگر بدکاری کا خدشہ ہو

تو ان افراد کو رشتہ ء ازواج میں جوڑ دیا جائے ۔ ہمارے معاشرے میں پسند کی شادی کو ایک گناہ تصور کیا جاتا ہے ۔ پسند کی شادی میں والدین واضع طور پر رکاوٹ پیدا کرتے ہیں جس کی بنیادی وجہ خاندانی نظام ہے ۔ہمارے یہاں متعدد خاندانوں میں ذات .برادری سے باہر شادیاں نہیں کی جاتی ۔ذات.برادری سے باہر شادی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا ۔ دوئم یہ جب ماں باپ کو پتہ چلتا ہے کہ بیٹے کو کوئی لڑکی پسند آ چکی ہے اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اب تو بیٹا ہاتھ سے گیا ، اب وہ ان کا نافرمان ہو چکا ہے شادی کے بعد اچھا سلوک نہیں کرے گا اور انھیں چھوڑ دے گا ۔ ان بنیادی وجوہات کی وجہ سے کبھی لڑکی تو کبھی لڑکے کے والدین نہیں مانتے اور وہ انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور کورٹ میرج کر لیتے ہیں ۔ اس طرح جو کام بچوں کی خوشیوں کی خاطر ہو سکتا ہے وہ خاندان کی عزت کی نیلامی کی صورت میں سامنے آتا ہے ۔

حال ہی میں جس لڑکی کو لاہور کے علاقہ میں جلایا گیا اس کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا ۔ لڑکا اور لڑکی آپس میں محبت کرتے تھے ، لڑکے نے اپنے والدین کو لڑکی کے والدین کے پاس بھیجا جن کو انکار کر دیا گیا ۔ اس انکار کے بعد ان دونوں نے کورٹ میرج کر لی ۔ لڑکی کے خاندان کی یقین دہانی پر لڑکے نے لڑکی کو والدین کے پاس واپس بھیج دیا جہاں لڑکی کی والدہ نے اسے زندہ جلا

دیا۔ یہ ایک انتہائی بڑا اقدام تھا۔ یہ صرف ایک واقعہ نہیں ، حال ہی میں اس طرح کے کئی واقعات دیکھنے میں آئے ہیں جن میں کورٹ میرج کرنے والے جوڑوں کو جان سے مار دیا گیا۔ سنی اتحاد کونسل (بریلوی مکتبہ ءِ فکر) لاہور نے فتویٰ دیا ہے کہ عزت کے نام پر کیا جانے والا قتل باہر قتل ہے اور قتل کی اسلام کسی صورت اجازت نہیں دیتا ۔اس کی سزا پھانسی ہی ہونا چاہیے ۔ مذہبی جماعتوں نے بھی عزت کے نام پر کیا جانے والے قتل کو قابل معافی ہونے کے خلاف احتجاج کی دعوت دی ہے۔ عزت کے نام پر قتل کے خلاف سینٹ میں بل پاس کیا گیا ہے۔ آئین پاکستان کے مطابق عزت کے نام پر قتل ، غصے میں کیا گیا اقدامِ قتل قابلِ معافی ہے اور دیت دے کر قاتل کی جان بخشی ممکن ہے جس قانون کا ہر عہد میں ناجائز فائدہ اٹھایا گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا لڑکی یا دونوں کو زندہ جلا دینے یا قتل کر دینے سے خاندان کی عزت واپس آ گئی ؟ یا خاندان کو جو بدنامی کا سامنا کرنا پڑا وہ سب ختم ہو گیا؟ معاشرے میں ہونے والی باتیں ختم ہو گئی ؟نہیں ۔ بلکہ جو بات لڑکی کے زندہ ہوتے ہوئے چند لوگوں تک محدود تھی، ایک محلے یا ایک خاندان کے بیچ تھی ، وہ اس کو جلا دینے کے بعد زبانِ زد عام ہو گئی ۔ جس لڑکی کو کوئی نہیں جانتا تھا اس کو زندہ جلا دینے کے بعد اخباروں کی زینت بن گئی قاتل اور مقتول دونوں معاشرے میں مشہور ہو گئیں ۔بیٹی توجان سے گئی

ماں کے انٹرویو کئی گئے ، اس کو سزا ہوئی اور اس پر کئی پروگرام بنے ۔ یعنی جو بات چند ، لوگوں میں تھی بڑھتے بڑھتے پورے معاشرے تک پھیل گئی ۔

اب ایک نظر ڈالئے اس مذہب اسلام پر جس کے ہم پیروکار ہیں ۔ اسلام کے ظہور سے پہلے عرب میں بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا اور یہ دستور کئی صدیوں سے جاری تھا ۔ ظہور اسلام کے بعد انھی بیٹیوں کے لیے نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اپنی چادر بچھا دیتے ہیں ۔ اور بیٹیوں کو رحمت قرار دیا جاتا ہے ۔ بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے کی شدت سے مذمت کی گئی اور اس قبیح رسم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا لیکن آج اکیسویں صدی کے باسیوں میں پھر سے زمانہ جہالیت کے رسم و رواج پروان چڑھ رہے ہیں ۔ انسان خصوصا عورت کی جان کی قدر و قیمت بے انتہا کم ہو چکی ہے ۔ ایک طرف تو خواتین کے حقوق کے بل پاس ہو رہے ہیں تو دوسری جانب بیٹیوں کو جان سے مار دینا معمول بنتا جا رہا ہے ۔ یہ معاشرے کا ایک عمومی رویہ ہے ۔ لوگوں میں غصہ اور ڈپریشن اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ وہ معاملات کو ٹھنڈے دماغ سے سلجھانے کی بجائے ، معاملات کو غصے سے سلجھاتے ہیں جس کی وجہ سے قتل جیسے واقعات رونما ہوتے ہیں ۔ واضع رہے کہ اسلام میں عزت کئے نام پر قتل کی کوئی گنجائش نہیں ۔ اسلام امن کا وہ دین ہے جس میں ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل پر معمور کیا

جاتا ہے۔

ماہِ رمضان : رحمت ، برکت اور عوام

رمضان کا بابرکت مہینہ اپنے اختتام کی جانب بڑھ رہا ہے۔ رمضان کا مہینہ ، پورے اسلامی سال کا مقدس ترین مہینہ ہے اور پورے سال کے لیے اپنے اندر ایک سبق سموئے ہوئے ہے۔اس مہینہ میں کم و بیش ہر گھر میں عبادات ، سحر و افطار کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔یہ مہینہ جہاں اپنے ساتھ رحمتیں اور برکتیں لے کر آتا ہے وہاں اس سال اپنے ساتھ مہنگائی کا ایک طوفان بھی لے کے آیا ہے۔اس بابرکت مہینے میں روزمرہ استعمال کی اشیاء خصوصا دالوں ، سبزی ، پھلوں ، دہی ، مرغی وغیرہ کی قیمتوں میں ہوشربا اضافہ ہوا ہے۔ قیمتوں میں اضافہ کی وجہ سے ایک عام آدمی کی قوتِ خرید میں مزید کمی ہوئی ہے۔اگرچہ اس برس بھی پچھلے برس کی طرح بچت بازار لگائے گئے ہیں تاہم عمومی اشیاء کی قیمتوں پر کوئی چیک نہیں۔ پھل فروش ، سبزی فروش از خود پھلوں اور سبزیوں کے نرخ بڑھا دیتے ہیں۔رمضان کے آغاز کے ساتھ ہی جو پھل تیس روپے کلو تھا اس کی قیمت تین دن کے فرق سے بعض علاقوں میں دو سو روپے کلو جب کہ بعض علاقوں میں ساڑھے تین سو روپے کلو تک جا پہنچی۔
قیمتوں میں اتنے فرق کی وجہ جب ایک پھل فروش سے پوچھی تو اس کا کہنا تھا کہ

ایک ہی تو مہینہ ہے جس میں سب کو پھل خریدنا ہے اور ہمیں بھی اسی مہینے میں کمانا ہے۔ یہ ایک انتہائی عجیب و غریب سوچ تھی جو کہ ہر ذخیرہ اندوز، پھل فروش، سبزی فروش بلکہ تقریباً ہر شخص میں پائی جاتی ہے تاہم اس مہنگائی کے طوفان نے عام آدمی کو پریشان کر رکھا ہے۔ جو شخص بمشکل اپنے گھر کی روزی روٹی چلاتا ہو اس کے لیے عام حالات سے بھی مہنگا پھل یا سبزی خریدنا بے حد مشکل ہے۔ اس طرح غریب خاندان اس بابرکت مہینے میں بھی اچھے کھانے اور پھل سے محروم رہ جاتے ہیں۔ نہ صرف پھل اور سبزیاں بلکہ گوشت، مرغی، دہی اور دالوں تک کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے۔ مرغی اور گوشت کی قیمتوں میں کم و بیش تیس روپے تک کا اضافہ ہوا ہے۔

یہ تو ہے ہمارے ملک کی حالت، اب جائزہ لیتے ہیں یورپی ممالک، مشرق وسطیٰ، اور امریکہ کا۔ یہ وہ ممالک ہیں جہاں سال کے اس مہینے جس میں کوئی مذہبی تہوار آتا ہے اس کے لیے اشیاء صرف کی قیمتوں میں واضح کمی کر دی جاتی ہے تاکہ وہ شخص بھی خرید سکے جو عام حالات میں وہ اشیاء خریدنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس طرح ان ممالک میں ہر شخص چاہے وہ امیر ہو یا غریب مذہبی تہواروں میں شامل ہو سکتا ہے، جبکہ ہمارے یہاں الٹ رواج ہے۔ ہمارے ملک میں ذخیرہ اندوز اور کاروباری حضرات رمضان کے مقدس مہینے میں اشیاء صرف کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے غریب کے لیے یہ بابرکت مہینہ

بھی دنیاوی برکات لے کر نہیں آتا۔ہمارے ملک میں غریب انسان کے لیے اس کی رمضان کا مہینہ عام مہینوں سے زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔جیب اور چادر سے باہر اشیائے خوردونوش اس مہینے میں تنخواہ دار طبقے کو مزید پریشانیوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ایک جانب تو مہنگاہی نے غریب عوام کا جینا حرام کر دیا ہے تو دوسری جانب ہمارے ملک کے امراء اپنے لاکھوں روپے افطار پارٹیوں میں اڑا دیتے ہیں۔ رمضان کے مہینے میں ہوٹلوں میں مہنگے افطار ڈنر کرنے والے اپنے ہی قریبی علاقوں میں بسنے والے غریبوں کے حالات سے بے خبر رہتے ہیں اور اپنے اخراجات میں ان غریبوں کے لیے کسی قسم کا کوئی حصہ نہیں رکھتے۔ اس طرح جو مہینہ تزکیہ نفسکے لیے ہے وہ افطار پارٹیوں اور ڈنر کی نذر ہو جاتا ہے۔ماہ رمضان کی اصل روح ہمارے معاشرے میں ہر دو صورت میں مسخ کی جاتی ہے۔ غریب عوام کی صورت میں مہنگائی اور افراد خانہ کو اشیائے خورونوش کی فراہمی کے لیے تگ و دو میں اضافہ ہو جاتا ہے جبکہ امراء کی صورت میں وہ اپنے آمدنی کا ایک کثیر حصہ افطار پارٹیوں اور مہنگے لباس کی خرید پر خرچ کرتے ہیں،

اس ماہ مقدس کی اصل روح کو برقرار رکھنے کے لیے معاشرے میں انفرادی اور اجتماعی دونوں صورتوں میں عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔حکومتی سطح پر ہونا یہ

چاہیے کہ حکومت رمضان کے بابرکت مہینے میں مہنگائی کا جائزہ لے اور اس کو روکنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرے۔ مہنگائی اور کھانے پینے کی اشیاء کی قیمتوں پر قابو پانے کے لیے حکومتی اداروں کو سخت اقدامات کرنے چاہیں۔ اشیاء کی قیمتیں مقرر کرکے اس پر عملدرآمد کو یقینی بنانا از حد ضروری ہے۔ جبکہ انفرادی اور عوام کی سطح پر صاحب ثروت حضرات کو چاہیے کہ ان لوگوں کا خیال رکھیں جو قوت خرید نہ ہونے کے باعث کچھ خریدنے سے قاصر ہیں۔

واضح رہے ماہ رمضان صرف بھوک پیاس کا دوسرا نام نہیں ہے بلکہ یہ مہینہ ہمارے لیے ایک عملی سبق لے کر آتا ہے۔ خود کو کھانے پینے سے روک دینا کافی نہیں۔ بلکہ یہ انفرادی اور اجتماعی طور پر معاشرے میں بہتری لانے کا ایک بہترین ذریعہ ہے اگر اس کی بنیادی روح کو زندہ رکھا جائے۔ یہ مہینہ نفس پر قابو پانے کا مہینہ ہے۔ اس مہینے میں شیاطین کو جکڑ دیا جاتا ہے تاوقت کہ اس ماہ کا اختتام ہو جائے۔ اس ماہ میں تزکیہ نفس میں آسانی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ شیاطین کا جکڑے جانا اس بات کی نشاندہی ہے کہ انسان کو معلوم ہو جائے کہ اس کے گناہوں میں کتنا حصہ اس کے اپنے نفس کا کتنا حصہ ہے اور کتنا حصہ شیطان کا ہے؟ اس کا اپنا نفس اسے کس حد تک گناہوں کی جانب مائل کرتا ہے اور وہ کس حد تک اپنے نفس پر قابو پا سکتا ہے اس کا اندازہ اس ماہِ مبارک میں ہو جاتا ہے۔ اس مہینے میں انسان اپنی جائز نفسانی خواہشات جیسے

کھانا پینا وغیرہ ہے اس پر قابو پانا یکھتا ہے، جائز خواہشات پر قابو پانے سے ناجائز خواہشات پر قابو پانا آسان ہو جاتا ہے۔اس مہینے میں زیادہ سے زیادہ عبادت اور زیادہ سے زیادہ دوسروں کی مدد کی جانی چاہیے تاکہ یہ مہینہ اپنی اصل روح کے ساتھ گزارا جاسکے۔صرف یہ ایک مہینہ ہی نہیں سال کے تمام مہینوں میں یہی طریقہ اپنایا جانا ضروری ہے تاکہ معاشرہ ایک فلاہی معاشرہ کی عملی صورت بن جائے۔

خواہشات پر قابو پانے کے علاوہ یہ عملی عبادت کا مہینہ ہے جو ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہجن لوگوں نے کبھی بھوک پیاس.برداشت نہیں کی انھیں ان لوگوں کی تکالیف، اور آلام کا احساس ہو جو کہ سفید پوش یا غریب ہونے کی وجہ سے بھوک پیاس.برداشت کرتے ہیں۔لیکن ہمارے ملک میں جذبہ ایثار پنپنے کی بجائے افطار پارٹیوں، سحری کے اعلیٰ اہتمام، اور دعوتوں میں بے دریغ پیسہ تو لٹا دیا جاتا ہے لیکن غریبوں کی از خود مدد نہیں کی جاتی۔اس طرح معاشرے میں ایک جذبہ ایثار پیدا ہوتا ہے اور عملا معاشرے میں موجود طبقاتی تقسیم، اور مختلف طبقوں میں موجود خلیج میں کمی ہو سکے۔

اگر رمضان کے مہینے سے حاصل ہونے والے سبق کو انفرادی طور پر یاد رکھا جائے اور اس عملی عبادت کو معاشرے میں نافذ کیا جائے تو تھر کے باسی کبھی

بھوک پیاس کے ہاتھوں جان کی بازی نہ ہاریں اور نہ ہی کسی آفت زدہ علاقہ کے لوگ حکومتی امداد کو ترستے رہیں

عبدالستار ایدھی: ایک تاریخ ساز شخصیت

عبدالستار ایدھی، ایک تاریخ ساز شخصیت، ایک نام، ایک ادارہ، ایک انسان ہی نہیں بلکہ پاکستان کی تاریخ میں بھلائی اور نیکی کا ایک عظیم باب تھا جو چند روز پہلے اپنے اختتام کو پہنچا۔ان کی نمازِ جنازہ میں ان گنت لوگوں نے شرکت کی۔ ان کا جسدِ خاکی فوج کی اعلیٰ نگرانی اور سخت سیکیورٹی میں سٹیڈیم لائی گئی۔ دو جوڑوں میں زندگی گزارنے والے اس شخص کی نمازِ جنازہ اسی پروٹوکول سے ادا کی گئی جس سے ملکہ وکٹوریہ کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی تھی۔ قائدِاعظم اور علامہ اقبال کے بعد عبدالستار ایدھی وہ واحد شخصیت ہیں جن کی وفات پر تمام قوم کی آنکھیں پرنم اور تمام انسانیت کے دلوں میں بلا تفریق رنگ و نسل اور مذہب درد والم پایا جاتا تھا۔ عبدالستار ایدھی جیسی شخصیات اس دنیا میں کم کم پیدا ہوتی ہیں جن کی پوری زندگی اپنی ذات سے کہیں آگے انسانیت کی خدمت کے لیے وقف ہو۔ عبدالستار ایدھی کی زندگی کا اگر جائزہ لیں تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے بہت زیادہ وسائل کی نہیں بلکہ اٹل ارادے اور دردمند دل کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اگر کوئی انسانیت کے لیے کام کرنا چاہے تو اسے سفر کا آغاز صفر سے کرنا پڑتا ہے۔ اپنی ذات کی تکلیف اور عیش وآرام کو ایک طرف رکھ کر انسانیت کے دکھوں کو پہچاننا پڑتا ہے۔

جب انسان دوسروں کے دکھوں کو پہچاننے لگے تو ان کے مداوا کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح ایک شخص اپنے ساتھ دوسروں کی مدد سے ایک قافلہ بنا لیتا ہے۔

اب آیئے ! عبدالستار ایدھی کی زندگی پر ایک نظر دوڑاتے ہیں۔ گجرات کے ایک گاؤں بانٹوا کا نوجوان گھریلو حالات خراب ہونے کی پر کراچی جا کر کپڑے کا کاروبار شروع کرتا ہے۔ کپڑا خریدنے مارکیٹ گیا وہاں کسی شخص کو چاقو مار دیا گیا۔ زخمی زمین پر گر کر تڑپنے لگا لوگ اس زخمی شخص کے گرد گھیرا ڈال کر تماشہ دیکھتے رہے وہ شخص تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ نوجوان عبدالستار ایدھی کے دل پر داغ پڑ گیا سوچا معاشرے میں تین طرح کے لوگ ہیں، دوسروں کو مارنے والے، مرنے والوں کا تماشہ دیکھنے والے اور زخمیوں کی مدد کرنے والے۔ نوجوان عبدالستار نے زخمیوں کی مدد کرنے والوں میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ نہ صرف فیصلہ کیا بلکہ مدد کرنے والوں میں شامل ہو گیا۔ کپڑے کا کاروبار چھوڑا، ایک ایمبولینس خریدی اس پر اپنا نام اور ٹیلی فون نمبر لکھا اور کراچی شہر کے زخمیوں اور بیماروں کی مدد شروع کی۔ وہ اپنے ادارے کا ڈرائیور بھی خود تھا، آفس بوائے بھی خود تھا، ٹیلی فون آپریٹر بھی، سویپر بھی اور مالک بھی۔ وہ ٹیلی فون سرہانے رکھ کر سوتا، فون کی گھنٹی بجتی یہ اڈریس لکھتا اور ایمبولینس لے کر چل پڑتا۔ زخمیوں اور مریضوں کو ہسپتال پہنچاتا، سلام کرتا اور واپس آ جاتا۔ عبدالستار نے سینٹر کے سامنے لوہے کا ڈبہ رکھ دیا۔ لوگ گزرتے وقت اس میں اپنی فالتو ریزگاری اس میں ڈال دیتے۔ یہ

سینکڑوں سکے اور چند نوٹ اس سینٹر کا کل اثاثہ تھے۔ یہ فجر کی نماز پڑھنے مسجد گیا۔ مسجد کی دہلیز پر کوئی نوزائیدہ بچہ چھوڑ گیا تھا۔ مولوی صاحب بچے کو ناجائز قرار دے چکے تھے لوگ اس بچے کو مارنے کے درپے تھے۔ یہ پتھر اٹھا کر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا اس بچے کی پرورش کی آج وہ بینک میں ایک اعلیٰ عہدہ دار ہے۔ یہ لاشیں اٹھانے بھی جاتا تھا۔ وہ لاشیں بھی جن کو ان کے لواحقین اٹھانے کو تیار نہ ہوتے۔ جب بے بس بوڑھوں کو بھیک مانگتے اور آوارہ بچوں کو فٹ پاتھ پر کتوں کے ساتھ سوتے دیکھا تو اولڈ پیپلز ہوم اور چلڈرن ہوم بنا دیا، عورتوں کو بے یار و مددگار دیکھا تو میٹرنٹی ہوم بنا دیا۔ اس نوجوان نے اپنی ساری جوانی لاشیں اٹھاتے، نوزائیدہ بچوں کی پرورش کرتے، بے یارومددگار لوگوں کا سہارا بنتے گزار دی۔ جس عمر میں ہمارے ملک کے نوجوان ملک سے باہر جانے، بے تحاشا روپیہ اور شان و شوکت کی زندگی گزارنے کی خواہش کرتے ہیں اس عمر میں عبدالستار ایدھی لوگوں کی مدد کے لیے اکیلے کمر کس کر کھڑے تھے۔ انھوں نے کسی کی مدد کے بنا یہ کام شروع کیا۔ آج جو ادارہ پوری دنیا میں ایدھی فاؤنڈیشن کے نام سے جانا جاتا ہے وہ درحقیقت ایک تنہا شخص کی کاوش سے شروع ہوا اور پھلتے پھولتے لاکھوں کے دکھوں کا مداوا بنتا چلا گیا۔ ایسا نہیں کہ ان کی کوئی ذاتی زندگی نہ تھی یا ذاتی زندگی میں مسلئے مسائل نہ تھے بلکہ انھوں نے اپنی ذاتی زندگی اور ذاتی خوشی یا ذاتی غم پر ہمیشہ مخلوقِ خدا کے دکھ کو اہمیت دی۔ اس دکھ کا مداوا

کرنے کی عملی کوشش بھی کی۔

یہی جذبہ اور ولولہ تھا جس نے ایک اکیلے شخص کو اتنا بڑا کام کرنے پر مجبور کیا آہستہ آہستہ لوگ اس تنہا اور کم وسائل رکھنے والے نوجوان کے ساتھ ملتے گئے یہاں تک کہ ایدھی فاؤنڈیشن کا وجود کرۂ ارض پر نہ صرف وجود میں آگیا بلکہ یہ ادارہ ملک میں ویلفیئر کا سب سے بڑا ادارہ بن گیا۔ اس ادارے کا نام ۲۰۰۰ء میں گینیز بک آف ورلڈ رکارڈ میں بھی آگیا ایدھی صاحب ملک میں بلا خوف وخطر پھرتے تھے یہ وہاں بھی جاتے جہاں پولیس مقابلہ ہو رہا ہوتا یا فسادات ہو رہے ہوتے۔ پولیس، ڈاکو اور متحارب گروپ انھیں دیکھ کر فائرنگ بند کر دیا کرتے تھے۔ ایدھی صاحب نے ۲۰۰۳ء تک گندے نالوں سے آٹھ ہزار لاشیں نکالی، سولہ ہزار نوزائیدہ بچے پالے انہوں نے ہزاروں بچیوں کی شادی کروائی۔ لوگ ان کے ہاتھ چومتے تھے، عورتیں زیورات اتار کر ان کی جھولی میں ڈال دیتی تھیں، نوجوان اپنی موٹر سائکلیں سڑکوں پر انھیں دے کر خود وین میں بیٹھ جایا کرتے تھے۔ یہ ایدھی ہی تھے جنھیں پورے ملک کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ جو نہتے ہونے کے باوجود کسی جنرل کی طرح ملک میں سفر کرتے، جن کو کبھی کسی سیکیورٹی گارڈ کی ضرورت نہیں رہی۔

ایدھی جس دن اس دنیا سے رخصت ہو رہے تھے اس دن بھی ان کا کام جاری و ساری

تھا کسی ایدھی سنٹر میں ایک منٹ کے لیے کام نہیں روکا گیا۔ ان کی وفات کے سوگ میں کوئی ایمبولینس تاخیر سے روانہ نہیں ہوئی، مدد کی درخواست کے لیے آنے والی کسی کال کو یہ نہیں کہا گیا کہ سردست اس ادارے کا بانی اس دنیا سے جا رہا ہے اس لیے مدد نہیں دی جا سکتی۔ کسی کو یہ نہیں کہا گیا کہ آج یہ ادارہ بند رہے گا۔ اس شخص کے لیے خاموشی اختیار نہیں کی گئی۔ یہ کیسا عجیب شخص تھا جس کے مر جانے کے سوگ میں اس کے ادارے کو ایک گھنٹہ تو کیا ایک منٹ بھی کام سے نہیں روکا گیا۔ آہ ! یہ سربراہ درحقیقت مرا تھا ہی نہیں۔ وہ صرف اپنی عارضی زندگی کے سفر کو ختم کرکے ابدی سفر پر گامزن ہوا تھا۔ ہزاروں لوگوں کو آسرا دینے والا یہ شخص پاکستان کو سب سے بڑی ایمنبولنس سروس دے کے گیا اور اس کے ساتھ ایک ایسا ادارہ جو معاشرے کے ان لوگوں کے آنسو پونچھتا ہے جن کے آنسو کسی کو نظر ہی نہیں آتے۔ ایدھی کے چلے جانے کے بعد درحقیقت کئی بچے یتیم ہو گئے۔

الغرض ایدھی بلاشبہ ایک ایسی تارخ ثبت کر گئے ہیں جو کہ پاکستان تو کیا دنیا بھر کے انسانوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ ایک ایسی مثال جو کہ رہتی دنیا تک قائم و دائم رہے گی۔ بلاشبہ عبدالستار ایدھی جیسے لوگ مرا نہیں کرتے بلکہ اپنی زندگی اپنے ملک و قوم کو عطاء کرکے خود ابدی نیند سو جاتے ہیں۔ ایک ایسی نیند جس میں ان کا نام اور ان کا کام ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ درحقیقت

عبدالستار ایدھی ایک شخص نہیں بلکہ ایک عہد تھا جو اٹھاسی برس پر محیط تھا۔

جمہوریت کی اعلیٰ ترین مثال : ترکی کے زندہ دل عوام

حال ہی میں ترکی کی جمہوری حکومت کو الٹنے کے لیے کی گئی فوجی سازش کو عوام نے ناکام بنا دیا۔ عوام نے دارالحکومت کی جانب بڑھتے ہوئے ٹینکوں کے نیچے لیٹ کر اپنی جان پر کھیل کر حکومت کو بچایا۔ یہ دنیا میں جمہوریت کی حفاظت کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ جن ممالک سے جمہوریت کا آغاز ہوا ان ممالک میں بھی ایسی مثال نہیں ملتی۔ ترکی میں ہونے والی یہ سازش چند فوجی افسران کی سوچ کا شاخسانہ تھا اس سازش کے خلاف عوام کا یہ ردِ عمل ترک حکومت نہیں ، جمہوریت برائے سیاست بلکہ درحقیقت یہ یکجہتی اور عوام کی طاقت ، صدر رجب طیب اردگان کی قیادت کو بچانے کے لیے تھی ۔اس شورش اور سازش پر کئی کالم لکھے جا چکے ہیں ، بہت سے مباحثے ہو چکے ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا یہاں تک ہے کہ یہ تمام سازش ، تماشورش ، دراصل صدر طیب کا ایک تیار کردہ ڈرامہ تھا جس کا مقصد دنیا کو ، اسلامی ممالک خصوصاً شام ، عراق اور کرد باغیوں کے سامنے صدر طیب کی طاقت کا اظہار تھا۔ جبکہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ترکی کی ترقی اور صدر طیب کی طاقت سے خائف مغربی ممالک اور ملک دشمن عناصر اس سازش کو کامیاب بنانے کی کوشش میں سرگرداں رہے اور درحقیقت یہ سازش ترکی میں جمہوریت کا تختہ الٹنے کے لیے تھی الغرض ہر کوئی اپنے اپنے خیال پیش کرتا رہا ہے اصل حقائق کیا ہیں یہ تو تحقیقات کے بعد دنیا کے

سامنے آئیں گے لیکن اس سازش سے کچھ ٹھوس ادارے دنیا کے سامنے آئے۔ یہ سازش تھی یا نہیں، صدر طیب کا تیار کردہ ڈرامہ تھا یا نہیں، اس بات سے قطع نظر، صدر طیب کی جرات سے کون واقف نہیں۔ اس وقت وہ اقوامِ عالم میں ایک جرات مند مسلمان حکمران کی حیثیت سے جانے اور مانے جاتے ہیں۔ ترک عوام نے ثابت کیا کہ تمام عالم اسلام کے دلوں پر راج کرنے والے صدر طیب کے خلاف اگر کوئی سازش ہو گی تو وہ اپنی جان دے کر بھی اسے بچائیں گے۔

صدر رجب پوری امت مسلمہ میں وہ واحد حکمران ہیں جو کہ جرات، بہادری اور عالمی سطح پر مسلمانوں کے حق میں تعرہ، حق بلند کرتے ہیں۔ اپنی عوام کے لیے ہمدرد، اور ترکی کی ترقی کے لیے ہمہ تن گوش رہنے والے راہنما ہیں۔ عالم اسلام کا کوئی بھی مسئلہ ہو صدر طیب جرات سے اقوامِ عالم میں اپنا موقف پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر بنگلہ دیش میں مطعی الرحمٰن نظامی کی پھانسی کا معاملہ ہو جب تمام عالم اسلام کے حکمران خاموش ہوتے ہیں اس وقت ترک صدر بنگہ دیش سے سفارتی تعلقات کو ختم کر کے اپنے سفیروں کو ملک میں واپس بلاتے ہیں، شام کے مہاجرین کی امداد کا مسئۂ درپیش ہو تمام عالمِ اسلام کے راہنما خاموش ہوتے ہیں اس وقت صدر طیب اپنے ملک سے، امداد ان مہاجرین کو بھیجتے ہیں۔ مہاجرین کا مسئلہ ہو یا کوئی اور عالمی مسئلہ صدر طیب مسلمانوں کی ایک مضبوط آواز بن کر سامنے آئے۔ صدر طیب کے دور حکومت

میں ترکی اقوامِ عالم کی صف میں ایک طاقت بن کر سامنے آچکا ہے۔ ترکی کی خارجہ پالیسی میں وضع کردہ تبدیلی نے ترکی کو اقوامِ عالم میں کامیابی سے ہمکنار کیا اور ملک کی اندرونی حالت میں خاطر خواہ بہتری آئی۔ ملک میں جرائم کی سطح میں کمی ہوئی اور اندرونی شورشوں کا خاتمہ ہوا جس کی وجہ سے ملکی معیشت ترقی کی راہ پر گامزن ہوئی اور ترکی یورپی یونین کا ایک اہم ملک بن گیا۔

حالیہ سازش صدر طیب اردگان کی حکومت کو ختم کرکے مارشل لاء لگانے کی ایک کوشش تھی جس کو عوام نے ناکام بنا دیا۔ اس سازش کو ناکام بنانے کے لیے دو سو افراد نے اپنی جان قربان کی اور ۱۴۴۰ افراد زخمی ہوئے۔ مسلمان ممالک نے بھی ترکی کا ساتھ دیا جس کو صدر طیب نے اپنے خطاب میں سراہا اور اپنی عوام کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے حکومت کی حفاظت کی۔

اب آیئے صدر طیب کے سیاسی کیریر کا جائزہ لیں۔ صدر طیب ترکی کو ترکی کی حکومت سنبھالے ہوئے قریبا دو سال ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے سیاسی کیریر کا آغاز Justice and development party کے قیام سے کیا، طیب اس سیاسی جماعت کے بانیوں میں سے ایک تھے۔ اس پارٹی کا منشور عوام کو انصاف کی فراہمی اور ملک میں ترقی ہے۔ اس پارٹی کا قیام ۲۰۰۱ء میں عمل میں آیا جس

نے بالترتیب تین الیکشن سن ۲۰۰۲ء ، ۲۰۰۷ء اور سن ۲۰۱۲ء میں واضع برتری حاصل کی۔ یہ پارٹی اسلامی سیاسی ماضی کی حامل ہے اور خود کو کنزویٹو ڈیمو کریٹک Conservative Democrate کہلاتے ہیں۔ صدر طیب نے اس پارٹی کے قیام کے بعد ترکی میں واضع شہرت حاصل کی۔ اپنے سیاسی کیئریر کے آغاز میں پہلی برتری طیب کو تب حاصل ہوئی جب وہ سن ۱۹۹۴ء استنبول کے میئر کے طور پر منتخب ہوئے اور چار سال تک اس عہدے پر برقرار رہے۔ اپنی سیاسی جماعت کے قیام کے بعد صدر طیب نے الیکشن میں کامیابی حاصل کی اور سن ۲۰۰۳ء میں پہلی بار ترکی کے وزیر اعظیم کی حیثیت پر منتخب ہوئے۔ اس عہدے پر ایک سال کام کرنے کے بعد سن ۲۰۱۴ء میں ہونے والے ترکی کے صدر منتخب ہوئے۔ ۲۰۱۶ء میں صدر طیب پر وزیر اعظم احمد کو زبردستی مستعفی ہونے پر مجبور کرنے اور ترکی میں صدارتی نظام لاگو کرنے کا الزام بھی آیا۔ ان پر یہ الزام بھی تھا کہ انھوں نے بنالی یلدیرم جو ان کے ساتھی تھے کو وزیر اعظم منتخب کیا۔ اس دوران وزیر اعظم یلدیرم پر کرپشن کے الزامات لگائے گئے جس میں سب سے بڑا الزام محل (اے کے سرائے) کی تعمیر ہے جس کے بعد انھیں معطل کر دیا گیا۔

صدر طیب کے کارناموں میں سب سے بڑا کارنامہ کرد باغیوں سے کامیاب مذاکرات اور ترکی کی یورپین یونین میں شمولیت ہیں۔ ترکی ایک طویل عرصے سے خانہ جنگی کا شکار تھا۔ سن ۱۹۷۸ء سے کرد باغیوں اور ترک فوج کے درمیان جنگ جاری تھی

جسے صدر طیب نے حکومت میں آ کر مذاکرات کے ذریعے ختم کیا اور ترک باغیوں کی جانب سے فوج پر حملوں کو ختم کروایا۔ صدر طیب نے کامیاب خارجہ پالیسی واضع کروائی جس کی وجہ سے ترکی کو یورپی یونین میں ایک اہم مقام حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ ملکی ترقی میں ان کا بہت بڑا ہاتھ ہے انھوں نے ملک میں ہوائی اڈے، سڑکیں بنوائی، ملک میں ذرائع آمد و رفت کو بے انتہا ترقی دی۔ اس کے ساتھ ساتھ صحت اور تعلیم کے شعبوں میں بھی خاطر خواہ کام کیا۔

واضع رہے، جمہوریت اپنی قیادت کی بہادری، حب الوطنی کی وجہ سے عوام کے دلوں پر راج کرتی ہے۔ جب راہنما ملک کے اندر کی شورشوں اور بیرونی سازشوں سے ملک کو بچانے کے لیے کمربستہ ہو جائیں تو عوام اپنے حکمران کی طاقت بن جاتے ہیں لیکن اگر ارضِ وطن کی طرح حکمرانوں کا یہ حال ہو کہ انھیں مرتے ہوئے عوام، سسکتی ہوئی انسانیت کی خبر نہ ہو اس وقت عوام اپنے راہنماؤں کے لیے دعا تک نہیں کرتے۔ ترکی کے عوام نے عوام کی قوت کو ثابت کیا۔ انھوں نے دنیا کو یہ دکھا دیا کہ اگر عوام چاہیں تو وہ کسی بھی شورش کا خاتمہ کر سکتے ہیں اور کوئی بھی حکمران اپنے عوام کی وجہ سے طاقت ور ہوتا ہے۔ ترک عوام نے اپنے صدر، جمہوریت کی حفاظت کی ایک اعلیٰ مثال پیش کی ہے۔ ایسا نہیں کہ کوئی انھیں روکنے والا نہیں تھا یا ان کے لیے یہ آسان تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ ان کا حکمران مسلمانوں کی ایک مضبوط آواز بن کر دنیا کے سامنے

آیا ہے۔ اسی حکمران نے ان کے ملک کو اندرونی خانہ جنگی سے نکال کر ترقی کی راہ پر گامزن کیا ہے اور اگر ترک حکومت کا تختہ الٹ دیا جاتا تو ملک میں جاری ترقی کا تسلسل پھر سے رک جاتا۔ عالمی سطح پر ملک کا امیج خراب ہوتا۔ انھی باتوں کے پیشِ نظر عوام سڑکوں پر نکلے اور حکومت کی حفاظت کے لیے ساری رات سڑکوں پر بسر کی۔ ترک عوام نے دنیا کی افواج کو بھی یہ پیغام دیا ہے کہ افواج کا کام ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے نا کہ ملک پر حکومت اور اگر چند جنرل اکٹھے ہو کر ملکی مفاد کے خلاف فیصلہ کریں گے تو عوام ان کا ساتھ نہیں دیں گے۔

بلوچستان کے تعلیمی ادارے

بوسیدہ دیواریں، گھاس پھوس سے بنی ٹپکتی چھتیں، کچے صحن، بنا چار دیواری کے عمارت ایک تختہ سیاہ اور ایک میز کرسی، طلباء و طالبات کے بیٹھنے کے لیے دری تک موجود نہیں۔ ننھے ننھے طالب علم اپنے بستوں کے ساتھ ساتھ پیڑیاں اٹھائے علم کے حصول کی خاطر یہاں آتے ہیں۔ یہ سکول ایک کمرہ جماعت، ایک صحن ہے پر مشتمل ہے جس کے درمیان ایک تختہ سیاہ رکھا گیا ہے۔ موسم سرما میں ٹھنڈ سے بچنے اور سورج کی تمازت حاصل کرنے کی خاطر، گرمیوں میں ہوا کی خاطر بچوں کو سکول کے صحن میں اگے برگت کے درخت کے سائے میں پڑھایا جاتا ہے کیونکہ اس سکول میں پنکھا نام کی کوئی چیز موجود نہیں۔ مون سون کے موسم میں یہ صحن پانی سے بھر جاتا ہے اور طلبہ و طالبات کو دیوار کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنا پڑتا ہے۔ یہ کھنڈر نما عمارت اس قدر بوسیدہ ہو چکی ہے کہ کسی بھی وقت زمین بوس ہو سکتی ہے۔ یہ منظر سولویں صدی کے سکول کا نہیں، بلکہ یہ منظر گورنمنٹ سکول بلوچستان کا ہے۔ جس میں علم حاصل کرنے کی خاطر بلوچستان میں بسنے والے یہ طالب علم ان نامسائد حالات میں سکول آتے ہیں۔ چونکہ یہ طلبہ غریب خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے یہ اس قابل نہیں کہ ملک کے دوسرے حصوں میں حصولِ علم کی خاطر سفر کریں۔

بلوچستان ، ہمارے ملک کا وہ خطہ ہے جس کی زمین اپنے اندر بیش بہا خزانے چھپائے ہوئے ہے۔ بلوچستان رقبہ کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے اس صوبے کی کل آبادی کم و بیش ایک کروڑ بتیس لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ اگرچہ یہاں کی موجودہ آبادی باقی صوبوں کی نسبت کم ہے لیکن اس کم آبادی کے باوجود اس صوبے کے لوگ بنیادی سہولتوں سے محروم ہیں۔ پورے ملک کی طرح اس صوبے میں بھی تعلیم اور صحت جیسے اہم شعبوں کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ بلوچستان میں چند ایک سرکاری سکول کام کر رہے ہیں جن کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ نجی ادارے اس صوبہ میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بلوچستان میں گورنمنٹ سکولوں کی تعداد 12347 ہے جن میں صرف 6% ہائی سکول ہیں۔ یہاں کے 80% سکول صرف ایک کمرے پر مشتمل ہیں جن میں سے زیادہ تر کی چھتیں گھاس پھوس کی ہیں۔ بلوچستان میں کل بچوں کی تعداد27 لاکھ ہے جس میں سے تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی تعداد صرف 18لاکھ ہے۔66 فی صد بچے جن کی عمریں نو سے سولہ سال ہیں سکول نہیں جاتے۔ بلوچستان میں 76% بچے سرکاری سکولوں میں ،19% بچے پرائیوٹ سکولوں میں، 5% بچے مدرسوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ جبکہ 57% بچے پرائمری کی تعلیم مکمل کیے بنا ہی سکول چھوڑ دیتے ہیں۔ جن بچوں کو پرائمری میں سکولوں میں داخل کروایا جاتا ہے ان کی تعداد865337 ہے جبکہ 191300 بچے مڈل کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

افسوس ناک امر یہ ہے کہ 14% اساتذہ سکولوں میں نہیں آتے جبکہ حکومت سے تنخواہیں وصول کرتے رہتے ہیں۔ صوبہ میں تعلیم کے شعبے کی حالت ناگفتہ بہ ہونے کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پچھلی ایک دہائی میں بلوچستان سے کسی بچے نے کوئی پوزیشن حاصل نہیں کی۔

جمہوریت، آمریت چاہے کوئی بھی حکومت ہو یہ صوبہ تعلیمی اعتبار سے پس ماندہ ہی رہا ہے۔ اگرچہ صوبائی بجٹ میں اس صوبہ کو تعلیمی سہولیات فراہم کرنے کے لیے رقوم بھی مختص کی جاتی ہیں لیکن ان رقوم کا بڑا حصہ کرپشن کی نذر ہو جاتا ہے۔ گورنمنٹ سکولوں کی دن بدن حالت خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں کام کرنے والے اساتذہ کی مشکلات ایک جانب، بچوں کے بیٹھنے کے لیے جگہ کی عدم دستیابی ایک جانب، سکولوں کی عمارتیں ہی اتنی خستہ ہو چکی ہیں کہ کسی بھی لمحے زمین بوس ہو سکتی ہیں۔ جو کہ از خود ایک بہت بڑا رسک ہے۔ جس میں کئی بچوں کی جانوں کو خطرہ لاحق ہے۔ اس کے علاوہ اساتذہ کا جب جی چاہتا ہے جماعت کو سکول کے باہر بیٹھا کر پڑھا لیتے ہیں۔ عمارت کی خستہ حالی کے ساتھ ساتھ برسات کے مہینے میں سکولوں کی ان عمارتوں میں کھڑا پانی، اپنے ساتھ کئی بیماریاں لے کر آتا ہے۔ بلوچستان میں شعبہ تعلیم کے بارے میں اعداد و شمار کسی بھیبا شعور شخص کو چونکا دینے کے لیے کافی ہیں۔

بلوچستان میں شعبہ ء تعلیم کی حالت زار کا اندازہ تعلیم کے چیف منسٹر سردار رضا محمد بریچ کے بیان سے بخوبی ہو سکتا ہے جس میں ان کا کہنا تھا کہ "بلوچستان کے خطے میں کم و بیش 7000 ایسے سکول موجود ہیں جن پر کسی قسم کی کوئی چھت نہیں۔ چھت کے طور پر گھاس پھوس کا استعمال کیا گیا ہے۔ بعض سکولوں کی کوئی چار دیواری نہیں۔ یہ سکول ایک کمرے اور ایک استاد پر مشتمل ہیں"۔ سکول کی نہ صرف عمارت نہیں بلکہ ان سکولوں کو دیکھ کر کوئی نہیں جان سکتا کہ یہ سکول ہی ہیں بلکہ ان سکولوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چند بچوں کو جمع کر کے ایک ہی استاد تعلیم دے رہا چاہے جو بھی جماعت ہو جو بھی مضمون ہو۔ یہاں پڑھنے والے بچے پالش ہوئے جوتوں اور استری شدہ یونیفارم سے قطعی لاعلم ہیں۔ یہ بچے بنا کسی یونیفارم کے پھٹے پرانے جوتے پہنے دور دور سے علم حاصل کرنے آتے ہیں۔

اس صوبے میں غربت کا یہ عالم ہے کہ اساتذہ از خود یونیفارم متعاف کروانے سے قاصر ہیں۔ "ہم یہاں پر یونیفارم متعارف نہیں کروا سکتے کیونکہ یہاں پڑھنے والے طالب علم نہایت غریب ہیں"۔ یہ کہنا تھا ایک استاد کا جس کا تعلق بلوچستان کے ایک سکول سے ہے۔

بعض علاقوں میں سکولوں کی عمارتیں کرایہ پر حاصل کی گئی ہیں اس کے باوجود ان عمارتوں کی حالت بہت اچھی نہیں۔ مٹی سے بنائی گئی دیواروں والے ان سکولوں کا کرایہ بھی حکومت ادا کرتی ہے جن میں پینے کا پانی اور باتھ روم تک موجود نہیں۔ ان سکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طالباء کو صاف پانی گھروں سے لانا پڑتا ہے۔ بات یہاں تک محدود نہیں 216 سکول ایسے ہیں جو سرے سے موجود ہی نہیں اور کئی سکول ایسے بھی ہیں اگر ان کی عمارتیں موجود ہیں تو ان میں نہ اساتذہ ہیں اور نہ ہی طالب علم۔

اگرچہ حکومت بلوچستان نے حال ہی میں آرٹیکل 25-A کے تحت تعلیم کے شعبے میں کام کرنے کا ایادہ کیا ہے اور 63 بلین روپے سکولوں کی بہتری اور مفت تعلیم کے لیے مختص کی گئی ہے۔ تعلیم کو پورے صوبے کے بچوں کے لیے لازمی بنانے کے لیے عملی اقدامات کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ لیکن یہ بیانات صرف بیانات کی حد تک ہی محدود ہیں۔ گذشتہ کئی برسوں سے بلوچستان کے راہنما اس قسم کے دعوے کرتے آئے ہیں لیکن ان دعووں کی کوئی زمینی حیثیت نہیں اور نہ ہی ان دعووں پر پورا اترا گیا۔ یہاں تک کہ بلوچ دارلحکومت کوئٹہ تک کے قرب و جوار میں بھی مفت تعلیم کا سوچنا بھی بے کار ہے۔ گورنمنٹ سکولوں میں ایجوکشن ڈیپارٹمنٹ کے افسران تو درکنار اساتذہ تک آنے کی زحمت نہیں کرتے۔

تعلیم بلوچستان کے غریب طالبہ کے لیے ایک خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ ان طالب علموں کا قصور صرف اور صرف ایک ایسے علاقے میں پیدا ہونا ہے جس کو سیاسی طور پر کبھی ایسے راہنما نہیں ملے جو اس کے بچوں کے بارے میں سوچیں اور تعلیم کے شعبہ کے لیے عملی کام کریں۔ فلاحی تنظیموں، غیر سیاسی تنظیموں نے بھی بلوچستان کو نظر انداکر رکھا ہے۔

میرا پاکستان کیسا ہو؟

میرا پاکستان کیسا ہو؟ ہر ایک پاکستانی اپنے ملک کے لیے سوچتا ہے کہ اس کا ملک کیسا ہو موجودہ حالات کیسے بہتر ہوں؟ یہی سوال میرے ذہن میں بھی اکثر گونجا کرتا ہے۔۔ اس سوال کا جواب اگر تلاشنے نکلیں تو کچھ مشکل نہیں کہ جواب خود سے مل جائے۔
میری یہ خواہش ہے کہ میرا پاکستان ایسا ہو جہاں کسی قسم کی دہشت گردی کا سایہ نہ ہو جہاں کوئی بچہ بھوک سے جان نہ دے، جہاں کسی عورت کو معاشی کمزوری کی وجہ، سے قندیل بلوچ نہ بننا پڑے، جہاں کوئی بھوک کے ہاتھوں تنگ ہو کر خودکشی نہ کرے، جہاں کسی غریب بچے کو کچرے کے ڈھیر سے روٹی کے ٹکڑے نہ چننے پڑیں، جہاں بھیک دینے والے تو ملیں لیکن بھیک لینے والے نہ ملیں، جہاں تاوان کی غرض سے کسی کو اغواء نہ کیا جائے لیکن آخر یہ سب کچھ کیونکر ممکن ہو؟ یہ سبھی کچھ ممکن ہے اگر معاشرے کا صرف دو فی صد حصہ سدھر جائے اور اس دو فی صد میں سے بھی صرف حکمران ہی کسی حد کے ملکی مفاد کے مطابق فیصلے کرنے لگیں تو معاملات بہت حد تک بدل سکتے ہیں۔
پاکستان کو اللہ نے ہر نعمت سے نوازا ہے چاہے وہ زمینی وسائل ہوں یا انسانی۔انسانی وسائل کا استعمال اس وقت احسن انداز سے ہو سکتا ہے جب قدرتی

وسائل کا بہتر استعمال کیا جائے۔ اگر پاکستان میں موجود زمینی وسائل کو استعمال کر لیا جائے تو ملک کے مختلف حصوں میں چھائی ہوئی غربت کے سائے از خود چھٹنے لگیں گے۔ اس کی مثال ارض وطن کے پس ماندہ ترین صوبے میں موجود وسائل ہیں۔ اگر بلوچستان کی سرزمین کا جائزہ لیں تو یہ سرزمین قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔ اس سرزمین میں بیش بہا قدرتی وسائل جن میں قدرتی گیس، کاپر اور سونے کے ذخائر، قیمتی پتھر وسیع پیمانے پر پائے جاتے ہیں۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال حال ہی میں دریافت ہونے والی ریکوڈک تحصیل چاغی کے مقام پر سونے کی کان کی دریافت ہے۔ اس علاقے کی کل آبادی دو لاکھ ہے جس میں افغان مہاجرین بھی شامل ہیں۔ دو لاکھ کی آبادی والے اس علاقے میں اگر زمین سے قدرتی معدنیات نکالنے کا آغاز ہو جائے تو اس علاقے کے لوگوں کو روزگار کے مواقع حاصل ہوں گے اور اگر اس کان سے حاصل ہونے والے سونے کو مقامی طور پر زیورات میں ڈھالنے کا کام کیا جائے تو اس علاقے کے معاشی حالات میں خاطر خواہ بہتری آسکتی ہے اور ان زیورات کی درآمد سے ملک میں غیر ملکی زر مبادلہ کے ذخائر میں اضافہ ہوگا۔ یہ تو صرف ایک کان ہے اس کے علاوہ اس صوبہ میں قدرتی وسائل کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ یہاں سوئی کے مقام سے حاصل ہونے والی قدرتی گیس کے ذخائر کے علاوہ خام تیل کی موجودگی کے شواہد بھی ملے ہیں۔ بلوچستان ہی میں توت کے مقام پر خام تیل کی موجودگی صرف اور صرف اس کے استعمال کی منتظر ہے اس کے علاوہ کوئٹہ کے قرب و جوار میں سلفر کوئلے کوئلہ

کی موجودگی اس علاقے کی قدر و قیمت میں اضافے کا سبب ہے بلوچستان ہی میں کنگری بھی کہا جاتا کے ذخائر بھی دریافت ہوئے lignite کے مقام پر براؤن کوئلہ جس کو بنانے کے کام آتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ Humic Acid ہیں جو کہ 44%-79% تک کیمیائی کھادوں کی تیاری میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ گزشتہ برسوں میں بلوچستان میں تیل اور گیس کی دریافت کا کام روک دیا گیا تھا جس کی حال ہی میں پھر سے اجازت دے دی گئی ہے۔ ہر ایک تیل کے کنویں سے 800-1200 تک افراد کو روزگار کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ بلوچستان میں موجود انھی وسائل کی وجہ سے عالمی طاقتوں اور بھارت کی نگاہیں اس صوبے پر ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ اس سرزمین کے وسائل کو اول تو استعمال نہیں کیا جاتا اگر استعمال کیا بھی جائے تو اس علاقے کے لوگوں کو ان وسائل سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اس صوبے میں سکول نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کی عدم موجودگی یہاں کے نوجوان نسل کو ملک کے کسی اور حصے میں بھی روزگار نہیں ملتا۔ اس علاقے کے لوگوں میں احساسِ محرومی، غربت اور تنگ دستی کی وجہ سے ہے۔ یہ غربت اور احساسِ محرومی ہی ہے جس کی وجہ سے اس صوبے میں بغاوت نے جنم لیا۔

صرف بلوچستان ہی نہیں بلکہ پورا پاکستان انواع و اقسام کے وسائل سے مالا مال ہے۔ ، شمالی علاقہ جات اعلیٰ نسل کے قیمتی پتھروں سے بھرپور ہیں

پنجاب میں زراعت کا بہترین انتظام موجود ہے۔ سندھ میں بھی کوئلے کے وسیع ذخائر موجود ہیں جو کہ دنیا میں پانچویں بڑے ذخائر ہیں۔ ان ذخائر کی موجودگی اس امر کے شاہد ہیں کہ پاکستان میں توانائی کے متبادل ذرائع بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ لیکن ہمارے پاس وہ جرات مند اور بصیرت قیادت موجود نہیں جو ان ذخائر کی دریافت کے معاملے میں سنجیدہ ہو۔ قدرتی وسائل کی دریافت کے لیے بنائے گئے ادارے بھی ان وسائل کی دریافت کے لیے ٹھوس اقدامات نہیں کر رہے کیونکہ ان اداروں کے اختیارات بھی محدود ہیں۔ ایسا نہیں کہ ہمارے ملک میں وسائل کی کمی ہے بلکہ ہمارے ملک میں وسائل کا استعمال ہی نہیں کیا جا رہا۔ قدرتی وسائل زمین کے اندر ہی صدیوں سے دفن ہیں۔ ان ذخائر کی دریافت کی جانی چاہیے تاکہ ملک میں جاری توانائی اور بے روزگاری کے بحران پر قابو پایا جاسکے۔ صرف یہی نہیں ضروری یہ بھی ہے کہ اس صوبے کی زمین سے حاصل ہونے والے آمدنی کو اس صوبے کی ترقی کے لیے بھی استعمال کیا جائے تاکہ اس صوبے کے لوگوں میں موجود احساسِ محرومی کا خاتمہ ممکن ہو۔ اس طرح صوبے اور وفاق کے درمیان موجود خلیج کو بھی کم کیا جاسکتا ہے۔
اس کے علاوہ سندھ میں گھارو کے مقام پر ہوا کی رفتار اور اس کی سمت اس نوعیت کی ہے جو قدرتی طور پر پون چکی کے لیے نہایت مناسب ہے۔ صرف ایک بار گھارو کے علاقے میں اگر پون چکیاں لگا دی جائیں تو بجلی کا شارٹ فال ختم

ہو جائے گا جس کی وجہ سے کاروبار میں اضافہ ہو گا۔ نئ سے نئ فیکٹریاں لگائی جا سکیں گی اور وہ سرمایہ کار جو بجلی کی کمی کی وجہ سے ہونے والے نقصان کے سبب پاکستان کو چھوڑ کر جا چکے ہیں وہ پاکستان میں واپس آئیں گے۔

قدرتی وسائل کا احسن استعمال ملک میں سرمایہ کاری میں اضافہ کا سبب بنے گا اور سرمایہ کاری میں اضافہ روزگار کے مواقع پیدا کریگا۔ جب زیادہ افراد کو روزگار مہیا ہو گا تو غریب گھرانوں کے بچے مزدور بنیں گے نہ کہ دہشت گرد۔ کیونکہ دہشت گردی کی فضاء تب قائم ہوتی ہے جب روزی روٹی کا کوئی انتظام نہ ہو، تعلیم میں اس حد تک کمی ہو کہ غریب ماں باپ کی اولاد کو احساسِ محرومی دہشت گردی کی جانب مائل کر دے۔ یا دوسری صورت میں میرٹ کی عدم موجودگی اور کرپشن پڑھے لکھے نوجوانوں کو اس حد تک غم و غصہ کا شکار کر دیتے ہیں اور وہ اپنے اندر ابلتے ہوئے نفرت کے لاوا کو دہشت گرد بن کر نکالتے ہیں۔

یہ امر ایک تلخ حقیقت ہے کہ کوئی بھی شخص برائی کے راستے پر از خود نہیں چلتا بلکہ اس کے حالات اس کو کوئی بھی راہ چننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر جرائم پیشہ افراد کے ساتھی بن جاتے ہیں جبکہ کچھ لوگوں میں پنپتا احساسِ محرومی جو کہ گورنمنٹ جاب میرٹ کی غیر

موجودگی، پرائیوٹ جاب کی عدم موجودگی کی بنا پر ہوتا ہے۔ گورنمنٹ ملک کے تمام تعلیم یافتہ طبقہ کو روزگار فراہم کرنے سے قاصر ہے کیونکہ ملک میں حکومتی اداروں میں نوکریاں کم جبکہ پڑھے لکھے افراد کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ روزگار کے مواقع میں اضافہ کے لیے ضروری ہے کہ پرائیوٹ سیکٹر کو ترقی دی جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ملک میں موجود قدرتی وسائل کی تلاش اور استعمال کرنے میں سنجیدگی اختیار کی جائے۔ ارضِ وطن میں وسائل کی نہیں صرف بصیرت رکھنے والی قیادت کی کمی ہے۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

ہم دن ہی منایا کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔

اگست کے مہینے کے آغاز کے ساتھ ہی ملک کے طول و عرض میں جا بجا بکتے سبز ہلالی پرچم ،گلیوں محلوں میں لگے سٹال اور دن رات بجتے قومی اور ملی ترانے قوم میں جوش وجذبہ کی غماز ہے۔ اگست کے آغاز سے ہی چہار جانب سبز رنگ نمایاں نظر آتا ہے چاہے وہ فیس بک پر قومی پرچم کی ڈی پی ہو، زیورات ہوں اور تو اور اب تو ملبوسات میں بھی سبز رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ آغاز اگست کے ساتھ ہی ملک میں چراغاں کیا جاتا ہے، سرکاری عمارات کو قومی پرچموں اور برقی قمقموں سے سجایا جاتا ہے اس کے علاوہ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تقریبات کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ تمام سیاسی جماعتیں اپنے اپنے علاقے میں جلسے جلسوں کا اہتمام کرتی ہیں۔ قائدِ اعظم اور علامہ اقبال کے مزار پر گارڈز کی تبدیلی کی روح پرور تقریبات منعقد کی جاتی ہیں۔ مساجد، چرچوں اور تمام عبادت گاہوں میں ملک کی ترقی، سلامتی اور خوشحالی کی خصوصی دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ چودہ اگست تک یہ جوش و ولولہ برقرار رہتا ہے لیکن چودہ اگست کا دن گزر جانے کے بعد نہ صرف یہ جوش و ولولہ دھیما پڑ جاتا ہے بلکہ کاغذ کی بنی سبز جھنڈیاں گلیوں سڑکوں اور نالیوں میں گری ہوئی ملتی ہیں جنھیں کوئی محبِ وطن شخص تو چن کر سنبھالتا ہے لیکن جس نے ان جھنڈیوں سے گھر کو سجایا تھا اور اس جھنڈے کے

عزت و وقار سے آگاہ نہیں وہ ان کے زمین پر گرنے، نالیوں میں بہ جانے کا کوئی خیال نہیں رکھتا، نہ ہی انھیں اس پرچم کی اہمیت اور عزت و احترام کا اندازہ ہے۔

یوم آزادئ پاکستان ہمیں یہ احساس دلاتا ہے کہ یہ وطن جس میں آج ہم سکون کا سانس لے رہے ہیں صرف ایک زمین کا ٹکڑا نہیں بلکہ یہ ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جس کو استعمال کرتے ہوئے ہم اسلام کی سربلندی کے لیے خدمات سرانجام دے سکتے ہیں، یہ سبز ہلالی پرچم صرف کپڑے کا یک ٹکڑا نہیں بلکہ یہ پرچم دنیا میں ہماری پہچان ہے اور زمین کا یہ ٹکڑا اسلام کی بقاء کا ضامن، ہماری ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی عزت و آبرو کی حفاظت کا ضامن اور ہمارے نظریات کی حفاظت کے لیے ہمیں عطاء کیا گیا ہے۔ یہ وہ زمین ہے جس میں بستے ہوئے ہم بلا روک ٹوک اپنے مذہب پر عمل کر سکتے ہیں، راتوں کو سکون کی نیند سوتے ہیں۔ جو لوگ نظریہ پاکستان اور دو قومی نظریہ کے خلاف ہیں ان سے میرا ایک سوال ہے کہ اگر ہندوؤں کے ساتھ ایک ملک میں رہنا آسان ہے تو کیا ہندو، بھارت میں بسنے والے مسلمانوں کو سکون کا سانس لینے دے رہے ہیں؟ نہیں بلکہ مسلمانوں کی حالت ہندوستان میں کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ نظریہ پاکستان کے خلاف بولنے والے کیا یہ برداشت کر سکتے ہیں کہ ان کے بھائی یا بیٹے ان کی آنکھوں کے سامنے قتل کر دیئے جائیں یا سرعام ان کی بہنوں، بیٹیوں کی بے

عزتی کی جائے یا انھیں بے گناہ ہوتے ہوئے بھی صرف مذہب کی بنیاد پر سزا دی جائے ؟نہیں۔ یہ سب برداشت کرنا آسان نہیں۔

یاد رکھیے ! مقبوضہ علاقوں میں بسنے والے مسلمان بدتر زندگی گزار رہے ہیں، آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والے اپنے بیٹوں، اپنی بیٹیوں کی عزتوں کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں۔ انھیں بدتر مظالم کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ بھارت میں بسنے والے مسلمانوں کی حالت زار یہ ہے کہ ایک گائے کو ذبح کر دینے پر پورا مسلمان خاندان تشدد کا شکار ہو جاتا ہے۔پاکستان کے خلاف پاکستان میں بیٹھ کر زہر اگلنے والوں سے میری ایک گذارش ہے کہ بخدا یہ وطن جیسا بھی ہے آپ کا اپنا ہے، آپ کو اس سے رزق ملتا ہے، آپ کی زندگی کی بقاء، آپ کے بچوں کی حفاظت، آپ کی دنیا میں پہچان اسی ملک، پاکستان کی وجہ سے ہے۔جس کشتی میں آپ سوار ہیں اگر اس میں چھید کریں گے تو وہ کشتی ڈوب جائے گی اور اگر کشتی ڈوب گئی تو بچیں گے آپ بھی نہیں۔ بخدا بھارتی گجرات میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے مظالم کو نہ بھولیے، بھارتی گجرات میں مسلمانوں کا قتلِ عام ان کے مذہب کی وجہ سے ہوا۔ سمجھوتہ ایکسپریس کا سانحہ ابھی بہت پرانا نہیں ہوا۔ مقبوضہ کشمیر میں ہونے والے مظالم سے کون واقف نہیں، دن بدن ان مظالم میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایک نظر فلسطین پر بھی ڈالیے جہاں نہتے مسلمان بچے تک بموں کا شکار ہو چکے ہیں۔ مقبوضہ علاقوں کا

دکھ ایک جانب. برما ہی کو لیجیے جہاں چار چار سو مسلمانوں کو ایک ہی وقت میں قتل کر دیا جاتا ہے اور یہ قتل کسی بغاوت کو کچلنے کے لیے نہیں، نہ ہی یہ کوئی دہشت گردی کی جنگ ہے بلکہ یہ نہتے انسان، اپنے مسلمان ہونے کی وجہ سے مارے جاتے ہیں۔ صرف یہ نہیں مغربی ممالک جہاں مسلمان کئی کئی سالوں سے آباد ہیں وہاں آج تک ان کو اول درجہ کے شہری کی حیثیت نہیں دی گئی۔ اور اگر دی بھی گئی تو ان سے متوازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ نرم بستروں پر سونے والے اور منرل واٹر کا استعمال کرنے والے اس جذبے اور اس دکھ کا اندازہ کیسے کر سکتے ہیں جس کے عوض ہمارے اجداد نے اپنے خون کا صدقہ دے کر ہمارے ہاتھوں میں زمین کا یہ ٹکڑا تھما دیا۔ ان گنت لوگوں کے خون سے سینچی گئی یہ سرزمین اس لیے نہیں حاصل کی گئی تھی کہ اس میں بسنے والے اسی کو برا بھلا کہیں۔ آزادیء رائے کا حق اپنی جگہ درست لیکن دھیان رہے آزادیِ رائے کے پیراہن میں اپنے ہی ملک کی برائی یا بدنامی کا سبب نہ بنیں۔ دنیا میں اپنے لفظوں کے ذریعے ملک کو ہرگز ہرگز بدنام نہ کریں۔

ذرا سوچیے پاکستان ہے کون؟ میں اور آپ۔ ہم خود ہی معاشرہ ہیں اور ہم خود ہی پہچان۔ ہم میں سے ہر شخص پاکستان کا سفیر ہے۔ ہر شخص چاہے وہ بیرونِ ممالک سفر کر رہا ہو۔ جس کا تعلق میڈیا سے ہو، وہ کوئی طالب علم ہو، جو کھیلوں میں حصہ لے رہا ہو جو اعلیٰ عہدے پر متعین ہے ہم سب پاکستان کے،

سفیر ہیں ۔ ہم ایک اکائی ہیں ، دیوار میں ایک اینٹ کی حیثیت رکھتے ہیں ، اگر ایک اینٹ بھی درست نہ ہو تو پوری دیوار کمزور ہو جاتی ہے ۔اس لیے ہر اکائی کو ، ہر اینٹ کو خود احتسابی کے عمل سے گزرنا ہوگا اور اپنے حصے کا فرض ادا کرنا ہوگا۔اگر ہر ایک شخص اپنے حصے کا فرض ادا کرے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ پورے کا پورا معاشرہ از خود سدھر جائے اور یہ ملک جنت نظیر بن جائے ۔ ہمیں بحیثیت قوم شکر ادا کرنا چاہیے کہ یہ مقدس زمیں عطاء ہوئی اس کا احترام کریں بلکہ کوئی ایسا عمل نہ کریں جو اس سرزمین کے لیے بدنامی کا سبب بن جائے ۔

تہوار ، قومی دن منانا اس لیے ضروری ہے کہ اس طرح کے جشن نئ نسل کو اپنی روایات اور اقدار کی منتقلی کا ذریعہ بنتے ہیں ۔ آج کے نوجوان کا جوش و جذبہ کل کے نوجوان کے لیے ایک سبق ہے ، جو کام آج کا نوجوان کرے گا کل کا نوجوان اس سے وہی سب سیکھے گا ایک نسل اپنے ہاتھوں سے اقدار ، روایات اگلی نسل میں منتقل کرتی ہے ۔ تہوار منانا ضروری ہے لیکن صرف تہوار منا لینے پر اکتفا کر لینا ہی عقلمندی نہیں بلکہ ملک کی ترقی کے لیے عملی اقدامات کرنا از حد ضروری ہے ۔

آیئے ! اس بات کا عہد کریں کہ یہ ملک جو اللہ نے ہمیں ایک نعمت کی طرح عطاء کیا

ہے اس کی حفاظت کریں گے اور اپنے فکر و عمل سے یہ ثابت کر دیں گے کہ ہم اس ملک کی خاطر اپنی جان قربان کرنے سے دریغ نہیں کریں گے، اس ملک کی عزت کی خاطر ہر وہ کام کریں گے جس سے ہمارے ملک کا نام اقوام عالم کے درمیان ایک درخشاں ستارے کی مانند چمکے اور وہ تمام ممالک جن کی نظر میں پاکستان ایک کرپٹ ملک، پاکستانی قوم ایک کرپٹ قوم کے طور پر جانی جاتی ہے وہ اپنے افکار پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

شرپسند عناصر کی ساز باز یا بلوچستان کی تحریکِ آزادی

بلوچستان ، ارضِ وطن پاکستان کا رقبہ کے لحاظ سے سب سے بڑا جبکہ آبادی کے لحاظ سے سب سے چھوٹا صوبہ ہے۔ یہ صوبہ قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔ انواع و اقسام کے قدرتی خزانے اپنے اندر سموئے ہوئے یہ زمین دنیا بھر کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے چاہے وہ افغانسان ہو، بھارت ہو، امریکہ ہو یا پھر ایران۔ بلوچستان میں مختلف قبائل آباد ہیں۔ ملک کی آزادی کے وقت بلوچ قبائل نے پاکستان سے الحاق کا فیصلہ کیا خصوصا خان آف قلات نے تحریکِ پاکستان کو کامیاب بنانے کے لیے قائدِ اعظم کی مالی امداد بھی کی اور نوزائیدہ ملک کے لیے بھی اپنا سرمایہ صرف کیا۔ اسی دولت کی بدولت پاکستان اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل ہوگیا۔ صرف یہی نہیں بھارت سے ہونے والی جنگوں میں بلوچوں نے نہ صرف اپنے وفاق کا عملی ساتھ دیا بلکہ انھوں نے حکومت پاکستان کی مالی امداد بھی کی۔

کچھ نام نہاد محققین اور مفکرین کا کہنا ہے کہ بلوچستان میں مسلح شرپسند نہیں بلکہ بلوچستان میں آزادی کی تحریک چلائی جا رہی ہے تو میں یہاں یہ وضاحت کرتی چلوں کہ آزادی کی تحریکوں میں خود کش دھماکے نہیں کیے جاتے۔ کوئی بھی تحریک آزادی مسلح گرہوں کے ذریعے نہیں چلائی جاتی، نہ ہی تحریک

آزادی میں ملکی املاک کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ ان شر پسند عناصر کی گوادر پورٹ پر چینی کارکنوں کے خلاف کاروائی اس بات کی غماز ہے کہ یہ جو لوگ بھی ہیں، ملکی یا غیر ملکی یہ بلوچستان کی ترقی سے خائف ہیں اور نہیں چاہتے کہ اس صوبہ میں بھی بیرونی سرمایہ کاری ہو یا یہاں کے لوگوں کو باعزت روزگار حاصل کرنے کا موقع دیا جائے ۔مقبوضہ کشمیر، یا فلسطین کی تحریکِ آزادی ہی کو مثال لیجیے، اس قسم کی کاروائیاں صرف اور صرف وہاں ہوتی ہیں جہاں ملک دشمن عناصر، اس ملک کی ترقی کی راہ میں حائل ہونا چاہتے ہوں۔ اگر یہ کوئی تحریکِ آزادی ہوتی تو اسے عوام کی تائید حاصل ہوتی لیکن ایسا نہیں۔ عوام کی جانب سے کسی قسم کی کوئی ریلی، جلوس نہیں نکالا گیا اور نہ ہی کبھی کسی سرکاری دفتر میں کوئی یاداشت پیش کی گئی۔

بلوچستان میں تحریکِ آزادی کی آڑ میں کام کرنے والے عناصر کو بھارت کی کھلی تائید حاصل ہے۔ بھارتی میڈیا بلوچستان میں ہونے والے شر پسند عناصر کی کاروائیوں کو پوری دنیا کے سامنے تحریکِ آزادی بنا کر پیش کر رہا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ تاریخ کو بھی مسخ کرنے کی کوششوں میں مصروفِ عمل ہے۔ بھارتی میڈیا بلوچستان کو ایک مقبوضہ علاقہ کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے جو کہ سراسر غلط ہے۔ اس کے علاوہ بھارتی میڈیا کا دعوی ہے کہ اگر بھارت بلوچستان کا ساتھ دیتا تو آج بلوچستان بھارت کا حصہ ہوتا۔ اس طرح

کی کئی وڈیوز آپ کو یوٹیوب پر باآسانی مل جائیں گی۔ یہ ایک ایسا پراپوگنڈا ہے جس کا مقصد دنیا کی نظروں کو کشمیر سے ہٹا کر بلوچستان کی جانب مبذول کرا دینا ہے۔ پاکستان کے انتظامی اداروں کے خلاف لڑنے والے یہ شرپسند پاکستان کو مزید ٹکڑوں میں تقسیم کر دینا چاہتے ہیں۔ اس قسم کے انٹرویوز، خبریں آپ کو صرف اور صرف بھارت میڈیا میں دیکھائے جائیں گے۔ عالمی میڈیا میں نہ تو ایسی کوئی خبر موجود ہے اور نہ ہی تحریک آزادیء بلوچستان کا کوئی وجود ہے۔ بھارت کی بلوچستان میں دراندازیوں اور بلوچستان میں شرپسندوں کی عملی امداد کا اندازہ براہم داس بگٹی کا وہ انٹرویو سے لگایا جا سکتا ہے جس میں اس نے بھارت کے میڈیا، بھارتی حکومت، بھارت کی فارن پالیسی اور عوام کی امداد کا باقاعدہ شکریہ ادا کیا ہے۔ اس نے بھارت کے دو بڑے اداکاروں شاہ رخ خان اور امیتابھ بچن کو بلوچستان پر فلم بنانے کی دعوت دی ہے۔ یہاں تک کہ براہم داس بگٹی کا کہنا یہ تھا کہ بنگلہ دیش کی طرز پر بلوچستان کی بھی امداد کی جائے اور اسی انٹرویو میں اس نے بھارت کی حالیہ امداد کا شکریہ بھی ادا کیا۔

بھارت کے وزیرِ اعظم نریندر مودی کا بیان جس میں انھوں نے کہا ہے کہ بھارت بلوچستان کی آزادی کے لیے لڑنے والوں کا ساتھ دے گا۔ بھارتی وزیر اعظم ہی کے ایک اور بیان میں انھوں نے کہا کہ پاکستان کو اب بلوچستان اور آزاد کشمیر

میں ہونے والے مظالم کا جواب دینا ہوگا۔اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ بلوچستان کو پاکستان سے الگ کرنے لیے ایک مضموم سازش کی جارہی ہے جس میں بھارت کا اہم کردار ہے اور بلوچستان کے عوام کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔بھارتی وزیرِ اعظم کے بیانات کے خلاف بلوچستان کے مختلف علاقوں میں مظاہرے کئے گئے، ریلیاں نکالی گئی۔ خصوصا چمن میں بابِ دوستی کی جانب مارچ کیا گیا، ڈیرہ مراد جمالی میں قومی شاہراہ پر دھرنا دیا گیا، نوشکی، ڈیرہ بگٹی، قلات ،پنجگور اور دیگر شہروں میں ریلیاں نکالی گئی، ترنگا اور نریندر مودی کے پتلے نذرِ آتش کئے گئے۔ یہ احتجاج نام نہاد تحریک آزادی کے خلاف تھا۔اس کے علاوہ بلوچستان کے عوام کا جذبہ حب الوطنی چودہ اگست کو نکالی جانے والی ریلیوں، بنجر پہاڑوں پر سبز ہلالی پرچم کی پینٹنگز سے کیا جا سکتا ہے۔ملک کی بقاء کے حق میں نکالی جانے والی ریلی بلوچستان کے عوام کے جذبات کی عکاس ہے ۔اگرچہ کچھ بلوچ راہنما ملک کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں تاہم ان کے بیانات کا عوام کے جذبات سے کوئی تعلق نہیں۔پاک فوج اور پاکستان کے خلاف زہر اگلنے والے ان راہنماؤں کو یہ بات یاد رکھنے چاہیے کہ بلوچستان اگر احساس محرومی کا شکار ہے تو اس میں ان کا اپنا کردار اسی فی صد تک ہے کیونکہ انھیں فنڈز، حکومت، سب کچھ باقی صوبوں کی طرح حاصل ہے۔اگر وہ بلوچستان کے لیے اپنی ذاتیات سے ہٹ کر کام کر یں، یہاں کے خزانوں کو زمین سے نکال کر اس صوبے کی عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کریں۔ صوبے میں

ترقیاتی کام شروع کئے جائیں تو کچھ بعید نہیں کہ یہ صوبہ بھی ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے ۔اگر اس صوبے میں بھی روزگار کے مواقع موجود ہوں تو کوئی سادہ لوح بلوچ روزی روٹی کی خاطر ان شر پسند عناصر اور تنظیموں کا آلہ کار نہ بنے اور نہ ہی کوئی خود کش حملے کے لیے تیار ہو۔

ملک کے دیگر علاقوں کی طرح افواجِ پاکستان ان شر پسند عناصر کے خلاف جنگ اور ان عناصر کی سر کوبی کے لیے مستعدی سے کوشاں ہے۔ شر پسند عناصر کی سر کوبی کے لیے کی کئی کوششوں میں ان گنت فوجی جوان شہادت کے عہدے پر فائز ہو چکے ہیں جن میں سے بلوچستان کے کم اور دیگر صوبوں کے فرزندوں کی تعداد زیادہ ہے۔ بلوچستان میں حالت کو بہتری کی جانب لانے کے لیے ضروری ہے کہ افواجِ پاکستان ، سیکیورٹی اداروں کے ساتھ ساتھ سیاسی عناصر بھی اس صوبے کی جانب خصوصی توجہ دیں ۔امن وامان کی صورت حال کو بہتر بنایا جائے ۔ ملک کے خلاف بیانات دینے سے گریز کیا جائے ۔ بلوچستان کے نام پر سیاست نہ کریں بلکہ اس صوبہ کی بہتری کے لیے عملی اقدامات کریں ۔سیاست میں حب الوطنی کو نہ بھولا جائے ایسے تمام بیانات سے گریز کیا جائے جن سے شر پسند عناصر کو تقویت ملے۔یاد رکھیے ! دشمن کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ پاکستان کو اندرونی طور پر اس حد تک کمزور کر دیا جائے کہ وہ اپنی سرحدوں کی جانب سے غافل ہو جائے اور ایسے وقت اگر اپنے ہی ملک کے خلاف بولنے لگیں گے تو فائدہ باہر حال

دشمن اٹھائیں گے۔

یہ امر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ کوئی بھی شرپسند یا دہشت گرد گروہ اس وقت تک اپنی کاروائیوں میں کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ عوام اس کا ساتھ نہ دیں اور بلوچستان کے عوام پاکستان کا حصہ ہیں۔ بلوچستان کو پاکستان سے جدا کرنے کی سوچ ایک دیوانے کے خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

اغواء ہوتے ہوئے معصوم

لاہور کے ایک گنجان آباد علاقیکے ایک نالے میں معصوم بچے کی تیرتی لاش نے لوگوں کو اس نالے کے گرد اکٹھا ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ بچے کی لاش مسخ ہو چکی تھی ۔ اس کے ماں باپ نے اس بچے کی کلائی پر بندھے سرخ ربن کی وجہ سے اسے پہچانا۔ اپنی اولاد کی لاش کو اس طرح گندے پانی کے نالے میں پڑے دیکھنا کس قدر مشکل ہے اس کا اندازہ وہی والدین کر سکتے ہیں جن کے جگر گوشے اغواء ہونے کے بعد قتل کر دیئے گئے۔ کوئی بھی شخص ان ماؤں کے دکھ کا اندازہ نہیں کر سکتا جو اپنے معصوم بچے کو کھو چکی ہو، اس بات کے انتظار میں ہیں کہ ان کے اغواء ہونے والے بچے ایک نہ ایک دن پھر سے گھروں کو لوٹ آئیں گے لیکن ایسا نہ ہو۔ پولیس اپنی کوشش کے باوجود ان اغواء کرنے والوں کو پکڑنے سے قاصر ہے۔ پچھلے چند دنوں سے متواتر بچوں کے اغواء کی خبریں اخبارات اور میڈیا کی زینت بن رہی ہیں ۔ اغواء ہونے والے بچوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک سروے کے مطابق اغواء ہونے والے بچوں کی تعداد سن 2015ء کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ اغواء ہونے والے بچوں میں مختلف عمر کے بچے شامل ہیں ۔ ان بچوں کی عمریں بالعموم نو مولود سے بارہ سال تک ہیں ۔ اغواء ہونے والے بچوں کی لاشیں زیادہ تر یا تو کسی ندی نالے میں پڑی ہوئی ملتی ہیں یا پھر وہ گمشدہ ہی رہتے ہیں

۔ان میں سے کچھ واقعات کی رپورٹ درج کروائی جاتی ہے جبکہ کچھ واقعات کی ایف آئی ار بھی درج نہیں ہوتی۔

پورے ملک میں اغواء یا گمشدگی کے واقعات میں متواتر اضافہ پولیس کی کارکردگی پر سوالیہ نشان ہے جبکہ پولیس کا کہنا ہے کہ ان واقعات میں سے اکثر و بیشتر میں بچے از خود گھروں سے بھاگ جاتے ہیں لیکن والدین اور بچوں کی گمشدگی اور بازیابی کے لیے کام کرنے والی این جی اوز کا کہنا ہے کہ چودہ سال سے زائد عمر کے بچے اگر لاپتہ ہوں تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ گھر سے بھاگ گئے ہیں کیونکہ اس عمر کے بچوں میں قوتِ فیصلہ موجود ہوتی ہے لیکن اس سے کم عمر کے بچے اپنی مرضی سے گھر سے نہیں بھاگتے۔انھیں کسی نہ کسی طور پر اغواء کیا جاتا ہے۔

بعض اخبارات اور سوشل میڈیا پر بچوں کی گمشدگی اور ان کے اعضاء کی بیرونِ ملک درآمد کی روح فرساء خبریں بھی آ رہی ہیں۔پولیس رپورٹ کے مطابق رواں سال میں گمشدہ بچوں کی تعداد 767 جبکہ ان میں سے 722 کو بازیاب کروالیا گیا۔ یہ اعدادو شمار پولیس کی درج کردہ رپورٹوں سے حاصل کیے گئے ہیں تاہم بہت سے ایسے واقعات بھی ہیں جن کی کسی قسم کی کوئی رپورٹ درج نہیں کروائی جاتی۔پولیس کی کارکردگی اگر بہتر ہو تو اغواء کے کیسز میں کچھ تو

کی آئے۔ کثیر پیمانے پر بچوں کی گمشدگی کے بارے میں حکومتی نمائندگان کا کہنا ہے کہ اس طرح کے واقعات ہوتے رہتے ہیں گویا ان کی نظر میں یہ ایک معمولی واقعہ ہے ۔حکومتی ارکان اوراپوزیشن کوئی اس معاملے کو سنجیدگی سے لینے پر تیار ہی نہیں ۔ ان واقعات کا اگر تفصیلا جائزہ لیا جائے تو یہ بات حیران کن ہے کہ زیادہ تر واقعات جن کے لیے والدین نے پولیس سٹیشنز کے سامنے مظاہرے بھی کئے جن میں خواتین بھی شامل تھیں ۔ کوئی عورت اس وقت پولیس سٹیشنز کے سامنے مظاہرے کے لیے اس وقت تک نہیں نکلتی جب تک کہ یہ ادارہ اپنا کام کرنے میں ناکام نہ ہو چکا ہو اور وہ عورت انصاف نہ ملنے کی وجہ سے مایوس اور ماتم کناں نہ ہو۔

بچوں کے اغواء کے واقعات پر اگر غور کیا جائے تو ان واقعات میں اغواء برائے تاوان کے کیسز تقریبا نہ ہونے کے برابر ہیں، کچھ واقعات میں بچوں کی لاشیں ملی جن کو جسمانی تشدد کے بعد قتل کیا گیا تھا جبکہ بعض تا حال لاپتہ ہیں ۔ واضح رہے یہ کوئی عام گروپ نہیں ہے بلکہ یہ ایک مافیا ہے جو بچوں کے اغواء جیسے جرائم میں ملوث ہے ۔اگر یہ کوئی عام گروہ ہوتا تو اغواء کے بعد تاوان حاصل کرتااور یہ کسی ایک شہر میں ہوتا پورے ملک خصوصا کراچی اور لاہور جیسے بڑے شہروں میں اس قسم کی کاروائیاں کوئی عام گروہ نہیں کر سکتا۔

بعض اخبارات اور سوشل میڈیا کی خبروں کے مطابق اغواء ہونے والے بچوں کے اعضاء بیرونِ ملک سمگل کیئے جاتے ہیں۔اگر ان خبروں کو درست مان لیا جائے کہ یہ اغواء کنان بچوں کے جسمانی اعضاء کی سمگلنگ میں ملوث ہیں تو یہ بات روزِ روش کی طرح عیاں ہے کہ بنا سرکاری حکام کے، کسٹم افسران، پولیس، ماہر ڈاکٹروں کے یہ سمگلنگ ممکن ہی نہیں ہے۔انسانی اعضا ئکو محفوظ کرنا کسی ڈاکٹر یا سرجن کی مدد کے بغیر ممکن نہیں جبکہ انسانی اعضاء کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پر لے کر جانا یہاں تک کہ بیرونِ ملک سمگل کرنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہسلامتی کے اداروں میں کام کرنے والے اشخاص اس کام میں ملوث نہ ہوں اور ایک پورا نیٹ ورک نہ ہو جو اس گھناؤنے کاروبار میں شامل ہو۔

بچوں کے اغواء کے بڑھتے ہوئے واقعات کے خلاف سپریم کورٹ نے سو موٹو ایکشن بھی لیا جبکہ پنجاب کے چیف منسٹر جناب شہباز شریف نے ایک ٹاسک فورس بھی تشکیل دی لیکن ان سب کا اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں جب تک کہ تمام ریاستی ادارے اس معاملے میں سنجیدہ نہ ہو ں۔ایسا نہیں کہ ہمارے ملک میں قوانین موجود نہیں بلکہ ہمارے ملک میں قوانین کی پابندی نہیں کی جاتی۔ان واقعات کو بھی کم کیا جاسکتا ہے اگر پولیس کے نظام کو سدھار لیا جائے کیونکہ پولیس وہ واحد ادارہ ہے جو ان کاروائیوں کا نہ صرف تدارک کر سکتا ہے بلکہ اگر پولیس افسران بنا کسی سیاسی دباؤکے کام کریں تو ان واقعات میں خاطر خواہ کمی لائی جا سکتی ہے۔یاد رہے عوام کے بچے اس وقت محفوظ ہوں گے جب خواص کے

بچے اور عوام کے بچے ایک حیثیت پائیں گے ۔ یہاں ماضی کے ایک واقعہ کو بیان کرتی چلوں ۔

نوب کالا باغ ایک سخت گیر ایڈ منسٹر ٹر تھے ۔ان کے دور میں لاہور سے ایک پانچ سال کا بچہ اغواء ہو گیا۔ نواب نے ایس ایس پی کو بلا کر بچے کو چوبیں گھنٹوں میں بازیاب کروانے کا حکم دیا۔ چوبیں گھنٹے گزر گئے لیکن بچہ برآمد نہ ہوا نواب صاحب نے اگلے دن اے ایس پی ، ایس پی اور ایس ایس پی کے بچے منگوا کر ان بچوں کو کالا باغ بھجوا دیا اور اعلان کروا دیا کہ جب تک پولیس اس اغواء شدہ بچے کو برآمد نہیں کرے گی ان کے بچے کالا باغ ہی رہیں گے ۔ان افسران کو ان کے بچے نہیں دیئے جائیں گے ۔ نواب صاحب کا یہ نسخہ کامیاب ہو گیا اور پولیس نے اس بچے کو اسی دن بازیاب کروا لیا۔ نواب صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ جب تک عوام کے مسئلے کی تکلیف بیوروکریسی تک نہیں پہنچتی افسر اس وقت تک وہ مسئلہ حل نہیں کرتے ! یہ تھا ایک بچےکے اغواء اور اس کی بازیابی کا واقعہ۔

آج لاہور میں کئی بچے اغواء ہوتے ہیں لیکن ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ پولیس ان واقعات کو بھاگ جانے پر معمور کرتی ہے ، عوام سسکتی رہتی ہے ، چند دن میڈیا پر زور و شور سے ٹاک شوز کیے جاتے ہیں جن میں سیاسی نمائندے

ایک دوسرے پر الزام دھرتے نظر آتے ہیں اس کے بعد یہ معاملات داخل دفتر ہو جاتے ہیں۔

بچوں کے اغواء کے واقعات پر قابو پانے کے لیے ضروری ہے حکومت پولیس کو سیاسی عصر و رسوخ سے پاک کرے۔ سیاست برائے سیاست سے بالاتر ہو کر فیصلے کئے جائیں۔ اس ادارے پر خصوصی توجہ دی جائے کیونکہ پولیس کا محکمہ ریاست میں امن وامان قائم کرنے والے ستونوں میں ایک اہم ستون ہے۔

سرحدوں کے امین : پاک فوج کے جوان

پاکستان کی مسلح افواج، پوری دنیا میں پاکستان کے لیے قابلِ فخر سرمایہ ہیں۔ سرحدوں کے یہ امین اپنی جان ہتھیلی پر رکھے ملک و قوم کی حفاظت کی خاطر دن اور رات کی پرواہ کیئے بنا اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے کوشاں ہیں۔ مسلح افواج پر نہ صرف عوام کو فخر ہے بلکہ ان کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کی قائل پوری دنیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقوامِ متحدہ کے امن مشنز میں پاکستان کی افواج کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ پاکستان کی افواج دنیا کی بہترین افواج میں شمار ہوتی ہیں۔ یوگوسلاویا ہو، سربیا ہو، افریقہ ہو یا کوئی اور ملک پاکستانی افواج اپنی خدمات کی انجام دہی میں دوسری افواج سے کہیں بہتر ہیں۔ پاک فوج نہ صرف بیرونِ ملک بلکہ اندرونِ ملک بھی ہر طرح کے خطروں سے نبرد آزما ہیں۔ خطرات بیرونی ہوں یا اندرونی پاک فوج کی بدولت سرزمینِ پاکستان محفوظ ہے۔ نہ صرف سلامتی کے خطرات بلکہ کسی بھی صورت حال سے نبٹنے کے لیے پاک فوج ایک ایسا ادارہ ہے جو کسی بھی ادارے سے پہلے عوام کی مدد کو پہنچتے ہیں۔ زمانہ امن میں بھی پاک فوج، عوام کے ہر دم ساتھ ہے۔ ملک میں سیلاب کی تباہ کاریاں ہوں، زلزلہ یا قحط کی آفت ٹوٹ پڑے، خود کش بم دھماکے ہوں یا کسی جلسہ کو پرامن رکھنا ہو، نہروں کی بھل صفائی ہو یہاں تک کہ پاکستان کرکٹ ٹیم کی جسمانی

فننس کا مسلۂ ہو جہاں تمام ادارے، افراد ناکام ہو جائیں وہاں پاکستان فوج کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔

پاکستان کی مسلح افواج نہ صرف سرحدوں کی حفاظت کے لیے کوشاں ہے بلکہ ملک کو درپیش اندرونی مسائل جیسے دہشت گردی کے خلاف جنگ، اور پاکستان کے خلاف ہونے والی بین الاقوامی سازشوں کا خاتمہ کرنے میں بھی مصروفِ عمل ہے۔ ملک وملت کے لیے کام کرنے والے یہ نوجوان والدین اور عزیز واقارب سے کوسوں دور اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔ خصوصا دہشت گردی کی جنگ میں کئی ماؤں نے اپنے لختِ جگر گنوادیئے ہیں لیکن قربان جائیں ان بیٹوں کے جنھوں نے اپنی جانیں قربان کرکے ملک کو دشمنوں سے محفوظ رکھا اور دشمنوں کی ہر سازش کو ناکام بنایا ۔دہشت گردی کی اس جنگ میں چالیس ہزار کے لگ بھگ جوانوں نے جامِ شہادت نوش کیا

کچھ نام نہاد مفکرین اور کالم نگار جو پاک فوج کے خلاف ہزراہ رسائی میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کا مطالبہ ہے کہ ملکی بجٹ کا بیشتر حصہ فوج پر لگایا جاتا اور اس کو کم کیا جائے۔ یہاں اس بات کی وضاحت لازمی ہے کہ کوئی بھی ملک دشمنوں کی سازشوں سے محفوظ اپنے محافظوں کے بل بوتے پر قائم رہتا ہے۔ ایک مضبوط فوج ہی ملک کی سلامتی کا سرچشمہ ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جس جس قوم

یا ملک کی فوج کمزور ہوئی اس ملک نے بہت جلد اپنے دشمنوں سے شکست کھائی۔اس کی مثال بغداد کی ہے یہ شہر مسلمانوں کا ایک علمی مرکز تھا، اس شہر میں بہت زیادہ تعداد میں مسلمان علماء اور کتب، لائبریاں تھیں لیکن ایک موضوع فوج نہ ہونے کی وجہ یہ شہر بہت جلد فتح کر لیا گیا اس شہر کی تمام لائبریاں نذرِ آتش کر دی گئیں اور اس شہر کو فتح ہونے والے سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔صرف عالم یا کتابیں، فیسٹول، لوک گیت، کسی بھی ملک کو دشمن کی یلغار سے روکنے کے لیے ناکافی ہے۔

اگر ارضِ وطن پاکستان کا جغرافیائی جائزہ لیا جائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ پاکستان کی ایک طویل سرحد ایک ایسے ملک کے ساتھ مشترک ہے جو روزِ ازل سے پاکستان کے وجود کے خلاف ہے اور پاکستان کے خلاف کاروائی کرنے سے کبھی گریز نہیں کرتا چاہے بلکہ موقع کی تلاش میں رہتا ہے۔وہ کوئی عالمی فورم ہو یا پھر بین الاقوامی مالیاتی ادارے، بھارت پاکستان کے خلاف کاروائی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔بھارت کی خارجہ پالیسی پاکستان کے خلاف عالمی سطح پر ہر وقت زہر اگلنے سے تعبیر کی جاسکتی ہے۔نہ صرف عالمی فورم بلکہسرحد پر بھارتی افواج دراندازی سے گریز نہیں کرتی۔ان گنت افراد بھارت کی جانب سے اس اشتعال انگیزی کا شکار ہو چکے ہیں۔جبکہ مغرب کی جانب ایک ایسا ہمسایہ افغانستان ہے جس کی تمام تر ہمدردیاں ہمارے دشمن ملک بھارت

کے ساتھ ہیں اور یہ ممالک پاکستان کے بیشتر حصوں میں سازشیں کرنے اور امن و امان کو سبوتاژ کرنے کی سازشیں کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔دوسری جانب ملک دشمن عناصر ملک کے اندر دہشت گردی کا بازار گرم کئے ہوئے ہیں ۔اس کے علاوہ بلوچستان اور کراچی میں ایک سوچی سمجھی سازش کے ذریعے نام نہاد علیحدگی پسند تحریکیں زور پکڑ رہی ہیں جن کو بھارت کی جانب سے بلواسطہ اور بلاواسطہ حمایت حاصل ہے جس کا ثبوت بھارتی وزیرِ اعظم اور پاکستان میں موجود ان تحریکوں کے لیے کام کرنے والے افراد کے انٹرویوز ہیں ۔ان تحریکوں کا خاتمہ بھی از حد ضروری ہے کیونکہ اگر یہ صرف اور صرف آزادی کی تحریکیں ہوتی تو ان کو بیرونی طور پر خصوصا بھارت کی حمایت حاصل نہ ہو تی ۔ صرف یہی نہیں اس کے علاوہ ملک بھر میں ملک دشمن عناصر فرقہ پسندی پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سکیورٹی کی بیشتر ذمہ داری پاک فوج کے سپرد کی گئی ہے جس کواحسن طریقے سے نبھانے کے لیے فوج کو وسائل کی ضرورت ہے ۔پاکستان آج ماضی کی نسبت زیادہ خطرات ، مسائل اور بیرونی دراندازیوں کا شکار ہے ۔ایسے حالات میں اگر پاکستان فوج مضبوط نہ ہو یا اس کی پیشہ ورانہ صلاحتییں کمزور ہو ں تو ملکی سلامتی خطرے میں پڑ سکتی ہے ۔یہ پاک فوج ہی ہے جو ان چیلنجز کا سامنا جوان مردی سے کرتے ہوئے ان تمام مسائل کو حل کرنے کی کوشش کر رہی ہے ۔ افواج پاکستان نے ملک کو دہشت گردوں سے پاک کرنے کے لیے آپریشن ضربِ عصب کا آغاز کیا جس کی وجہ سے بیشتر علاقوں کو دہشت گردوں سے پاک کروا لیا گیا، سرحد

کے دوسری جانب سے دراندازیوں میں واضح کمی آئی۔

ملک کے انتظامی اداروں میں پاکستان کی مسلح افواج سب سے منظم ادارہ ہے۔ ملک کیپسندیدہ ترین افراد میں.بری افوج کے سر.براہ جنرل راحیل شریف پہلے نمبر پر ہیں۔ بین الاقوامی طور پر بھی جنرل راحیل نہ صرف مشہور ترین شخصیات میں ایک اہم حیثیت رکھتے ہیں بلکہ طاقت ور ترین جرنیلوں کی لسٹ میں بھی اولین نمبروں پر ہیں۔

واضح رہے کہ کوئی بھی فوج اس وقت اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتی ہے جب اس ملک کے عوام ، سیاست دان ، میڈیا اور حکومت اس کے ساتھ کھڑی ہو۔ بھارت کے ساتھ لڑی جانے والی 1965 ء کی جنگ میں پاکستان کو کامیابی اس لیے حاصل ہوئی کہ تمام قوم اپنی جری افواج کے ساتھ تھی ۔ اگر ملک کے عوام ، سیاست دان ، حکومت اور میڈیا فوج کا ساتھ نہ دے تو اکیلے فوج کسی محاذ پر کامیاب نہیں ہو سکتی اس لیے ضروری ہے کہ عوام اور خصوصا میڈیا چاہے سوشل میڈیا ہو یا پرنٹ میڈیا کو اپنی فوج کا ساتھ دینا چاہیے کیونکہ باہر حال اس فوج ہی کی وجہ سے پاکستان سلامت ہے اور سلامت رہے گا۔

پاک فوج زندہ باد ، پاکستان پائندہ باد

مہاجر یا پاکستانی؟ پہلے فیصلہ کیجیئے۔

کراچی صوبہ سندھ کا دار لحکومت اور پاکستان کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔ یہ شہر پاکستان کے سمندری راستے کی جانب سے دروازہ کی حیثیت رکھتا ہے۔اس شہر کا کل رقبہ 3527 مربع میل تین کروڑ کی آبادی پر مشتمل دنیا کا آبادی کے حساب سے ساتوں بڑا شہر ہے۔ کراچی میں طویل عرصے سے امن وامان کی صورت حال طویل عرصے سے خراب ہے۔ روشنیوں کے اس شہر کی روشنیاں نہ صرف مدھم پڑ چلی ہیں بلکہ اس شہر کو گویا کسی کی نظر لگ گئی ہے۔یہ وہ شہر ہے جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ شہر کسی کو بھوکا نہیں سونے دیتا۔ یہ شہر پورے ملک کے شہروں میں سب سے زیادہ کاروبار اور روزگار کے مواقع اپنے اندر سموئے ہوئے تھا۔اگر تجارتی حوالے سے دیکھا جائے تو یہ شہر ملکی تجارت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس شہر میں ٹارگٹ کلنگ ، بھتہ خوری ، بوری بند لاشیں ، اغواء ،گینگ وار جیسی وارداتیں عام ہوتی چلی گئی پھرایک وقت وہ بھی آیا کہ امن و امان کی صورت حال اس حدتک مخدوش ہو گئی کہ روزانہ سڑکوں پر کئی کئی لاشیں گرائی جانے لگیں۔ پورے شہر میں قتل وغارت گری ایک معمول کی حیثیت اختیار کر گئی یہاں تک کہ یہ شہر جس کی روشنیاں مشہور تھیں ظلم کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ڈوب گیا۔ اس صورت حال کو قابو میں کرنے کے لیے وفاقی اور صوبائی حکومت کی

رضامندی سے رینجرز کی خدمات حاصل کی گئی۔ رینجرز نے کراچی میں اپنا کنٹرول سنبھالا اور شر پسند عناصر کے خلاف کاروائی شروع کی جس میں تمام سیاسی جماعتوں کے عسکری حصے بھی شامل ہیں۔اس آپریشن نے شہر میں امن و امان کی صورتِ حال کو بہتر کیا اور آہستہ آہستہ شہر کی رونقیں بحال ہونے لگیں۔ جب ایم کیو ایم کے عسکری حلقوں کے خلاف کاروائی کی گئی تو قائد ایم کیو ایم الطاف حسین نے بھارت سے مدد مانگی اور پاکستان کے خلاف تقاریر کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ الطاف حسین عرصہ دراز سے برطانیہ میں مقیم ہیں اور ایم کیوایم سے بذریعہ وڈیو کانفرنسنگ رابطہ میں ہیں اور اسی وڈیو کانفرس کے ذریعے پارٹی کارکنان اور سپوٹرز سے خطاب کرتے ہیں۔الطاف حسین کی جانب سے پاکستان کے خلاف کی جانے والی تقاریر سے کون واقف نہیں ؟ یہاں تک کہ وہ اکثر و بیشتر ملکی سلامتی کے خلاف بیان دیتے ہیں اور بعد میں معافی مانگتے نظر آتے ہیں۔ بات صرف یہاں تک محدود نہیں بعض اوقات ان کی تقاریر میں بھارتی اداروں سے مدد کی اپیل بھی کی جاتی ہے۔ کسی بھی شخص کا دشمن ملک کو مدد کے لیے پکارنا ملکی سلامتی کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ ہے اس خطرہ کے پیشِ نظر الطاف حسین کے بیانات اور تقاریر پر پابندی لگا دی گئی۔ الطاف حسین اور ایم کیو ایم مہاجرین کے حقوق کا نعرہ لگا کر ملک دشمن عناصر کا ساتھ دیتے نظر آتے ہیں۔

حال ہی میں الطاف حسین نے 22 اگست 2016ء میں ملک دشمن تقریر کرتے ہوئے کہ ہمارے حقوق کا معاملہ طے کر لیا جائے تو بہتر ہے۔ انھوں نے نہ صرف پاک فوج کے خلاف نہ صرف نازیبا الفاظ کا استعمال کیا بلکہ فوج کو گالیوں سے بھی نوازا۔ انھوں نے پارٹی کارکنان کو حکم دینے کے انداز میں پاکستان کے نجی چینلجز پر حملہ کرنے کا کہا۔ صرف یہی نہیں انھوں نے پاکستان کے امیج کو پوری دنیا کی نظروں میں بری طرح خراب کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان پوری دنیاکے لیے ایک ناسور ہے، پاکستان دنیا میں دہشت گردی کے لیے ایک ایدھی سنٹر ہے۔ بات یہاں پر ختم نہیں ہوتی انھوں نے پاکستان مردہ باد کا نعرہ نہ صرف خود لگایا بلکہ جلسے میں شامل کارکناں اور عوام سے بھی پاکستان مردہ باد کا نعرۂ لگوایا۔ پاکستان مردہ باد کا نعرہ لگانے والے یہ ہر گز ہر گز نہ بھولیں کہ یہ ملک ہی ہماری پہچان ہے اس سرزمین ہی کی وجہ سے آج ہم سکون سے سوتے ہیں۔ اسی ملک کی وجہ سے ہماری ماؤں بہنوں کی عزتیں محفوظ ہیں۔ اور یہی ملک ہے جس کی بدولت ہماری نسلیں مذہب پر باآسانی عمل پیرا ہو سکتی ہیں ۔یاد رہے یہ تقریر اس وقت کی گئی جب پاکستان از خود دہشت گردی کی جنگکا شکار ہے اور اس جنگ میں ہمارے ملک کو ان گنت چیلنجز کا سامنا ہے۔ بیرونی دراندازیوں کی وجہ سے ملک کے اندر مختلف سازشیں زور پکڑ رہی ہیں، دشمن ملک کی جانب سے ہر فورم پر تنقید کی زد میں ہے۔ پوری دنیا کی نظریں پاکستان پر جمی ہیں اور پاکستان کا امیج اقوامِ عالم میں گرتا جا رہا

ہے ، ایسے موقع پر اس قسم کی تقریر ملکی ساکھ کے لیے نقصان دہ اور ملک کے لیے زہر قاتل کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ اس تقریر کو تقریبا ساٹھ سے زائد ممالک میں سنا گیا۔

پاکستان جب معرض وجود میں آیا تو ان گنت مسلمان اپنا گھربار چھوڑ کر اپنی جائیدادوں کی پرواہ کیے بغیر اپنی جانوں اور عزتوں کو ہتھیلی پر رکھ کر ہجرت کرکے پاکستان آئے ۔ ہجرت کے دوران ان مسلمانوں میں سے ان گنت کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور بہت کم تعداد میں مسلمان ان سرزمین پر آباد ہو سکے ۔ پاکستان نے اپنے ان مسلمان بھائیوں کو دل سے قبول کیا جنھوں نے اس ملک کی خاطر اپنا سب کچھ گنوا دیا ۔ یہ مہاجرین ہمارے بھائی ہیں اور ان کی نسلوں کو پاکستان سے اتنا ہی لگاؤ ہے جتنا کہ اس سرزمین میں صدیوں سے بسنے والے لوگوں کا ہے۔ ان مہاجرین کی نسلیں اس ملک کی سربلندی کی خاطر ہر شعبہء زندگی میں اپنی خدمات سرانجام دے رہی ہیں ۔ ان مہاجرین نے اپنی جان ، مال اور عزتوں کی قربانی اس لیے نہیں دی تھی کہ انھی کی نسلوں میں سے کوئی اٹھے چند افراد کو دھونس ، زبردستی یا کسی بھی طریقے سے اکٹھا کرے اور اسی وطن ، اسی زمین کے خلاف جو انھیں نہ صرف زندہ رہنے کے لیے اسباب مہیا کرنے کا ایک ذریعہ ہے ، جو ساری دنیا میں ان کی پہچان ہے کے خلاف مردہ باد کے نعرے لگانے لگے ۔ آج ستر سال گزر جانے کے بعد مہاجر کا نعرہ لگانا ان مہاجرین

کی تمام قربانیوں پر خاک ڈالنے کے مترادف ہےجنھوں نے اپنی عزتوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے پامال ہوتے دیکھا، جنھوں نے اپنے پیاروں کو اپنے سامنے قتل ہوتے دیکھا اور بے بسی کے عالم میں کچھ بھی نہ کر پائے، جنھوں نے اپنی جائیدادیں کھو دیں صرف اس ارضِ وطن کی خاطر جس کا نام پاکستان ہے۔

واضع رہے کہ مہاجر ایک وقت تک کسی بھی ملک میں رہ سکتا ہے۔ مہاجر کا مطلب یہ ہے کہ ایک مخصوص علاقہ میں بدامنی ہو اور کسی کی جان کو خطرہ ہو یا ملک خانہ جنگی کا شکار ہو تو وہ اس علاقہ کو چھوڑ کر محفوظ علاقہ میں جا بس۔ اپنے علاقہ میں امن بحال ہو جانے یا جنگ کے خاتمے کے بعد واپس لوٹ جائیں۔ لیکن جب مہاجر کو بھائی تسلیم کر کے ملکی ترقی میں، اداروں کی بھرتیوں میں، تعلیمی اداروں میں، فوج میں، کسی جگہ پر مہاجرین کے ساتھ کسی قسم کی کوئی تفریق نہ رکھی جائے۔ انھیں اول درجے کے شہری کی حیثیت دی جائے تو وہ مہاجر نہیں بلکہ اس ملک کے ایسے قابل شہری ہیں جن پر اس ملک کو فخر ہے۔

اگر مہاجرین کے حقوق کا نعرہ لگا کر کراچی کو ملک سے جدا کرنے کی کوشش مقصود ہے تو بہتر ہے کہ ان مہاجرین کو ملک بدر کر کے ملکی سیاست سے ان کے کردار کو بالکل ختم کر دیا جائے کیونکہ حقوق حاصل کرنا ہر ایک شہری کا حق

ہے لیکن ملک کے ٹکڑے کرنے کی کوشش کرنے کا حق کسی کا نہیں۔ اگر گھر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے، اس کی دیواریں کھوکھلی ہو جائیں تو اس کی مرمت کی جاتی ہے نہ کہ ایک دیوار کو الگ کرنے کی کوشش۔ یہاں اس بات کی وضاحت بے حد لازمی ہے کہ ہم سب، عوام، تمام شہر، تمام صوبے، تمام گاؤں، سیاست دان، فوج، انصاف فراہم کرنے والے ادارے اس ملک کی اکائیاں ہیں بالکل اسی طرح جیسے اس ایک مکان کی دیواروں میں اینٹیں۔ یہ اکائیاں مل کر اس ملک کی بنیاد کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اگر ہم خود ہی اس ملک کو برا بھلا کہنے لگیں گے تو ہم خود ہی دشمن کو اس ملک کے خلاف زہر اگلنے کا موقع دے رہے ہیں۔ اگر کسی کے خلاف بے انصافی ہوئی تو اس بے انصافی کا ازالہ ہونا چاہیے نہ کہ اپنے ہی وطن کے خلاف زہر اگلا جائے۔

اڑی حملہ : تاثرات کی جنگ اور نتائج

جموں و کشمیر متنازعہ علاقہ ہے جس پر بھارت نے غاصبانہ قبضہ جما رکھا ہے۔ یہاں بسنے والے لوگ کم و بیش ستر سال سے ہندوستان کے ظلم و بربریت کا شکار ہیں۔ مسئلہ کشمیر سن 1948 ء میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پیش ہوا تاہم بھارت نے حال ہی میں اپنا موقف تبدیل کر دیا ہے اور اس مسئلہ کو علاقائی مسئلہ کے طور پر اجاگر کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ حال ہی میں ہندوستان نے کشمیر میں کم و بیش دو ماہ سے کرفیو لگا رکھا ہے جس میں بھارتی فوج کو ہر طرح کے ایکشن کی اجازت ہے۔ کشمیر میں چاہے وہ بچہ ہو، جوان ہو یا بوڑھا کسی کی جان محفوظ ہے اور نہ ہی کسی عورت کی عزت۔ اس کرفیو کے دوران بھارت نے ظلم و ستم کی داستان رقم کر دی ہے۔ کشمیر کی تحریک آزادی کو دبانے کے لیے بھارت نے اپنی افواج کو ہر قسم کے ظلم و ستم کی کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔ بھارت کی اس ریاستی دہشت گردی کے خلاف بین الاقوامی فورم پر جب آوازیں بلند ہونے لگیں تو لائن آف کنٹرول کے قریب بھارتی مقبوضہ کشمیر ہی کے علاقے اڑی سیکٹر بھارتی فوج کے ہیڈ کوارٹر پر دہشت گردوں نے حملہ کر دیا اور اس حملہ میں تین منٹ کے اندر 18 بھارتی فوجی جوان جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ جبکہ ۱۹ سے ۳۰ فوجی اس حملہ میں زخمی ہو گئے۔ یہ حملہ چھ گھنٹے تک جاری رہا، اس دوران چار دہشت گرد بھی مارے گئے۔ اس

حملہ کی ذمہ داری کسی بھی گروپ نے نہیں لی۔ ابھی حملہ جاری ہی تھا کہ بھارت کی جانب سے روایتی بیان بازی کا آغاز ہو گیا جس میں اس نے پاکستان کو اس حملے کے لیے موردِ الزام ٹھہرانا اور پاکستان کے خلاف پراپگنڈا کا آغاز کر دیا۔ بھارتی میڈیا، فوج اور سیاست دانوں نے تحقیقات کا بھی انتظار نہیں کیا۔ جس وقت بھارتی تحقیقاتی ٹیمیں اڑی کے علاقہ میں پہنچی اس سے کہیں پہلے بھارتی میڈیا پاکستان کو اس حملے کا ملزم قرار دے چکا تھا۔ بھارتی میڈیا کے مطابق حملہ میں استعمال ہونے والا بارود اور اسلحہ، کھانے پینے کی اشیاء پر پاکستانی مہریں موجود تھیں۔ اس کے ساتھ ہی بھارت نے اپنے ملک میں چلنے والے پاکستانی پروگراموں پر بین لگا دیا اور بھارت میں مقیم پاکستانی اداکاروں کو اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر ملک چھوڑ دینے کا حکم بھی جاری کر دیا۔ صرف یہی نہیں بھارت کی جانب سے برسوں پرانا آبی معاہدہ (سندھ طاس) کا معاہدہ بھی توڑ دینے کا اعلان کیا۔ بھارتی وزیرِ اعظم نریندر مودی نے پاکستان کے خلاف ہر طرح کے معائدے کو ختم کرنے کا اعلان کیا ہے اور ہر سطح پر جنگ کا طبل بجا دیا ہے۔

واضح رہے کہ مقبوضہ کشمیر کے اڑی سیکٹر میں موجود بھارتی افواج کے ہیڈ کوارٹر پر یہ حملہ اس وقت ہوا جب اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس امریکہ میں منعقد ہو نا تھا ۔مقبوضہ جموں و کشمیر میں بھارتی کرفیو اور ظلم و ستم کے

کم و بیش دو ماہ گزر چکے تھے اور تمام عالم کی نظریں کشمیر کی جانب اٹھ چکی تھیں ۔ایسے موقع پر یہ حملہ دنیا کی نظریں اس مسئلہ کی جانب سے ہٹانے کی ایک مضموم کوشش تھی ۔اس حملہ کے بعد بھارتی حکومت ، میڈیا، عوام سب ایک ساتھ ، ایک ہی سمت میں بات کرتے نظر آئے یہاں تک کہ بھارت میں پاکستان پر حملہ تک کرنے کی باتیں ہونے لگیں ۔ یہاں تک کہ بھارت نے پاکستان کی سرحد کے ساتھ تعنیات افواج میں اضافہ کر دیا، بھارتی میڈیا نے نہایت جارحانہ انداز میں دن رات پاکستان کے خلاف پروپگینڈا کا آغاز کر دیا۔ یہ منفی پراپگنڈا بھارت کی جانب سے پاکستان کو سفارتی طور پر تنہا کرنے کی ایک ایسی کوشش تھی جس میں بھارتی حکومتی اراکین پیش پیش تھے ۔ اس کے برعکس پاکستان میں میڈیا، اس معاملہ پر متضاد بیانات، حکومت کی جانب سے اس معاملہ پر خاموشی جبکہ چیف آف آرمی سٹاف کی جانب سے موضوع جواب نے بھارت کے اس جنگی جنون میں کمی کا عندیہ دیا۔ پاکستانی میڈیا میں اس معاملہ پر اس حد تک اس طرح سے بات نہیں کی گئی جس طرح بھارتی میڈیا نے بات کی ۔ اگرچہ پاکستان کے وزیرِ اعظم نواز شریف نے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں مسئلہ کشمیر پر بات کی ۔تاہم پاکستان کی جانب سے اڑی حملہ کے موضوع پر اس طرح روشنی ڈالی نہیں گئی جس طرح بھارت نے پاکستان کو رگیدا۔پاکستان کے وزیر اعظم کا کہنا تھا کہ اڑی حملہ کشمیر میں جاری ظلم و بربریت کا نتیجہ ہو سکتا ہے ۔انھوں نے مزید کہا کہ بھارت کا رویہ انتہائی غیر ذمہ دارانہ ہے اور پاکستان کو

بغیر کسی ثبوت کے ان حملوں کے لیے موردِ الزام ٹھہرانا کسی طور پر مناسب نہیں۔

پانچ دن تک وزیرِ اعظم نواز شریف نے مسلمان ممالک کے راہنماؤں سمیت مختلف لیڈروں سے ملاقاتیں کی جن میں مسئلہ کشمیر پر سیر حاصل بحث کی گئی۔پاکستان کی ان ملاقاتوں کے نتیجے میں ترکی نے بھارتی مقبوضہ کشمیر میں ایک سفارتی مشن بھیجنے کا اعلان کیا ہے جس کا مقصد بھارتی مقبوضہ کشمیر میں زمینی حقائق کا جائزہ لینا ہو گا۔اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے ادارے نے بھی ایسا ہی ایک مشن بھارتی مقبوضہ کشمیر میں بھیجنے کا اندیہ دیا ہے۔تاہم امریکہ کے سیکڑی آف سٹیٹ جان کیری نے نواز شریف سے ملاقات میں پاکستان کو اس حملہ کی تحقیقات میں بھارت کے ساتھ تعاون کرنے کو کہا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم چاہتے ہیں کہ دونوں ممالک دو طرفہ تعلقات کو بہتر کریں اور حالیہ تناؤ کو کم کرنے کی عملی کوششیں کی جائیں۔امریکہ میں مقیم پاکستانی سفیر جلیل عباس جیلانی کا کہنا تھا کہ پاکستان خطے میں امن و سلامتی کا خواہاں ہے لیکن اگر سرحد کی دوسری جانب سے کاروائی کی گئی تو پاکستان اس کا ہر طرح سے جواب دینے کے لیے تیار ہے۔

اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے خطاب میں بھارت کے وزیرِ اعظم نریندر مودی نے اس حملہ میں پاکستان کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے کہا کہ وزیرِ اعظم پاکستان نے کشمیر کے موقف پر بات کی لیکن اڑی حملہ پر پاکستان کو

تحقیقات میں ساتھ دینا ہوگااور پاکستان بھارت میں ہونے والے ہر دہشت گرد حملے میں ملوث ہے۔ اڑی حملہ کے بعد بھارت نے نہ صرف پاکستان کو ایک دہشت گرد ملک قرار دینے اور دنیا میں پاکستان کو تنہا کرنے کی کوششیں تیز کر دی ہیں وہاں پاکستان کے خلاف جنگی جنون میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ بھارتی جنگی جنون اور پاکستانی سرحدوں پر افواج میں اضافہ کے جواب میں پاکستان نے بھی سرحد پر اپنی افواج میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے اور وقت پڑنے پر پاکستانی افواج ارضِ وطن کی جانب اٹھنے والی ہر آنکھ کو پھوڑ دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

پاکستانی افواج کے سربراہ جنرل راحیل شریف نے واضح الفاظ میں بھارت کو خبردار کیا ہے کہ پاکستان کو تر نوالہ نہ سمجھا جائے اور پاکستانی افواج کی صلاحیتوں کو معمولی نہ سمجھا جائے۔ پاکستان کا دفاع مضبوط ہاتھوں میں ہے۔واضح رہے کہ پاکستانی افواج، پاکستانی اسلحہ، فوجی سازو سامان، فردی صلاحتیں، دنیا میں بہترین مانی جاتی ہیں۔ دفاعی لحاظ سے پاکستان ایک ناقابلِ تسخیر ملک بن چکا ہے۔اور پاکستان کے خلاف جنگ کی باتیں کرنے والوں کو یہ بات جان لینی چاہیے کہ پاکستانی افواج کسی بھی حملہ کا جواب دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور دونوں ہی ممالک ایٹمی صلاحیت رکھتے ہیں، ان مالک کی آپس میں جنگ صرف اور صرف تباہی کو آواز دینے کے مترداف ہے۔

آج صورت حال یہ ہے کہ دونوں ممالک کی افواج ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی ہیں ، ہتھیاروں سے لیس یہ افواج اگر کسی جنگ کا حصہ ہوں گی تو دونوں جانب تباہی اور بربادی مقدر میں لکھ دی جائے گی۔ پاکستان ایک امن پسند ملک ہے لیکن اس امن پسندی کو اس کی کمزوری نہ سمجھا جائے۔ الفاظ کی جنگ دونوں جانب سے جاری ہے بھارت ہمیشہ کی طرح جارحانہ رویہ اپنائے ہوئے ہے جبکہ پاکستان کی جانب سے ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس جارحیت کا جواب دیا جارہا ہے۔ جنگ کسی بھی مسئلے کا حل نہیں ہوا کرتی، مسئلہ کا باہر حال حل مذاکرات سے نکالا جانا چاہیے

۔

پاک بھارت کشیدگی: حل کیا ہے؟

مقبوضہ کشمیر میں اڑی کے مقام پر بھارتی ہیڈ کوارٹر پر حملہ کے بعد بھارت نے مختلف سطحوں اور فورمز پر پاکستان کے خلاف زہر اگلنے کا کام شروع کر دیا ہے۔ اڑی حملہ تو محض ایک بہانہ تھا در حقیقت بھارت کو دنیا کی نظروں سے اپنا مکروہ چہرہ چھپانا مقصود تھا۔ مقبوضہ کشمیر میں بھارتی مظالم کا یہ عالم ہے کہ بھارتی افواج نوجوانوں کو ان کے گھروں سے نکال انھیں گرفتار کر لیا جاتا ہے پھر ان کی مسخ شدہ لاشیں کسی علاقہ سے ملتی ہیں یا پھر وہ لاپتہ رہتے ہیں۔ بھارت نے مقبوضہ جموں و کشمیر میں اپنی افواج کی جانب سے کئے جانے والے مظالم کو دنیا کی نظروں سے اوجھل کرنے کے لیے پاکستان کے خلاف سفارتی اور سرحدی جارحیت کا آغاز کر دیا ہے۔ حال ہی میں بھارت نے لائن آف کنٹرول پر بلا اشتعال فائرنگ کا آغاز کر دیا جوابی کاروائی میں پاکستان کی جانب سے بھی بھرپور جواب دیا گیا۔ اس بلا اشتعال فائرنگ کو بھارت میں سرجیکل سٹرائک کا نام دیا گیا اور بھارتی میڈیا نے اس حملہ کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ بھارت کے اس سرجیکل آپریشن میں کوئی فوجی پاکستان میں داخل ہونے سے ناکام رہا۔ اس حملہ میں بھارت کے چودہ سپاہی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے جبکہ پاکستان کے دو سپاہیوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ اس کے علاوہ بھارت کے ایک فوجی کو پاک فوج

نے حراست میں لے لیا۔جس کے بارے میں بھارت کا کہنا تھا کہ وہ غلطی سے سرحد پار کر گیا۔اسے بھارت کو واپس کیا جائے۔بھارت نے لائن آف کنٹرول کو بھی بین الاقوامی سرحد ماننے سے انکار کر دیا ہے۔

بھارتی افواج وقتاً فوقتاً پاکستانی سرحد پر تعینات افواج اور سرحد کے قریب آباد بستیوں پر بلااشتعال فائرنگ کرتی رہتی ہیں۔صرف سرحد پر بلااشتعال فائرنگ ہی نہیں بلکہ بھارت نے پاکستانی سرحد کے ساتھ ساتھ تمام فضائی اڈوں اور دفاعی تنصیبات کو ہائی الرٹ کر دیا ہے،بڑے پیمانے پر فضائی مشقوں کا آغاز بھی کر دیا گیا ہے۔ٹائمز آف انڈیا کے مطابق اٹھارہ ہوائی اڈوں اور دیگر تنصیبات پر مشقیں شروع کی گئی۔ایسی ہی دفاعی مشقیں مقبوضہ جموں و کشمیر کے علاقہ اڑی سیکٹر پر حملہ سے ایک ہفتہ قبل بھی کی گئی تھیں۔بھارتی فضائیہ مسلسل نگرانی کے لیے اسرائیلی ڈرونز اور جاسوس ڈرونز بھی تعینات کرنے کا اعلان کر چکی ہے۔بھارت کے مطابق ان مشقوں کا بنیادی مقصد مقبوضہ کشمیر سے راجھستان تک پوری سرحدی پٹی پر پاکستان کے خلاف آپریشن کی تیاری اور فضائی دفاع کو مضبوط بنانا ہے۔بھارت جنگی جنون میں مبتلا ہو چکا ہے۔بھارتی میڈیا اور بھارتی وزیر اعظم نیدر مودی انتہائی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے آئے روز پاکستان کے خلاف بیانات دیتے نظر آتے ہیں۔بھارت کی جانب سے پاکستان میں منعقد ہونے والی سارک کانفرنس میں شرکت اور پاک

بھارت کرکٹ سیریز سے انکار بھی بھارت کی جانب سے اس غیر ذمہ دارانہ رویہ کی ایک کڑی ہے۔بھارت کی کوشش ہے کہ پاکستان کو ایک دہشت گرد ریاست کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کرے اور پاکستان ، چین کے درمیان طے پانے والا اقتصادی راہ داری کا منصوبہ کھٹائی میں پڑ جائے۔

دوسری جانبپاک فوج کے سربراہ جنرل راحیل شریف نے ببانگِ دہل اعلان کیا ہے کہ پاک فوج ہر طرح کی جارحیت سے لڑنے اور اس کا جواب دینے کے لیے ہر لمحہ تیار ہے ۔جنرل عاصم باجوہ نے حال ہی میں دی گئی میڈیا بریفنگ میں کہا کہ پاکستانی حدود میں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔پاکستان کی سالمیت اور حفاظت کے لیے جو کچھ کرنا پڑا کر گزریں گے ۔ پاکستان نے روس کے تعاون سے زمینی جنگی مشقوں کا آغاز کر رکھا ہے جو کہ دس اکتوبر تک جاری رہیں گی ۔پاک فضائیہ کی جانب سے ایف 16 طیاروں کو سڑ کوں پر ایمر جنسی لینڈنگ بھی کروائی گئی جس کا مقصد جنگ کی صورت میں فضائیہ کی کارکردگی کو ناقابلِ تسخیر بنانا ہے۔ اس کے علاوہ ایران کے چار بحری جہاز بھی پاکستان کے ساحلِ سمندر پر لنگر انداز ہو چکے ہیں ۔ ان جہازوں کا پاکستان کے ساحلوں پر لنگر انداز ہونے کا مقصد پاک بحریہ کے ساتھ مل کر نہ صرف جنگی مشقوں کا آغاز ہے بلکہ دو طرفہ تعلق میں بہتری کی امید ہے ۔اس کے ساتھ ساتھ پاک بحریہ کی جنگی صلاحیتوں میں مزید اضافہ ہوگا۔دو بڑے ممالک ، روس اور ایران کا پاکستان

کے ساتھ جنگی مشقوں کا آغاز بھارت کو ایک واضع پیغام ہے کہ پاکستان عالمی برادری میں تنہا نہیں بلکہ خطے کے دوسرے ممالک پاکستان کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اگر بھارت جنگ کا آغاز کرنے کی غلطی کرے گا تو اس میں بھارت کا نقصان پاکستان کے نقصان سے کہیں زیادہ ہو گا۔ پاک افواج بھارتی افواج کی نسبت پیشہ ورانہ صلاحیتوں اور بہترین سامانِ حرب سے لیس ہے۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان اختلافات کی بنیادی وجہ جموں اور کشمیر کا علاقہ ہے۔ اس علاقہ کے لوگ بھارت کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے آج تک سکون کا سانس نہیں لے سکے۔ مسئلہ کشمیر پاکستان اور بھارت کے درمیان بڑی جنگوں کی بنیادی وجہ ہے۔ دونوں ممالک کے بیچ آئے روز ہونے والی جھڑپوں اور امن مذاکرات کی بنیادی وجہ بھارت کی مسئلہ کشمیر کے معاملے میں ہیڈ دھرمی ہے۔ بھارت نہ تو کشمیریوں کو ان کا حقِ رائے دہی دینے کو تیار ہے اور نہ ہی کشمیری راہنماؤں سے بات کرنے کا روادار ہے۔

دونوں ممالک طاقت کے توازن کو قائم رکھنے کے لیے جنگی ساز و سامان کی خرید پر اپنے بجٹ کا ایک کثیر حصہ صرف کرنے پر مجبور ہیں۔ اسلحہ کی اس دوڑ میں دونوں ممالک اپنے ملک میں پھیلی بدامنی، غربت، بے روزگاری، جہالت سے نظریں چرائے، اپنا بجٹ افواج پر لگا دیتے ہیں۔ جب تک کہ یہ معاملہ حل نہیں

ہو جاتا خطے میں دیر پا امن یا دونوں ممالک کے درمیان باہمی تجارت اور دیگر مسائل جوں کے توں رہیں گے ۔اس متنازعہ مسئلہ کا حل اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے مطابق ہونا چاہیے اور اس حل میں تینوں فریق، پاکستان، کشمیر اور بھارت کے لیڈروں کو مذکرات کی میز پر حل کرنا ہو گا۔ کیونکہ اسی ایک خطہ کے تنازعہ کی وجہ سے بھارت اور پاکستان میں پہلے جنگیں ہو چکی ہیں، ان جنگوں میں کون جیتا، کون ہارا یہ ایک الگ معاملہ ہے لیکن ان جنگوں میں دونوں ممالک کی معیشتوں کو دھچکا لگا۔ دونوں جانب جانی اور مالی نقصان ہوا۔پاکستان کی جانب سے مسئلہ کشمیر پر بات کی جاتی ہے تاہم بھارت اس موضوع پر بات کرنے سے ہمیشہ گریزاں رہا ہے یہاں تک کہ اقوامِ عالم کی نظریں کشمیر کی جانب سے ہٹا کر بلوچستان، بھارت میں ہونے والی دہشت گردی کے حملو ں کی جانب مبذول کروائی ۔ بھارتی میڈیا اس کام میں اپنی حکومت کا بھرپور ساتھ دے رہا ہے۔ بھارت کو مقبوضہ کشمیر کے معاملہ میں اپنے موقف میں نرمی لانے کی ضرورت ہے تاکہ پاکستان اور بھارت کے درمیاں بنیادی متنازعہ مسئلہ حل ہو سکے

پاکستان اور بھارت کی جنگ کا مطلب دونوں ممالک کی افواج اور عوام کو آگ میں جھونک دینے کے مترادف ہے۔ جنگ کسی بھی مسئلہ کا حل نہیں ہو سکتی بلکہ جنگ اپنے ساتھ کئی طرح کی بلائیں لے کر آتی ہیں۔ جنگ کی صورت میں نہ جانے کتنے

ہی گھرانے اجڑ جاتے ہیں ، کتنے ہی گھروں کے چشم وچراغ گل ہو جاتے ہیں ، ملک میں موجود بیرونی سرمایہ کاری صفر ہو کر رہ جاتی ہے ، معیشت تنزلی کی راہ پر گامزن ہو جاتی ہے ۔ صرف یہی نہیں جنگ میں ہونے والی تباہی کے آثار کو مٹانے میں صدیاں لگتی ہیں ۔ خصوصا جب دونوں جانب ہی ایٹمی طاقتیں ہوں اور جنگ کی صورت میں ایٹمی ہتھیار استعمال کرنے والا ملک خود اس کے اثرات سے بچ نہیں سکتا ۔

٭ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین

محرم کے مہینے کا آغاز ہو چکا ہے۔ محرم اسلامی سال کا پہلا مہینہ ہے۔ محرم کے آغاز کے ساتھ ہی حضرت امام عالی مقام سیدنا امام حسینؓ کی بے مثال اور عظیم قربانی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ محرم الحرام میں ہونے والا یہ واقعہ رہتی تاریخ تک زندہ رہے گا۔ حضرت امام حسینؓ اور یزید کی جنگ جو درحقیقت معرکہ ء حق و باطل تھی۔ بہتر اصحاب کا مقابلہ ایک ہزار افراد سے تھا۔ یہ جنگ نہ تو حکومت کے لیے تھی اور نہ ہی اس جنگ کا مقصد دنیاوی جاہ و جلال تھا بلکہ یہ جنگ دین کی سربلندی اور بقاء کے لیے لڑی گئی۔

دین ابراہیمی کا آغاز قربانی سے ہوا جب ایک عظیم باپ نے حکمِ خداوندی کو پورا کرنے کے لیے اپنے عزیز از جان بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے قربان کرنے کا قصد کیا۔ اللہ کے حکم کی تکمیل کی خاطر کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرنے کی یہ اعلیٰ ترین مثال ہے ۔اللہ نے اس قربانی کو قبول فرما کر حضرت اسماعیلؑ کو بچا کر ان کی جگہ جنت سے مینڈھا بھیج کر اس کو حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں ذبح کروایا جب یہ دین ابراہیمی اپنی انتہا کو پہنچا تو قربانی کے لیے نواساء رسول ﷺ ، جگر گوشہء بتول، اور ان کے خاندان کا انتخاب کیا گیا، دین کی

سربلندی کے لیے ان اصحاب نے قربانی کا حق ادا کیا۔خود سے تعداد میں کہیں زیادہ افراد کے ساتھ صرف اور صرف دین کی بقاء کی خاطر لڑ جانا، شہید ہو جانا، یہاں تک کہ چھ ماہ کے بچے بھی شہادت کے لیے پیش کر دینا صرف اور صرف امام عالی مقام ہی کا ظرف ہے۔اللہ نے قربانی قبول فرمائی اور خانوادہء رسول ﷺ کے تمام سپوتوں نے جام شہادت نوش کیا۔

بظاہر اس جنگ میں یزید کو کامیابی حاصل ہوئی لیکن درحقیقت امام عالی مقامؓ اور ان کے خانوادے کے خون نے دین کی سرزمین کو اپنے لہو سے سینچ کر یہ ثابت کر دیا کہ حق کبھی جھکتا نہیں، کبھی بکتا نہیں۔ جہاں دین کی سربلندی منظور ہو وہاں عارضی حیات کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اس عارضی حیات پر ابدی زندگی کو فوقیت دینے والے درحقیقت امر ہو جاتے ہیں۔ حضرت امام حسینؓ کی ذاتِ بابرکات صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ اقوامِ عالم کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ تمام مذاہب کے راہنماؤں، دنیا میں کامیاب ترین تحریکوں کے بانیوں نے امام عالی مقامؓ کی ذات سے فیض حاصل کر کے اپنے پیروکاروں کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہدایت کی۔

حضرت امام حسینؓ کی ذات بابرکت کے بارے میں سکھ مذہب کے پیشوا بابا گرو نانک کا ایک واقعہ بیان کرتی چلوں۔ بابا گرو نانک نے ایک دن اپنے مرید سے

کہا۔" حسینؑ کا غم منایا کر" و۔ مرید نے حیران ہو کر کہا۔" نہیں۔ وہ تو مسلمانوں کے پیشوا ہیں "۔ باباجی نے کہا۔"تم میرے مرید ہو میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ گھر جاؤ اور اپنی بہن سے شادی کرؤ "۔ مرید نے پریشان ہو کر کہا۔ "باباجی ! میرا ضمیر اجازت نہیں دیتا" ۔ باباجی مسکرائے اور بورے۔" ارے پاگل اس ضمیر کو تو حسین کہتے ہیں۔ حسینؑ مسلمانوں کے نہیں ضمیر والوں کے گرو ہیں" ۔

صرف مذہبی پیشواؤں کا ذکر ہی کیا موقوف حضرت امام عالی مقامؑ کی ذات بابرکات دنیا کی بڑی بڑی تحرکوں کے بانی نیلسن منڈیلا نے اپنی تحریک کی کامیابی کے لیے مشعلِ راہ امام عالی مقام کو بناتے ہوئے کہا "میں نے بیں سال جیل میں گزارے ایک رات میں نے فیصلہ کیا کہ میں حکومت کے تمام شرائط و ضوابط پر دستخط کر کے ہار مان لوں لیکن اسی لمحے مجھے امام حسینؑ اور کربلا کے لمحات کا خیال آیا۔ امام حسینؑ نے مجھے آزادی اور حقِ خود ارادیت کے لیے طاقت دی اور میں لڑا"۔ نیلسن منڈیلا کی اس تحریر نے ثابت کیا کہ کسی واقعہ کو لکھ لینا، اس قربانی کا غم منا لینا، ہی کافی نہیں بلکہ اس واقعہ سے سبق سیکھ کر اس پر عمل کر لینا ہی اصل کامیابی ہے۔یہی نہیں ہندوں کے راہنما ماہتاما گاندھی نے کہا". میں نے حسین سے سیکھا کہ مظلوم ہوتے ہوئے کامیابی کیسے حاصل کی جائے "

تھامس کریل کا کہنا ہے کہ ہمیں کربلا کے سانحہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ اگر دل میں خدا کی سچی محبت موجود ہو تو عددی برتری حق اور باطل کی جنگ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی ۔ عددی اعتبار سے اتنا فرق اور حسینؓ کی فتح عجائبات میں سے ایک ہے ۔ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی امام عالی مقامؓ سے محبت سے کون واقف نہیں ۔

بیان اگر سرِ شہادت کی تفسیر ہو جائے

مسلمانوں کا قبلہ روضہ ء شبیر ہو جائے

مسجد کی صفوں سے کبھی مقتل کی طرف دیکھ

توحید تجھے شبیر کے سجدوں میں ملے گی

مٹا دو ظلم جہاں جہاں بھی دکھے

اس سے بہتر نہیں ہو گا انتقامِ حسینؓ

حضرتؓ کی یزید سے جنگ ، حق پر ڈٹ جانا یہاں تک کہ اپنی جان کی پرواہ نہ کرنا ، دین کی خاطر اپنی آخری سانس تک نہ جھکنا ، نہ بکنا وہ تمام اوصاف ہیں جو اگر آج کے مسلمان میں پیدا ہو جائیں تو اسلام پھر سے سربلندی حاصل کر سکتا ہے ۔ ہماری پستی کی وجہ ہی یہی ہے کہ ہم نے اپنے اسلاف کے کارنامے یاد تو رکھے ، ان کارناموں کو تاریخ میں درج بھی کیا ، اپنی نسلوں کو بھی

ان کے کارنامے سنائے اپنے اسلاف کے اوصاف کو سنایا لیکن ان اوصاف کو اپنایا نہیں۔ ہمارے حکمرانوں سے لیکر عوام تک مغرب کے پروردہ ہیں۔ اس کے برعکس غیر مسلموں نے ہمارے اسلاف کے اوصاف کو اپنا کر دنیا میں سربلندی حاصل کی۔ آج اقوامِ عالم میں مسلمان جن پستیوں کا شکار ہیں اس کا سبب کوئی اور نہیں خود مسلمان ہیں جن کی صفوں میں میر جعفر، میر صادق اور یزید جیسے حکمران موجود ہیں جو اپنی آخرت کو بھلا کر صرف اور صرف دنیا کی خاطر ایمان اور ضمیر بیچ چکے ہیں۔ اگر مسلمان حکمرانوں کا ضمیر زندہ ہوتا تو دنیا میں کہیں مسلمان ظلم و ستم کا شکار نہ ہوتے۔ فلسطین اور کشمیر کے مسلمان صرف اسی وجہ سے آج ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے ہیں کہ ان کے مسلمان بھائی ان کی مدد کرنے کو تیار نہیں۔ برما میں مسلمانوں کا بربریت سے قتل اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ دنیا میں حضرتِ شبیرؑ کے ماننے والے والے تو بہت ہیں لیکن ان نقشِ پاء پر چلنے والا کوئی نہیں۔

حالات کا تقاضا ہے کہ مسلمان اپنی صفوں کو درست کریں، اپنی صفوں میں موجود میر جعفر اور میر صادق کو پہچان کر ان کا قلعہ قمع کریں۔ ان بہتر کے لشکر کی طرح کفر کے مقابلے میں ڈٹ جائیں۔ تاکہ کسی میں مسلمانوں کی طرف میلی آنکھوں سے دیکھنے کی جرات باقی نہ رہے۔

زندگی۔۔

کبھی زندہ لاش کو دیکھا ہے تو نے ؟

جو زندہ ہو گا وہ لاش کیسے ہو گا؟

وہ جو اندر سے مر جائے اور چلتا پھرتا ہو کھاتا پیتا ہو۔ وہ زندہ لاش کہلائے گا۔

دیمک زدہ درخت، مردہ روح کا بدن، بے گور و کفن ایسی لاشیں ہیں جن کو گرنے میں

بہت وقت لگتا ہے۔ نیلی روشنائی سے لکھتا ہوا نیلا قلم رک گیا

رویے روحوں کو مار دیتے ہیں۔ نیلی روشنائی کا رنگ بدل کر سیاہ ہو گیا

رویے کیسے مارتے ہیں؟ سوال در سوال

تلخ رویے روح کو زخمی کر کے نڈھال کر دیتے ہیں اور انسان اندر سے مر جاتا ہے۔

نیلی روشنائی سیاہ سے سرخ ہو گئی

اقوامِ متحدہ: ذمہ داریاں اور مسئلہ کشمیر

اقوامِ متحدہ کا آغاز دوسری جنگِ عظیم دوران یکم جنوری 1942 ء کو ہوا، جب چھبیس ممالک کے حکمرانوں نے ایک عہدے نامے پر دستخط کیا جس میں لکھا گیا تھا کہ وہ دوسری طاقتوں کے خلاف متحد ہوں گے۔ یہ ادارہ امریکہ کے صدر روز والٹ کی کوششوں سییہ تمام اقوام ایک پلیٹ فارم پر اکٹھی ہوئی اور اس معاہدے پر دستخط ہوئے۔ 1943 ء کی ماسکو کانفرنس اور تہران کانفرنس میں اقوامِ متحدہ کو باقاعدہ ایک ادارہ بنانے کی تجویز پیش کی گئی۔ 1945ء میں یالٹا کانفرنس میں اقوام متحدہ کی ممبر شپ ان ممالک کے لیے بھی کھول دی گئی جو پہلی جنگ عظیم میں لیگ آف نیشنز کا حصہ تھے۔ اپریل 1945ء میں اقوامِ متحدہ کو باقاعدہ ایک ادارہ بنانے کی تجویز پیش کی گئی۔ 25 ء ہی میں لیگ آف نیشنز باقاعدہ طور پر یونائیٹیڈ نیشنز میں تحلیل کر دی گئی۔ 1945 ء اپریل 25 یونائیٹیڈ نیشنز آن انٹرنل آرگنائزیشن کی کانفرنس سان فرانسسکو 1946 میں ہوئی۔ اس اجلاس کے بعد چارٹر آف یو این پر دستخط کیئے گئے۔

اگرچہ اقوامِ متحدہ کا آغاز صرف اور صرف جنگ میں مختلف اقوام کا اشتراک تھا تاہم جنگ کے خاتمے کے بعد اقوامِ متحدہ کے دائرہ کار وسیع ہوتا چلا گیا

۔ اس ادارے کے دائرہ کار میں پوری دنیا میں انسانی حقوق ، معاشی ترقی ،بنیادی صحت ، تعلیم وغیرہ کو شامل کر دیا گیا۔ اقوامِ متحدہ کے مختلف سیکشنز پوری دنیا میں کام کر رہے ہیں ۔ دنیا کے مختلف ممالک میں امن کے قیام کے لیے اقوامِ متحدہ کی افواج اپنی خدمات سرانجام دی رہی ہیں ۔ اقوامِ متحدہ کے ہیڈ کوارٹر، امریکہ کے شہر نیو یارک میں ہیں جبکہ U.N building ویانہ میں ہے۔

اقوامِ متحدہ کے سلامتی ادارے بیاہ شدہ ریاستوں ، مشکل معاشرتی ماحول کا شکار علاقوں میں اپنی خدمات سرانجام دے رہی ہیں ۔ جنگ سے متاثرہ ، غذائی قلت کا شکار، یا آسمانی آفات سے متاثرہ علاقوں میں اقوامِ متحدہ کی افواج عملی طور پر خدمات سرانجام دے رہی ہیں ۔ اقوامِ متحدہ میں شامل ممالک کی افواج دنیا کے مختلف ممالک میں نہ صرف امن مشن کے لیے تعینات کی جاتی ہیں بلکہ اقوامِ متحدہ انسانی فلاح و بہبود اور انسانی حقوق کے لیے سرگرمِ عمل ہے۔ جن میں فوجی ، پولیس ، سول اداروں کی بحالی ، ترقیاتی کاموں کا آغاز ، شہریوں کی حفاظت اور بہبود، انسانی حقوق شامل ہیں ۔اقوامِ متحدہ کی بنیادی ذمہ داریوں میں امن و امان کی بحالی ایک اہم ترین ذمہ داری ہے جس میں یہ ادارہ کامیاب نہیں ہو سکا۔

مسئلہ کشمیر اقوامِ متحدہ میں پیش ہونے والا قدیم ترین تنازعہ ہے۔ مقبوضہ جموں و کشمیر پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک ایسا تنازعہ ہے جس کے حل کے لیے دونوں ممالک اقوام متحدہ سے رجوع کر چکے ہیں، لیکن بھارت کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ابھی تک یہ تنازعہ حل نہیں ہو سکا۔ یہ مسئلہ پاکستان اور بھارت کے مابین پہلی جنگ کا آغاز تھا جب 1948ء کو اس وقت ہوا جب کشمیر کے ہندو راجہ نے کشمیر کا الحاق بھارت سے کرتے ہوئے، بھارت سے فوجی امداد طلب کی۔ کشمیری مجاہدین کا ساتھ دینے کے لیے پاکستان کی جانب سے قبائلی کشمیر میں داخل ہو گئے اور باقاعدہ جنگ کا آغاز ہو گیا۔ بھارت نے پہلی بار 1949ء میں یہ معاملہ اقوامِ متحدہ میں پیش کیا اور اقوامِ متحدہ سے ثالثی اور جنگ بندی کی درخواست کی۔ اقوامِ متحدہ کی جانب سے جنگ بندی کے لیے متعدد قراردادیں پیش کی جن کے نتیجے میں دونوں جانب سے جنگ بندی کا اعلان ہوا اور دونوں افواج جس مقام پر تھیں انھیں وہاں ہی روک دیا گیا۔ بین اقوامی طور اس جگہ کو لائن آف کنٹرول کا نام دیا گیا جس کی دونوں جانب آج بھی دونوں ممالک کی افواج موجود ہیں۔ جنگ بندی کے بعد اقوامِ متحدہ کی جانب سے مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کی کوششوں کا آغاز کر دیا گیا تاہم یہ کوششیں بارآور ثابت نہ ہو سکی۔ یہ پاک بھارت پہلا تنازعہ تھا جس میں اقوامِ متحدہ میں ثالثی کے لیے پیش کیا گیا۔ اقوام متحدہ نے اس مسئلے کے حل کے لیے پانچ ممالک پر مشتمل ایک کمشن بنایا۔ اس کمشن نے ایک رپورٹ پیش کی جس میں کہا

گیا تھا کہ اس علاقہ میں ایک اقوامِ متحدہ کے اداروں کی موجودگی میں ایک آزاد ریفرنڈم کروایا جائے گا اور کشمیر کے عوام کو حق حاصل ہے کہ وہ اس بات کا فیصلہ کریں کہ انھیں کس ریاست کے ساتھ الحاق کرنا چاہتے ہیں یا الگ رہنا چاہیے۔ لیکن بھارت نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کشمیر سے اپنی افواج میں کمی نہیں کی بلکہ ان افواج میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بھارت نے اپنی روایتی ہٹ دھرمی کی وجہ سے کشمیر میں رفرنڈم نہیں کروایا تاہم کشمیر میں دنیا کی نظروں میں دھول جھونکنے کے لیے الیکشن کروائے گئے جن کا کشمیری عوام نے بائی کاٹ کیا۔ بھارت نہتے کشمیریوں کی تحریکِ آزادی کو دبانے کے لیے اس علاقہ میں موجود افواج میں اضافہ کرتا جا رہا ہے یہاں تک کہ آج مقبوضہ جموں و کشمیر میں سات لاکھ کے قریب بھارتی افواج تعینات ہیں۔ ان افواج کو کشمیری عوام کو مظاہروں سے روکنے اور کشمیر کی تحریک آزادی دبانے کے لیے ہر طرح کی چھوٹ دی گئی ہے۔ بھارتی افواج کے مظالم سے نہ تو کوئی بچہ محفوظ ہے، نہ مرد و عورت، نہ جوان نہ بوڑھا۔ حال ہی میں بھارت نے کم و بیش تین ماہ سے اس علاقہ میں کرفیو لگا رکھا اس کرفیو میں بھارتی افواج نے ظلم و ستم کی انتہا کر رکھی ہے۔

حال ہی میں اڑی سیکٹر میں بھارتی افواج کے ہیڈ کوارٹر پر بھارتی حملہ کے بعد بھارت کی ان ظالمانہ کاروائیوں میں بے انتہا اضافہ کر دیا ہے بھارت کی

جانب سے اس حملہ کو پاکستان کے سر تھوپنے کی ناکام کوشش بھی کی گئی ہے۔ دنیا کے سامنے مسئلہ کشمیر کی بین الاقوامی حیثیت کو ختم کرکے اس مسئلہ کو علاقائی تنازعہ بنانے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ بھارت اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کشمیر کے مسئلہ کو دنیا کی نظروں سے اوجھل کرنا چاہتا ہیاور اپنا اٹوٹ انگ قرار دینا شروع کر دیا ہے۔ اڑی سیکڑ پر حملہ کے بعد بھارت نے کشمیر پر مظالم کی انتہا کر دی ہے۔ جگہ جگہ چھاپے مارنے، بے گناہ عورتوں کی عصمت دری، بے گناہ کشمیریوں کو گولیوں کا نشانہ بنانے، بے گناہ نوجوانوں کو ان کے گھروں سے نکال کر لے جانے کا سلسلہ جاری ہے یہاں تک کہ یہ نوجوان یا تو لاپتہ ہو جاتے ہیں یا ان نوجوانوں کی لاشیں کسی اور علاقہ میں ملتی ہیں۔ بھارت نے حال ہی میں کشمیر کو متنازعہ علاقہ ماننے سے ہی انکار کر دیا ہے۔ بھارتی میڈیا بھی اپنی حکومت کے ساتھ دے رہا ہے اور دن رات دنیا کے سامنے بھارت کے اس مذموم پراپگنڈے کا پرچار کر رہا ہے۔

بھارت کے ان تمام مظالم کے باوجود اقوامِ متحدہ اپنی قراردادوں پر عملدرآمد کروانے کے لیے عملی طور پر بھارت پر دباؤ ڈالنے، اس مسئلہ کے حل کے لیے عملی کوشش نہیں کی۔ اس مسئلہ کے حل کے لیے اقوامِ متحدہ کو قراردادوں سے بڑھ کر عملی اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔

جنرل راحیل کے بعد______

پاک فوج کے سربراہ جنرل راحیل شریف کی مدتِ ملازمت چند دنوں میں اپنے اختتام
کو پہنچنے والی ہے۔ جنرل راحیل شریف پاک فوج کے مشہور ترین, طاقت ور ترین
سربراہ اور عوام کے دلوں پر راج کرنے والے جرنیلوں میں سے ایک ہیں۔ جنرل
میں کیا۔ جنرل راحیل شریف oct1976 راحیل شریف نے اپنی ملازمت کا آغاز سن
منتخب ہوئے۔ جنرل NOV 2013 نے پاک فوج کے سربراہ کی حیثیت سے 26
راحیل شریف نے پاک فوج کے پندرویں سربراہ کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔
پاک فوج کا کے سربراہ کی حیثیت سے جنرل راحیل نے ملکی سلامتی اور وقار میں
اضافے کے لیے ان گنت کارنامے سرانجام دیئے۔ جن میں آپریشن ضربِ عصب ،
افغانستان کے ساتھ تعلقات میں بہتری ، روس اور چین کے ساتھ تعلقات میں
نمایاں بہتری ، کراچی میں امن وامان کی بحالی ، بلوچستان میں جاری نام نہاد تحریک
آزادی کو ختم کرنا شامل ہے۔ جنرل راحیل نے عیدیں اور تہوار آئی ڈی پیز اور ان
فوجی جوانوں کے ساتھ منائے جو اپنے گھروں سے دور ملک کی سلامتی کے لیے دہشت
گرد عناصر کے ساتھ جنگ میں مصروفِ عمل ہیں۔

جنرل راحیل نے جب فوج کے سربراہ کی حیثیت سے عہدہ سنبھالا اس وقت سب سے
بڑا

چیلنج دہشت گردی کی جنگ تھا۔ اس وقت آپریشن ضربِ عضب جاری تھا جنرل راحیل کی سربراہی میں اس آپریشن میں نمایاں کامیابیاں حاصل کی، شوال کے علاقے کو دہشت گردوں سے پاک کروادیا گیا۔ کئی علاقوں کو دہشت گردوں سے پاک کردیا گیا جن میں خصوصا وانا اور شمالی وزیرِ ستان شامل ہیں۔ وانا اور شمالی وزیرِ ستان میں حکومتِ پاکستان کی رٹ بحال ہوئی۔ جنرل راحیل کی سربراہی اور پاک فوج کی نمایاں کامیابیوں کی وجہ سے ملک میں جاری بم دھماکوں اور دہشت گردی کی لہر میں کمی واقع ہوئی۔ بلوچستان میں بھارت کی کی سرگرمیوں اور بھارت کی جانب سے نہام نہاد تحریک آزادیِ بلوچستان کو کچل کر ملک کو مزید ٹکرے ہونے سے بچالیا گیا۔ کراچی میں امن و امان کی صورت حال کو بہتر بنا کر ملک کی معاشی ریڑھ کی ہڈی کو پھر سے روشنیوں کا شہر بنانے کی جانب قدم اٹھایا گیا۔ جنرل راحیل کی مدتِ ملازمت میں سرحد پر ہونے والی دراندازیوں کا منہ توڑ جواب دیا گیا۔ پہلی بار پاک فوج نے روس کے ساتھ جنگی مشقوں کا آغاز کیا اور روس کے ساتھ نئے معاہدے کئے۔ روس اور پاکستان کے درمیان فوجی تعاون میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ صرف یہی نہیں پورے ملک میں امن و امان کی حالت بہتر بنا کر گوادر پورٹ کو کام میں لانے کی کوششیں بھی کامیاب ہوئیں اور پہلا تجارتی قافلہ گوادر کے راستے چین روانہ ہوا۔ ان قافلہ کی روانگی اور گوادر کو کام میں لانے کا خواب فوج ہی کی بدولت ممکن ہو سکا۔ جنرل راحیل شریف کی مضبوط قوتِ فیصلہ نے پاکستان کو اقوامِ عالم

میں پھر سے سر اٹھا کر جینے کی صلاحیت فراہم کی اور پاکستان کا کھویا ہوا وقار بحال ہوا۔
جنرل راحیل کی عوام میں مقبولیت اور پاک فوج کی پیشہ وارانہ صلاحیتوں میں خاطر خواہ اضافے کی وجہ سے خیال کیا جا رہا تھا کہ ان کی مدتِ ملازمت میں اضافہ کر دیا جائے گا یا وہ از خود مدتِ ملازمت میں توسیع لے لیں گے۔ یہ قیاس آرائیاں میڈیا اور سوشل میڈیا پر خاصی مقبول بھی رہیں۔ تاہم یہ تمام قیاس آرائیاں غلط ثابت ہوئیں۔ جنرل راحیل نے ملازمت میں توسیع سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ اس کا اعلان بھی کیا کہ اس طرح کی قیاس آرائیوں سے باز رہا جائے۔میڈیا اور سوشل میڈیا پر ایاس آرائیوں کے بعد جب جنرل راحیل شریف سے نئے سربراہ کی تقرری کے بارے میں استفسار کیا گیا تو انھوں نے اس نہایت اہم ملکی معاملے کے بارے میں کسی سوال کا جواب نہیں دیا
۔

جنرل راحیل کی الوداعی ملاقات 25 نومبر کو صدر کے ساتھ الوداعی ملاقات کریں گے کو پاک فوج کے سربراہ کے عہدے کو نئے چیف کے سپرد کر NOV 2016 اور 26 کے سبقدوش ہو جائیں گے۔
جنرل راحیل کی مدتِ ملازمت کے خاتمے کے ساتھ ہی یہ بحث شروع ہو گئی ہے کہ پاکستان فوج کی اعلیٰ کمان کی یہ ذمہ داری اب کون سنبھالے گا؟ پاک فوج کے

سربراہ کے لیے منتخب ناموں کی فہرست مندرجہ ذیل ہے لیفٹیننٹ جنرل زبیر محمود،
لیفٹیننٹ جنرل نجیب اللہ خان، لفٹیننیٹ، لیفٹیننٹ جنرل اشفاق ندیم، جنرل واجد الحسن،
لفٹیننٹ جنرل جاوید اقبال، لیفٹیننٹ جنرل قمر جاوید باجوہ شامل ہیں۔
ان تمام افسران میں سینئر ترین لیفٹیننٹ جنرل زبیر محمود ہیں جن کا تعلق آرٹلری سے
ہے۔ جنرل زبیر محمود اپنی ملازمت کے دوران بہاولپور کراپس کے کمانڈر اور ڈائریکٹر
جنرل سٹریجیکٹ پلان کے طور پر بھی خدمات سرانجام دی۔ لیفینٹ جنرل زبیر سابق
چیف آف آرمی سٹاف کت دور میں پرنسپل سٹاف آفسر کے طور پر بھی کام کیا۔
لیفینٹ جنرل زبیر بعد سنئیر ترین آفسر لیفٹیننٹ جنرل نجیب اللہ ہیں جن کا تعلق
انجیئرنگ کور ہے اور حال میں ڈائیریکٹر جنرل جوائیٹ سٹاف کے طور پر کام کر رہے ہیں
۔ لیفٹیننٹ جنرل نجیب کوارٹر ماسٹر جی ایچ کیو اور ڈائریکٹر جنرل ایف ڈبلیو او بھی رہ چکے
ہیں۔
تیسرے نمبر پر سنئیر ترین آفسر لیفٹیننٹ اشفاق ندیم ہیں جو کہ چیف آف جنرل سٹاف رہ
چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈائریکٹر جنرل ملٹری آپریشنز کے طور پر بھی

اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے اور حال ہی میں ملتان کراپس کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ لیفٹیننٹ جنرل قمر جاوید باجوہ حال میں بہاولپور کراپس کے کمانڈر کے طور پر اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں جبکہ آپ نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔

پاکستان میں فوج کے سربراہ کا عہدہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔پورے ملک کی سلامتی، بقاء اور امن وامان اور سیکیورٹی کی صورت حال بہتر ہونے کے لیے فوج کے کردار سے کسی کو انکار نہیں۔پاک فوج کے سربراہ کے چناؤ کا فیصلہ وزیرِ اعظم کو کرنا ہوتا ہے۔ اب جبکہ فوج کے سربراہ کی تقرری کا عمل قریب آرہا ہے بھارت کی جانب سے سرحد پر جاری دراندازیوں میں اضافہ ہوا ہے۔ بھارت کی جانب سے سرحد پر ہونے والی دراندازیوں اور ملکی سلامتی کی صورتحال نے پاک فوج کے نئے سربراہ کی تقرری یا جنرل راحیل شریف کی مدتِ ملازمت میں توسیع کے فیصلے کو از حد مشکل بنا دیا ہے۔ بھارت کو یہ جان لینا چاہیے کہ پاک فوج ایک انسان کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ایسا ادارہ ہے جو سربراہ کوئی بھی ملک کی حفاظت کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں رکھے گا۔

پاکستان آرمی کے تمام آفسران کے دل جذبہء حب الوطنی سے لبریز ہیں۔ فوجی چاہے وہ افسر ہو یا جوان وطن کی سلامتی عزت اور بقاء کی خاطر اپنی جان کی

قربانی تک سے گریز نہیں کرتے۔ نئے سربراہ کوئی بھی ہوں پاکستان کے عوام ان کے ساتھ ہیں اور انھیں خوش آمدید کہتے ہیں۔